پیار کی صلیب پر

جرم اور سراغ رسانی کی جذبات میں زلزلہ برپا کر دینے والی سچی کہانیاں

احمد یار خان

جرم و سزا

پیار کی صلیب پر

احمد یار خاں

علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔فون: ۷۲۴۷۴۱۴

فہرست

پیار کی صلیب	9
قاتل لنواں اور مھلا	61
ناموں، گاموں اور بکھیاڑ	87
بات غیرت کی تھی	117
پہلوان، پستول اور باندر سنگھ	147
موت، ملاقات اور محبت	179
پاگل خانے سے پاکستان تک	211

پیار کی صلیب پر

قتل کا باعث عام طور پر زَن، زر اور زمین کی مثلث ہوتی ہے...... سب سے زیادہ قتل عورت کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ عورت جب مرد کے دماغ پر سوار ہوتی ہے تو اس کی آنکھوں پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ اور اسے عورت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا...... عورت جب حسین بھی ہو تو معاملہ اور بھی سنگین ہو جاتا ہے۔

قتل بہت ہی خوفناک اور ظالمانہ جرم ہے۔ ایک انسان کا دوسرے کو مارنا بڑے حوصلے اور جگر ے کا کام ہے۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ ایک جیتے جاگتے انسان کو قتل کرنے والا قاتل بڑا خوفناک اور وحشی انسان ہوتا ہوگا۔ جی نہیں، یہ مفروضہ غلط ہے۔ قتل جیسا جرم کوئی دھان پان سا اور معصوم آدمی بھی کر سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ قاتل بہت طاقتور، درندہ صفت ہو۔ انسانی [illegible] ایک لمحے کا پاگل پن کہا ہے اور ٹھیک ہی کہا ہے۔

[illegible] ہوتے ہیں جو ایک لمحے کے پاگل پن کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ [illegible] پلاننگ کر کے کئے جاتے ہیں۔ ایسے قتل عام طور پر عادی جرائم پیشہ لوگ کرتے ہیں لیکن بعض اوقات ایسے لوگ بھی جرم کر گزرتے ہیں جنہوں نے کبھی مکھی بھی نہیں ماری ہوتی۔ ایسے لوگ جب کسی جرم میں ملوث ہوتے ہیں تو کسی چونکا دینے والی کہانی کا انکشاف ہوتا ہے۔ ہمارے اپنے معاشرے کے ایسے ڈھکے چھپے گوشے بے نقاب ہوتے ہیں جو اس سے پہلے نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔

قتل کا باعث عام طور پر زَن، زر اور زمین کی مثلث ہوتی ہے لیکن میرا تجربہ ہے کہ سب سے زیادہ قتل عورت کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ عورت جب مرد کے دماغ پر سوار ہوتی ہے تو اس کی آنکھوں پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ اسے اس عورت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، اور عورت جب حسین بھی ہو تو معاملات اور بھی سنگین ہو جاتے ہیں۔

میں آپ کو جو کہانی سنانے لگا ہوں وہ پنجاب کے دیہاتی اور شہری علاقے سے تعلق رکھتی ہے۔ میں ان دنوں ایک قصبے میں تعینات تھا۔ اس قصبے کے قریب سے ایک مین سڑک شہر تک جاتی تھی۔ یہ قصبہ بہت بڑا تو نہیں تھا لیکن شہر نزدیک ہونے کی وجہ سے یہاں ہر قسم کی سہولتیں موجود تھیں۔ میرے تھانے کے علاقے میں اس قصبے کے علاوہ تین گاؤں اور بھی آتے تھے۔

اس علاقے میں عام طور پر جرائم کم ہی ہوتے تھے۔ کبھی چھوٹی موٹی چوری چکاری یا لڑائی جھگڑے کی اطلاع آجاتی تھی۔ سنگین جرم کم ہی ہوتے تھے۔ یہ علاقہ ہندوؤں مسلمانوں کا ملا جلا تھا۔

وہ جو کہتے ہیں ناکہ زیادہ تر برے کام اور گناہ رات کے اندھیرے میں جنم لیتے ہیں، یہ بالکل ٹھیک ہے۔ بالکل اسی طرح زیادہ تر قتل بھی رات کے اندھیرے میں ہوتے ہیں اور دن کی روشنی میں ان کا انکشاف ہوتا ہے۔ رات کا اندھیرا بہت سے گناہوں کو ڈھانپ لیتا ہے لیکن دن چڑھتے ہی ہر چیز عیاں ہو جاتی ہے۔ ویسے آج کل تو دن دیہاڑے قتل ہوتے ہیں اور انسان مکھیوں کی طرح مارے جاتے ہیں۔

گرمیوں کے دن تھے۔ میں سورج کی تپش بڑھنے سے پہلے پہلے تھانے پہنچ جایا کرتا تھا۔ اس طرح میں وقت سے کچھ پہلے چلا جاتا تھا۔ اس دن میں تھانے پہنچا تو وہاں مجھ سے پہلے ایک آدمی محرر کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر محرر نے سلیوٹ کیا۔ اس کے پاس بیٹھا ہوا آدمی بھی کھڑا ہو گیا اور اس نے جھک کر مجھے سلام کیا۔ میں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور پوچھا کہ وہ کس سلسلے میں آیا ہے۔

"قتل کی واردات کی اطلاع ہے سر!" اس آدمی کے بولنے سے پہلے ہی حوالدار نے کہا۔ "یہ آدمی لاش دیکھ کر آرہا ہے۔"

میں نے مزید تفصیل پوچھنے کے لیے اس آدمی کو اپنے کمرے میں بٹھالیا۔ اس نے جو کچھ بتایا وہ اس طرح تھا۔ اس آدمی کے ساتھ ایک اور آدمی تھا۔ یہ دونوں شہر میں مزدوری کرنے جاتے تھے اور شام کو واپس آتے تھے۔ یہ دونوں صبح منہ اندھیرے ہی گھر سے نکل آتے تھے اور پیدل سفر کرتے ہوئے ہمارے قصبے تک آتے تھے۔ یہاں سے وہ تانگے وغیرہ میں شہر چلے جاتے تھے۔ راستہ چھوٹا کرنے کے لیے یہ عام راستوں سے ہٹ کر کھیتوں کی مینڈھوں اور جنگلاتی حصے پر چلتے تھے۔ اس طرح ان کا خاصا وقت بچ جاتا تھا اور سفر بھی کم ہو جاتا تھا۔

اُس روز بھی وہ اپنے معمول کے مطابق آرہے تھے کہ قصبے کے جنوبی طرف ایک ویران سی جگہ پر انہیں ایک آدمی درخت سے بندھا ہوا نظر آیا۔ پہلے تو وہ بہت ڈرے مگر پھر ہمت کر کے قریب چلے گئے۔ وہ ایک جواں عمر آدمی تھا جس کی گردن سے خون بہہ بہہ کر زمین پر جما ہوا تھا۔ دونوں نے ارادہ کیا کہ چپ چاپ یہاں سے کھسک جائیں مگر پھر وہ یہ سوچ کر ڈر گئے کہ ایسا نہ ہو کوئی انہیں اس طرف سے آتا دیکھ لے اور قتل کا الزام ان پر لگ جائے۔

ان میں سے جو بڑی عمر کا تھا اس نے اپنے ساتھی کو تھانے اطلاع دینے کے لیے بھیج دیا اور خود وہیں موجود رہا۔ میں نے اس سے کچھ اور باتیں پوچھیں اور مزید وقت ضائع کیے بغیر اپنا عملہ ساتھ لے کر اس آدمی کے ساتھ چل پڑا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک کانسٹیبل کو دوڑایا کہ وہ کھوجی، نمبردار اور دو تین معزز آدمیوں کو لے کر مطلوبہ جگہ پر پہنچے۔

اس آدمی کے ساتھ چلتے ہوئے ہم کھیتوں میں پہنچ گئے۔ کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے ایک طرف جہاں سے کھیتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا، جھاڑ جھنکار والی زمین تھی۔ وہاں خود رو درختوں کی بہتات تھی۔ وہ آدمی مجھے اس طرف لے گیا۔ کچھ اور اندر جا کر ایک ایسی جگہ آگئی جسے چاروں طرف سے درختوں اور جھاڑیوں نے گھیر رکھا تھا۔ مجھے دور سے ہی نظر آگیا کہ کیکر کے ایک درخت کے ساتھ ایک آدمی رسیوں سے درخت کے تنے کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔

ہمیں آتے دیکھ کر اس آدمی کا ساتھی جو قریبی درختوں کے سائے میں کھڑا تھا، ہماری طرف آگیا۔ میں نے سب کو پیچھے کھڑے رہنے کو کہا اور خود آگے چلا گیا۔ یہ احتیاط میں نے اس لیے کی تھی کہ مجرم یا مجرموں کے قدموں کے نشان ضائع نہ ہو جائیں۔ میں نے قریب جا کر دیکھا۔ وہ ایک تیس بتیس سال کا جواں عمر آدمی تھا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ اس پر بہت زیادہ تشدد کیا گیا ہے۔ اس کی داہنی آنکھ کے نیچے ایک نیلگوں ابھار نظر آرہا تھا۔ نچلا ہونٹ پھٹا ہوا اور سوجا ہوا تھا اور اس سے خون نکلا ہوا تھا۔ اصل زخم جو موت کا باعث بنا ہوگا، وہ مقتول کی گردن کی بائیں جانب کٹ کا گہرا نشان تھا۔ میرے تجربے کے مطابق وہ کلہاڑی کی ضرب تھی جو خاصی کاری تھی۔

مقتول کی گردن سے خون بہہ کر درخت کے تنے سے ہوتا ہوا زمین پر جم گیا تھا۔ اس خون پر اور مقتول کی گردن کے زخم پر سینکڑوں کی تعداد میں جنگلی چیونٹے جمع ہو گئے تھے۔ میں نے قریبی جھاڑی سے ایک چھوٹی سی شاخ اُتار کر ان چیونٹوں کو ہٹایا۔ پھر میں نے دو کانسٹیبلوں سے کہا کہ احتیاط سے آکر لاش کو کھولیں اور سائے میں ڈال دیں۔

مقتول کو پٹ سن کی رسی سے اس طرح باندھا گیا تھا کہ اس کی پشت درخت کے تنے کے ساتھ لگا کر رسی کے بل دیئے گئے تھے۔ رسی کے آخری سرے کو گرہ لگانے کی بجائے ویسے ہی پچھلی طرف رسی کے بلوں میں اُڑس دیا گیا تھا۔

کانسٹیبلوں نے رسی کے بل کھول کر لاش کو اٹھایا اور درختوں کے گھنے سائے میں گھاس پر لٹا دیا۔ میں درخت کے اردگرد کسی سراغ کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگا۔ میری

نظریں جھاڑیوں اور گھاس میں لگی ہوئی تھیں۔ آثار بتا رہے تھے کہ یہاں خاصی دھینگا مشتی ہوئی ہے۔ قدموں کے نشان بڑے صاف نظر آ رہے تھے۔

اتنے میں وہ کانسٹیبل جسے میں نے کھوجی اور معززین کو لانے کے لیے بھیجا تھا۔ گاؤں کے نمبردار، دو معزز آدمیوں اور کھوجی کو ساتھ لے کر آ گیا۔ میں نے ان کی موجودگی میں موقعے پر جو ضروری کارروائی کرنی تھی وہ کی اور لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوانے کا بندوبست کیا۔ اس کے بعد میں نے کھوجی کو بلا کر کچھ ہدایات دیں۔ کھوجی اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

خوشبو میں بسا دوپٹہ

نمبردار اور اس کے ساتھ آنے والے دوسرے دو آدمیوں نے لاش کا چہرہ دیکھا تو فوراً پہچان گئے اور انہوں نے بتایا کہ اس آدمی کا نام عباس ہے اور گاؤں میں اس کی بڑی اچھی دکان ہے۔ میں نے نمبردار سے کہا کہ اس کے گھر والوں کو اطلاع بھجوا دے۔ اس کے جواب میں نمبردار نے مجھے بتایا کہ مقتول عباس باقاعدہ اس گاؤں کا رہنے والا نہیں بلکہ گذشتہ چھ سات ماہ سے گاؤں میں آباد ہوا تھا۔ اس نے چھوٹا سا ایک مکان خریدا تھا اور اس کے باہر والے کمرے میں دکان بنا رکھی تھی۔ اس کے متعلق یہی پتہ لگا تھا کہ اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں اور اس نے ابھی تک شادی بھی نہیں کی۔

ابھی میں نمبردار سے مقتول عباس کے بارے میں معلومات حاصل کر رہا تھا کہ اچانک کھوجی آتا دکھائی دیا۔ اس نے دور سے ہی مجھے آنکھوں سے ادھر آنے کا اشارہ کیا۔ میں نمبردار کو وہیں چھوڑ کر اس کی طرف بڑھ گیا۔ کھوجی مجھے جھاڑیوں کے درمیان سے گزار کر پندرہ بیس گز دور لے گیا۔ جو چیز وہ مجھے دکھانا چاہتا تھا وہ مجھے فوراً نظر آ گئی۔ یہ ایک رنگین دوپٹہ تھا جو ایک کانٹوں والی جھاڑی میں بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ کھوجی نے مجھے ایک طرف لے جا کر ایک اور چیز دکھائی۔ یہ رنگ برنگی چوڑیوں کے ٹکڑے تھے جو ادھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے زمین پر بیٹھ کر یہ ٹکڑے اکٹھے کیے اور اپنے رومال میں لپیٹ کر جیب میں رکھ لیے۔ پھر میں نے جھاڑیوں میں پھنسا ہوا دوپٹہ بھی احتیاط سے نکال لیا۔ یہ ایک سلکی دوپٹہ تھا۔ ایسے دوپٹے دیہات میں کم ہی نظر آتے تھے۔ یہ خاصا قیمتی تھا۔ اس میں سے کسی مہنگے پرفیوم کی مسحور کن خوشبو آ رہی تھی۔

جائے واردات پر دوپٹے اور ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کی موجودگی اس بات کو ظاہر کر رہی تھی کہ اس واردات کا تعلق عورت سے ہے یا کسی نہ کسی طرح اس میں کوئی عورت ملوث ہے۔ یقیناً یہ

عورت مقتول سے ملنے اس ویرانے میں آئی ہو گی۔ کسی طرح اس کے وارثوں کو اس کا علم ہو گیا ہو گا اور انہوں نے موقعہ پر رنگے ہاتھوں پکڑ کر مقتول عباس کو قتل کر دیا اور عورت کو لے گئے۔ اس کھینچا تانی میں اس کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں اور دوپٹہ بھی جھاڑیوں میں پھنس گیا۔

کھوجی نے مجھے بتایا کہ جائے واردات پر چار قسم کے کُھرے پائے گئے ہیں۔ مقتول کے کُھرے گاؤں والی طرف سے آئے تھے اور عورت کے کُھرے دوسری طرف سے آئے تھے جدھر سے بڑی سڑک گزرتی تھی۔ دوسرے دو مردانہ کُھرے بھی اسی طرف سے آئے تھے جدھر سے عورت آئی تھی۔ پھر کھوجی نے ان کی واپسی کے کُھرے بھی مجھے دکھائے اور بتایا کہ عورت اپنی مرضی سے ان کے ساتھ نہیں چل رہی۔ اسے گھسیٹ کر لے جایا جا رہا ہے۔ ذرا اور آگے جا کر زنانہ کُھرے غائب ہو گئے اور صرف دو مردوں کے کُھرے رہ گئے۔ کھوجی نے بتایا کہ دونوں مردوں میں سے ایک نے عورت کو اٹھا لیا ہے۔ کھوجی نے مجھے کُھرے غور سے دیکھنے کو کہا اور بتایا کہ ایک مُردے کے کُھرے زمین پر زیادہ گہرا نشان چھوڑ رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اس نے وزن اٹھا رکھا ہے۔ جبکہ عورت کو اٹھانے سے پہلے دونوں مردوں کے کُھرے ایک جیسے نشان چھوڑ رہے تھے۔

ہم نشان دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ یہ نشان پکی سڑک کی طرف جا رہے تھے۔ میں کھوجی کے ساتھ کُھروں کو غور سے دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ مجھے زمین پر ایک ڈوری سی نظر آئی جیسے کوئی تعویذ وغیرہ ہوتا ہے۔

ڈوری کے ساتھ کوئی چیز بھی تھی جو مٹی میں دب گئی تھی۔ میں نے ڈوری کو پکڑ کر اٹھایا تو اس میں پروئی ہوئی وہ چیز بھی پوری طرح واضح ہو گئی۔ یہ ایک لکڑی کی ننھی سی صلیب تھی۔ اس قسم کی صلیب عام طور پر عیسائی گلے میں ڈالتے ہیں۔ کثرت استعمال سے ڈوری خاصی کمزور ہو چکی تھی۔ یہ ڈوری غالباً اس وقت ٹوٹی ہو گی جب آدمی نے لڑکی کو اٹھایا ہو گا مزاحمت کے دوران ڈوری ٹوٹ گئی جس کا آدمی کو پتہ نہ چلا۔

میں نے یہ ڈوری اور چوبی صلیب بھی چوڑیوں کے ٹکڑوں کے ساتھ جیب میں رکھ لی۔ یہ چیزیں تفتیش میں مددگار ثابت ہو سکتی تھیں۔ میں کھوجی کے ساتھ آگے پکی سڑک تک چلا گیا۔ وہاں سڑک کے کنارے ایک طرف کو یہ کُھرے مڑ گئے اور پھر وہاں سے آگے یہ کُھرے غائب ہو گئے۔ جس جگہ سے کُھرے غائب ہوئے تھے وہاں زمین پر گھوڑے کی لید کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور کچھ خشک چارہ بکھرا ہوا تھا۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ قاتل تانگے پر آئے تھے اور اسی

تانگے پر واپس بھی گئے۔ میں کھوجی کے ساتھ واپس لاش کے پاس آ گیا۔

بعض جگہوں پر کھرے اتنے صاف تھے کہ میں نے ان کے مولڈ بنوا لئے۔ اس دوران نمبردار نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے لے جانے کا بندوبست کر دیا تھا۔ میں نے دو کانسٹیبلوں کو لاش کے ساتھ شہر کے ہسپتال بھیج دیا۔ میں نے لاش کی اطلاع لے کر آنے والے دونوں آدمیوں کو پہلے ہی جانے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ غریب دیہاڑی دار مزدور تھے۔ میں نے ان کا نام اور گاؤں وغیرہ پوچھ لیا تھا۔

جائے واردات سے فارغ ہو کر میں نے گاؤں کا رخ کر لیا اور نمبردار کی بیٹھک میں جا ڈیرا جمایا۔ میں نے مقتول عباس کے متعلق معلومات حاصل کرنی تھیں۔ اس کے لیے نمبردار نے مقتول عباس کے قریب رہنے والے ایک دو ہمسائیوں کو بھی بلا لیا تھا۔ میں نے ان سے مقتول کے متعلق کچھ سوالات پوچھے۔ مثلاً مقتول کیسا آدمی تھا؟

اس کی کسی کے ساتھ دشمنی تھی؟

کسی عورت کے ساتھ اس کے تعلقات تو نہیں تھے؟

کبھی کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا ہوا ہو!

لوگوں نے مجھے جو کچھ بتایا اس کے مطابق مقتول انتہائی شریف اور ملنسار آدمی تھا۔ اس کا اخلاق اتنا اچھا تھا کہ ہر کوئی اس کی عزت کرتا تھا۔ عورتوں کے معاملے میں بھی اس کی کوئی شکایت نہیں تھی۔ کبھی کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا تو درکنار اسے کسی نے غصے میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

ایک آدمی نے بتایا کہ ہفتے دس دن بعد اس کے پاس ایک نوجوان آیا کرتا تھا۔ یہ دونوں بیٹھ کر بڑی رازداری سے باتیں کرتے تھے۔ اس آدمی نے یہ بھی بتایا کہ مقتول مہینے میں دو دن شہر ضرور جاتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ دکان کے لیے سامان وغیرہ لینے کے لیے جاتا ہے۔

میں نے مقتول کے پاس آنے والے نوجوان کے متعلق کریدنا چاہا تو پتہ چلا کہ کسی کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آتا ہے۔ اگر اس نوجوان کے متعلق پتہ چل جاتا تو مقتول عباس کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔ گاؤں کے لوگ مقتول کے بارے میں بہت کم جانتے تھے۔ میں نے معلوم کیا کہ گاؤں میں مقتول کی کسی کے ساتھ دوستی ہو گی جس کے ساتھ وہ ہر طرح کی باتیں کرتا ہو گا۔

''ویسے تو اس کی سب کے ساتھ علیک سلیک تھی۔'' ایک شخص نے کہا۔ ''لیکن جس قسم کی

دوستی آپ کے ذہن میں ہے، ایسی گاڑھی اور بے تکلفی والی دوستی اس کی کسی کے ساتھ نہیں تھی۔''

میں نے سب لوگوں سے کہا کہ اب اگر وہ نوجوان گاؤں میں نظر آئے تو اسے کسی بہانے بٹھا کر تھانے اطلاع کر دیں یا اسے تھانے لے آئیں۔

نمبردار اور دوسرے لوگوں کو اچھی طرح سمجھا کر میں تھانے آ گیا۔ تھانے میں آ کر میں نے مقتول عباس کے قتل کے بارے میں غور کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ کیس میرے لیے اچھی خاصی سردردی کا باعث بنے گا۔ بہرحال چونکہ مقتول کا فی الحال کوئی والی وارث سامنے نہیں آیا تھا، اس لیے میں نے قانون کے مطابق ازخود کارروائی کرتے ہوئے کیس درج کر لیا۔

اندھا قتل

میں نے اس کیس پر باریک بینی سے غور کرنا شروع کر دیا۔ بظاہر اس قتل کے ڈانڈے شہر سے جا کر ملتے تھے لیکن یہ ضروری بھی نہیں تھا۔ جائے واردات سے ملنے والا خوشبو میں بسا ہوا مہنگا دوپٹہ، لڑکی اور مجرموں کے کھروں کا پکی سڑک کی طرف سے آنا اور واپس جانا اور سڑک کے کنارے تانگے کا کھڑا ہونا میرے اس خیال کو تقویت دیتا تھا کہ جائے واردات پر موجود لڑکی اور قاتلوں کا تعلق شہر سے ہو سکتا ہے۔

لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ میرا مفروضہ ٹھیک ہی ہو۔ لڑکی کا تعلق اسی گاؤں یا اردگرد کے کسی گاؤں سے بھی ہو سکتا تھا۔ فرض کر لیا کہ لڑکی شہر سے آئی تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اسے کیا ضرورت تھی کہ اتنی دور آ کر رات کے اندھیرے میں ایک ویران جگہ آ کر مقتول سے ملاقات کرتی؟ اس کے علاوہ میرے دماغ میں یہ بھی آیا کہ یہ عشق و محبت کا کھیل ہو سکتا ہے، ہوس یا بدکاری والا معاملہ نہیں۔

میں جتنا اس معاملے پر غور کرتا گیا، اتنا ہی میرا دماغ اُلجھتا گیا۔ مقتول کے متعلق معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ وہ کون تھا اور کہاں سے آ کر اس قصبے میں رہنے لگا تھا، اس کے والدین یا کوئی بہن بھائی تھے، یا نہیں۔ اگر تھے تو کہاں تھے؟ یہ ایسے سوال تھے جن کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔

شہر چونکہ قصبے سے بہت زیادہ دور نہیں تھا، اس لیے پوسٹ مارٹم رپورٹ جلد ہی آ گئی۔ اس میں موت کا باعث گردن پر تیز دھار آلے کا گہرا زخم لکھا گیا تھا جس کی وجہ سے بہت زیادہ خون بہہ جانے سے موت واقع ہو گئی تھی۔ گردن کا زخم ڈیڑھ سے پونے دو انچ تک گہرا تھا۔ لگتا

تھا اسے جان سے مارنے سے پہلے لاتوں مکوں اور ڈنڈوں سے مارا گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ایک بات سرکاری ڈاکٹر نے میرے لیے خاص طور پر لکھی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ مقتول کے ناخنوں میں انسانی گوشت کے ریشے پائے گئے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مقتول نے قاتل کے جسم کے کسی حصے پر گہری خراشیں ڈال دی ہوں گی۔

یہ میرے کام کی بات تھی۔ موت کا وقت رات نو اور دس بجے کے درمیان کا لکھا گیا تھا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ میں کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی جو تفتیش کے لیے مددگار ثابت ہو سکتی۔ میرا مسئلہ یہ تھا کہ میرے پاس کوئی ایسا سراغ نہیں تھا یا کوئی ایسا راستہ نہیں تھا جہاں سے میں تفتیش کا آغاز کرتا۔ ایک لحاظ سے یہ ایک اندھا قتل تھا۔ میں نے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کی بجائے مخبروں کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے اُمید تھی کہ میرے مخبر میرے لیے کوئی نہ کوئی کام کی بات معلوم کرلیں گے۔

میں نے مقتول عباس کی لاش کو لاوارث قرار دے کر امانتاً دفن کرا دیا تھا۔ اس کے بعد مین نے اپنے مخبروں کو بلالیا۔ یہ چار تھے اور ان میں سے ایک عورت بھی تھی۔ یہ عورت اپنے کام میں اتنی مہارت رکھتی تھی کہ سات پردوں کے اندر چھپے ہوئے بھید بھی نکال لاتی تھی۔ ایک مخبر پکا جرائم پیشہ تھا۔ وہ چھوٹے موٹے جرائم کرتا تھا۔ یہ بھی بڑے کام کا آدمی تھا۔ ہر قسم کے جرم کرنے والوں کے متعلق علم رکھتا تھا۔ باقی دو افراد عام لوگ تھے جو تھانیدار کی خوشنودی کے لیے یہ کام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ نمبردار بھی میرا مخبر تھا۔

میں نے ان کو واردات کے متعلق بتایا اور پھر پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ڈاکٹر کے لکھے ہوئے خاص نوٹ کے متعلق بتایا اور انہیں کہا کہ انہیں کوئی ایسا شخص نظر آئے جس کے چہرے یا گردن پر تازہ خراشوں کے نشان ہوں تو وہ اس کا پتہ ٹھکانہ دیکھ کر تھانے میں اطلاع دیں۔

اچانک میرے ذہن میں جائے واردات سے ملنے والی لکڑی کی صلیب آ گئی۔ جائے واردات پر اس صلیب کی موجودگی کا مطلب یہ تھا کہ اس واردات میں شریک دو آدمیوں میں سے ایک عیسائی تھا۔ میں نے مخبروں سے یہ بھی کہا کہ وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی کریں کہ قصبے میں کوئی ایسا عیسائی بھی ہے جو اپنے گلے میں لکڑی کی صلیب پہنتا ہو۔ ایسی ہی کچھ اور باتیں سمجھا کر میں نے سب کو رخصت کر دیا۔

مخبروں کو بھیج کر میں کچھ چھوٹے موٹے کیسوں کی فائلیں دیکھنے لگا۔ پھر اے ایس آئی جو ایک ہندو تھا، کو بلا کر سمجھایا کہ اس نے کیا کارروائی کرنی ہے۔ یہ ہندو اے ایس آئی بڑا سُست

اور کام چور آدمی تھا۔ جہاں بھی تفتیش کے لیے جاتا بس مال کمانے پر نظر رکھتا تھا۔ جب سے میں نے اس تھانے کا چارج سنبھالا تھا یہ اے ایس آئی پریشان رہتا تھا۔ میں اسے چھوٹے موٹے کیسوں تک ہی محدود رکھتا تھا۔

وہ دن انہی کاموں میں گزر گیا اور میں کوئی خاص بات معلوم نہ کر سکا۔ اب میری تفتیش کا دارو مدار مخبروں کی اطلاعات پر تھا۔ میں نے باقی کی کارروائی کو اگلے دن پر ڈال دیا اور تھانے سے آ گیا۔

منہ زور بے لگام جوانی

اگلے دن میں تھانے پہنچا تو ایک مخبر جو اس قصبے سے ہی تعلق رکھتا تھا، مجھ سے پہلے آیا بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کے جوش و خروش سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ کوئی اہم خبر لے کر آیا ہے۔ میں نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہی اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ اس نے بتایا کہ کل اس نے ایک نوجوان کو دیکھا جس نے اپنی گردن پر بڑا رومال لپیٹ رکھا تھا۔

یہ مخبر بال کٹوانے حجام کے پاس گیا تھا جہاں اس نے رومال والے کو دیکھا تھا۔ رومال والے نے بال کٹوانے کے لیے رومال کھولا تو اس کی گردن کی دائیں جانب لمبی لمبی خراشیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ یہ خراشیں زیادہ پرانی بھی معلوم نہیں ہوتی تھیں۔ ان کی سرخی بتا رہی تھی کہ ایک دو دن ہی پرانی ہیں۔ میرا مخبر یہ دیکھ کر چونک گیا اور اس نے بڑے ہمدردانہ انداز میں اس سے پوچھا کہ اسے گردن پر کیا ہوا ہے۔ اس کے جواب میں وہ نوجوان پہلے تو گھبرا گیا مگر پھر پھیکی سی ہنسی کے ساتھ کہا کہ ایک دوست کے ساتھ مذاق مذاق میں ہاتھا پائی ہو گئی تھی۔ اس کے ناخن بڑھے ہوئے تھے جس کی وجہ سے یہ خراشیں پڑ گئیں۔

''تم اس نوجوان کو جانتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت اچھی طرح جناب!'' مخبر نے کہا۔ ''وہ ہمارے قصبے کا رہنے والا ہے۔ یہ دو بھائی ہیں اور ان کا باپ فوت ہو چکا ہے۔ یہ لوگ لوہاروں کا کام کرتے ہیں۔''

میں نے اس کا نام اور پتہ نوٹ کر لیا۔ اس نوجوان کا نام حمید اور دوسرے بھائی کا نام رشید تھا۔ یہ مخبر بڑے کام کی اطلاع لے کر آیا تھا۔ میں نے اسے شاباش دی اور کچھ انعام بھی دیا۔ پھر میں نے اسے سمجھایا کہ وہ دونوں بھائیوں پر نظر رکھے کہ کہاں آتے جاتے ہیں اور کس سے ملتے ہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ خاص طور پر اس بات کا دھیان رکھے کہ کوئی عیسائی نوجوان ان کے پاس آتا جاتا ہو یا دونوں بھائیوں میں سے کوئی ایسے نوجوان سے ملنے جاتا ہو

جس پر شبہ ہو کر وہ عیسائی ہو سکتا ہے۔

یہ مخبر چلا گیا۔ وہ مجھے گھپ اندھیرے میں روشنی کی کرن دکھا گیا تھا۔ اب مجھے دوسرے مخبروں کا انتظار تھا۔ ان سے رپورٹیں لینے کے بعد میں نے اگلا قدم اٹھانا تھا۔ اس اُلجھے ہوئے کیس کا ایک سرا میرے ہاتھ آ گیا تھا اور میں بڑی احتیاط سے اس سرے کو تھام کر آگے بڑھنا چاہتا تھا۔

دوپہر تک باری باری باقی کے تینوں مخبر بھی آ گئے۔ وہ کوئی خبر حاصل نہیں کر سکے تھے۔ میں نے دونوں مردوں کو جانے کو کہا اور عورت جس کا نام سکینہ تھا، کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ میں نے اس کو حمید اور رشید کے گھر کا پتہ سمجھایا اور یہ بھی بتایا کہ یہ لوگ لوہار ہیں۔ سکینہ نے بتایا کہ وہ ان لوگوں کے متعلق تھوڑا بہت جانتی ہے۔

میں نے سکینہ سے کہا کہ اس نے ان لوگوں کے گھر کے اندر کی باتیں معلوم کرنی ہیں۔ ان کے گھر میں کون کون رہتا ہے۔ اگر ان کی کوئی بہن ہے تو اردگرد سے معلوم کرنا ہے کہ وہ کردار کی کیسی ہے۔ اس کے کسی کے ساتھ تعلقات تو نہیں ہیں اور ان کے گھر میں اس بات پر لڑائی جھگڑا ہوا ہو وغیرہ وغیرہ۔

سکینہ ایسے کاموں کی ماہر تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ میں کیا معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ وہ اسی وقت چلی گئی۔ اس نے جاتے ہوئے بڑے اعتماد سے مجھے کہا تھا کہ شام تک آپ کو اس گھر کی ہر بات معلوم ہو جائے گی۔

سکینہ کے جانے کے بعد میں اس کیس کی جزئیات پر غور کرنے لگا۔ ابھی تک میں عضو معطل کی طرح بیکار بیٹھا تھا۔ میرے کسی بھی اقدام کا دارومدار مخبروں کی لائی ہوئی اطلاعات پر تھا۔ تفتیش کے دوران کبھی کبھی ایسے مواقع بھی آ جاتے ہیں جب تفتیشی افسر کو خواہ مخواہ ہلکان ہونے کی بجائے اپنے ماتحت عملے کو استعمال کرنا بہتر ہوتا ہے۔ کسی ماہر شاطر کی طرح مہروں کو آگے پیچھے کرنا ہوتا ہے۔ جس طرح شطرنج میں بعض اوقات ایک پیادہ مخالف کی مات کا سبب بن جاتا ہے بالکل اسی طرح ایک معمولی مخبر اپنی کامیاب مخبری کے ذریعے وہ کام کر گزرتا ہے جو بڑے سے بڑا تفتیشی افسر بھی نہیں کر سکتا۔

شام کے چھ ساڑھے چھ بجے کا وقت ہو گا جب ایک کانسٹیبل نے بتایا کہ سکینہ آ گئی ہے۔ میں نے فوراً اس کو اندر بلا لیا اور کانسٹیبل کو باہر بھیج دیا۔ سکینہ نے جب اپنی رپورٹ دی تو میرا دماغ روشن ہو گیا۔ مجھے صاف نظر آنے لگا کہ میں قاتلوں تک پہنچ گیا ہوں۔ سکینہ نے مجھ بڑی

ہی لمبی تفصیلات سنائی تھیں۔ میں مختصراً آپ کو صرف کام کی باتیں سنا دیتا ہوں۔

سب سے پہلے سکینہ نے اس گھر کے افراد کے بارے میں معلوم کیا تو اسے معلوم ہوا کہ دو بھائی حمید اور رشید ہیں۔ ان کی ایک جوان بہن ہے جس کا نام تو نور بی بی تھا مگر وہ نوراں کہلاتی تھی۔ اس کے علاوہ ان کی بوڑھی ماں تھی۔ باپ فوت ہو چکا تھا۔

نوراں کے متعلق سکینہ نے بتایا کہ وہ اپنے گھر میں نہیں ہے، پتہ لگا کہ اپنی خالہ کے گھر گئی ہوئی ہے۔ سکینہ نے یہ استادی داؤ کھیلا کہ محلے کے دو تین گھروں میں چلی گئی اور انہیں بتایا کہ وہ ان کے ہمسائیوں میں اپنے اکلوتے بیٹے کے رشتے کے لیے آئی ہے۔ اس نے نور بی بی کے متعلق پوچھا کہ یہ لوگ کیسے ہیں اور لڑکی کیسی ہے۔

''لڑکی تو خوبصورت ہے لیکن چال چلن کچھ ایسا ویسا ہے۔'' ایک ہمسائی نے کہا۔

''بچو بی بی، اس لڑکی سے بچو۔'' ایک بوڑھی عورت نے کہا۔ ''جوانی تو سب پر آتی ہے لیکن اس کی جوانی منہ زور گھوڑے کی طرح بے لگام ہے۔ یہ بھی سنا ہے کہ اس کا کسی کے ساتھ یارانہ ہے اور چھپ چھپ کر اس سے ملتی ہے۔ اکثر گھر میں بھائیوں سے مار کھاتی ہے۔ دنیا جہان کا فیشن کرتی ہے اور رنگ برنگی خوشبوئیں لگاتی ہے۔ اس کے طور طریقے شریف زادیوں والے نہیں...... کیوں اپنے بیٹے کی زندگی کو روگ لگانا چاہتی ہو۔ یہ گھر بسانے والی عورت نہیں، برباد کرنے والی عورت ہے۔''

مختصر یہ کہ نوراں کے متعلق سب نے یہ بتایا کہ مشکوک کردار کی لڑکی ہے اور اکثر اس کی وجہ سے گھر میں لڑائی جھگڑا بھی ہو جاتا ہے۔ بھائی اسے روکتے ٹوکتے تھے۔ پہلے پہل تو وہ بھائیوں کے سامنے دب جاتی تھی مگر پھر جانے کہاں سے اس میں اتنی دلیری آ گئی کہ وہ بھائیوں کے منہ آنے لگی۔ اس بات پر وہ اکثر مار بھی کھاتی تھی لیکن اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتی تھی۔

میں نے سکینہ کو بھی کچھ رقم نقد انعام کے طور پر دی اور زبانی بھی اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کے بعد میں نے اسے مزید ہدایات دے کر سمجھایا کہ اس نے یہ باتیں اپنے تک محدود رکھنی ہیں۔ اس کے بعد میں نے سکینہ کو جانے کی اجازت دے دی۔

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں

سکینہ جو معلومات لے کر آئی تھی، وہ میری توقع کے عین مطابق تھیں۔ میرے ذہن میں اس واردات کا جو خاکہ تھا۔ وہ اس طرح تھا کہ نوراں کے تعلقات کسی طرح مقتول عباس کے

ساتھ استوار ہو گئے ہوں گے اور وہ اس سے ملتی ہو گی۔ ان تعلقات کا علم اس کے بھائیوں کو بھی ہو گیا۔ پہلے تو انہوں نے زبانی اور مار پیٹ کے ذریعے اپنی بہن کو سمجھایا ہو گا جب وہ نہیں سمجھی تو موقعہ پر رنگے ہاتھوں پکڑ لیا اور غیرت کے جوش میں عباس کو وہیں قتل کر دیا اور بہن کو مار پیٹ کر گھر لے آئے۔

سکینہ نے بتایا تھا کہ نوراں گھر میں نہیں ہے اور اس کے متعلق یہ پتہ لگا تھا کہ وہ اپنی خالہ کے گھر رہنے کے لیے گئی ہوئی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اسے اس وجہ سے خالہ کے گھر بھیج دیا گیا ہے کہ اس پر عشق کا بھوت سوار ہے اور وہ کسی بھی وقت عباس کے قتل کا بھید کھول سکتی تھی۔ میں نے سوچ لیا کہ میرے مطلوبہ ملزم حمید اور رشید ہی ہیں۔ واقعات اور حالات ان دونوں بھائیوں کو قاتل ثابت کر رہے تھے۔

میں نے اپنے ہندو اے ایس آئی شنکر کو بلایا اور اسے حمید اور رشید کے متعلق بتا کہ کہا کہ وہ ان دونوں بھائیوں کو تھانے لے آئے۔ میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ وہ جتنی بھی بہانے بازی کریں، دونوں کو لے کر آنا ہے۔ شنکر دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ تھانے سے قصبے کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ اے ایس آئی شنکر تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد واپس آ گیا۔ اس نے بتایا کہ دونوں بھائیوں میں سے صرف چھوٹا بھائی حمید مل سکا ہے جبکہ بڑا بھائی رشید صبح سویرے کپور تھلہ چلا گیا ہے۔ وہاں ان کی خالہ کا گھر ہے۔

میں نے شنکر سے کہا کہ وہ حمید کو لے آئے۔ شنکر نے ایک کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔ کانسٹیبل ایک اٹھارہ انیس سالہ نوجوان کو اندر لے آیا۔ اس کا نام حمید تھا۔ میں نے دیکھا وہ اچھا صحت مند جوان تھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ نظر آ رہی تھی جو قدرتی بات تھی۔ تھانے میں آ کر بڑے بڑے جیدار مجرموں پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی تھی۔ میں نے اسے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کو کہا تو وہ جھجکتے ہوئے بیٹھ گیا۔

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے اس وقت بھی ایک بڑا رومال گردن پر لپیٹ رکھا تھا۔

''رشید کہاں ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''وہ خالہ کے گھر کپور تھلہ گیا ہے۔'' اس نے قدرے اعتماد سے کہا۔

''وہاں کیوں گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا وہاں کوئی کام تھا یا اچانک جانا پڑا ہے؟''

''ہماری بہن خالہ کے گھر رہنے کے لیے گئی ہوئی تھی۔'' حمید نے کہا۔ ''پتہ چلا کہ وہ

وہاں شدید بیمار ہو گئی ہے۔ وہاں سے اطلاع آئی تھی کہ اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔ رشید بھائی اس کی خیر خیریت معلوم کرنے گیا ہے۔''

''کیا بیماری ہے تمہاری بہن کو؟'' میں نے سوال کیا۔

''بیماری...... وہ جی......'' وہ ایک دم بوکھلا سا گیا پھر بولا۔ ''اسے بڑا بخار ہو گیا ہے جی۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک طویل سانس لیا جیسے کوئی بڑی مشکل آسان ہو گئی ہو۔

''یہ اتنی گرمی میں تم نے رومال کیوں لپیٹ رکھا ہے؟'' میں نے اس کی گردن میں لپٹے رومال کی طرف اشارہ کر کے پوچھا اور نظریں اس کی نظروں میں گاڑ دیں۔ اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔

وہ کچھ پریشان ہوا مگر پھر سنبھل کر بولا۔ ''وہ جی گردن پر زخم ہو گیا تھا۔ بڑا بھدا لگتا ہے اس لیے ڈھانپ کر رکھتا ہوں۔''

میں نے اس سے کہا کہ وہ گردن سے رومال اتار دے۔ پہلے تو وہ ہچکچایا مگر پھر اس نے رومال اتار کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ میں نے دیکھا۔ اس کی گردن پر لمبی لمبی خراشیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ دیکھنے سے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ یہ خراشیں انسانی ناخنوں سے لگی ہیں۔

''یہ تو کسی کے ناخنوں کے نشان لگتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کیا کسی کے ساتھ لڑائی ہوئی تھی؟''

''ہاں جی......نن......نہیں جی!'' وہ گڑبڑا کر بولا۔ ''ایک دوست کے ساتھ ہنسی مذاق میں ہاتھا پائی کرتے ہوئے اس کے ناخن لگ گئے تھے۔''

''خاصے گہرے نشان ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''لگتا ہے بہت ہی بے تکلف دوست ہے۔''

''آپ ان باتوں کو چھوڑیں جی!'' اس نے بات بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''حکم کریں، مجھے کیوں طلب فرمایا ہے آپ نے؟''

''تم ایسا کرو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''اپنے اس دوست کا نام بتاؤ جس کے ناخن تمہیں لگے ہیں اور چھٹی کرو۔''

میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے صاف طور پر دیکھا کہ ایک رنگ سا اس کے چہرے پر آ کر گزر گیا۔ اسے چپ سی لگ گئی تھی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اس سے کوئی جواب بن نہیں پا رہا تھا۔

''ایک بات کان کھول کر سن لو۔'' میں نے اس سے کہا۔ ''تم جس دوست کا نام لو گے

میں اسے یہاں بلاؤں گا۔ اس لیے سوچ سمجھ کر بولنا۔"

"آپ...... آپ آخر میرے دوست کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟" وہ بڑی مشکل سے بولا۔ "اس سے میں خود نمٹ لوں گا۔"

"نمٹ تو لیا ہے اس سے۔" میں نے اس کی حالت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

"سچ سچ بتاؤ اس وقت تمہارے ساتھ اور کون تھا...... تمہارا بڑا بھائی رشید یا کوئی اور؟"

اس کا گورا چٹا رنگ یکلخت سرسوں کی طرح پیلا پڑ گیا اور آنکھیں ٹھہری سی گئیں۔ وہ یوں کھینچ کھینچ کر سانس لینے لگا جیسے اسے سانس لینے میں وقت ہو رہی ہو۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی غش کھا کر گر پڑے گا۔ اس نے کچھ بولنے کوشش کی لیکن محض ہونٹ ہلا کر رہ گیا۔ اس کے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ میں نے کانسٹیبل کو بلا کر اس سے پانی منگوا کر حمید کو پلایا۔ پانی پی کر اس کی حالت کچھ سنبھل گئی۔ وہ اب بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

اب میں نے اس پر سیدھا حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں اس کی ٹوٹی پھوٹی دماغی حالت سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

"وہ کلہاڑی کہاں ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔ "جس سے تم نے عباس کو قتل کیا تھا۔"

"کلہاڑی؟...... عباس کا قتل!" وہ دھیرے سے بڑبڑایا اور پھر ایک دم اس کی حالت سنبھل گئی۔ یوں لگتا تھا اس میں یکلخت طاقت آ گئی ہے۔ بڑی جاندار آواز میں بولا۔ "کیسی کلہاڑی اور کیسا قتل؟"

اب میرے حیران ہونے کی باری تھی۔ پہلے تو اس کی حالت اتنی بری ہو گئی تھی کہ لگتا تھا وہ ابھی بے ہوش ہو جائے گا۔ کہاں اب وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے اعتماد سے بات کر رہا تھا۔ اس کے اندر پیدا ہونے والی اس تبدیلی سے میں اُلجھ سا گیا تھا۔ مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے جس کا مجھے علم نہیں ہے۔

"عباس کو تم دونوں بھائیوں نے قتل نہیں کیا؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل نہیں!" حمید نے کہا۔ "ہمیں کیا ضرورت تھی اسے قتل کرنے کی۔ ہماری اس کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں تھی۔"

"سنا ہے تمہاری بہن کے ساتھ تعلقات تھے۔" میں نے کہا۔ "اور وہ راتوں کو چھپ چھپ کر ملتے تھے۔"

"آپ نے غلط سنا ہے۔" اس نے دبے دبے غصے سے کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں تھی۔"

"جائے واردات پر تم دونوں بھائیوں کے کُھروں کے نشان پائے گئے ہیں۔" میں نے اس سے کہا۔ "واقعاتی شہادت تمہارے خلاف ہے۔ اگر تم اقرار نہ بھی کرو تو میں عدالت میں تمہیں مجرم ثابت کر دوں گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ اپنے منہ سے اقبال جرم کر لو۔ میں یہ رعایت کروں گا کہ مقدمہ ذرا ڈھیلا بناؤں گا جس کی وجہ سے تم یا تو بری ہو جاؤ گے یا بہت تھوڑی سزا ملے گی۔"

"آپ اپنی تفتیش مکمل کریں۔" اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "انشاء اللہ ہم دونوں بھائی بے گناہ ثابت ہوں گے۔ بے شک آپ میرے کُھروں کے نشان بھی واردات والے کُھروں سے ملا کر دیکھ لیں۔"

اس کے بے پناہ اعتماد نے میرا یقین ڈانواں ڈول کر دیا۔ میں جو کچھ دیر پہلے اس سے اقبال جرم کروانے کے لیے تیار بیٹھا تھا، پریشان ہو گیا۔ میں نے اسے گھیرنے کے لیے بہت سوال پوچھے۔ گھما پھرا کر ایک ہی بات کئی طرح سے پوچھی مگر مجھے کچھ حاصل نہ ہوا۔

میری چھٹی حس بار بار کسی گڑبڑ کا احساس دلا رہی تھی مگر میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ معاملہ کہاں سے اُلجھ گیا ہے۔ میں نے بہت سوچا، سوچ سوچ کر میری کنپٹیاں درد کرنے لگیں۔ تنگ آ کر میں نے اس معاملے کو اگلے دن پر ڈال دیا۔ ویسے بھی شام ہو رہی تھی۔ میں نے حمید کو حوالات میں بھجوایا اور خود آرام کرنے کے لیے تھانے سے اٹھ گیا۔

مہنگے تحفے دیتا تھا

رات سونے کے لیے لیٹا تو اس کیس کے متعلق ہی سوچتا رہا۔ پھر جانے کس وقت آنکھ لگ گئی۔ صبح جب میں سو کر اٹھا تو تازہ دم ہو چکا تھا۔ تیار ہو کر تھانے پہنچا اور جاتے ہی عباس کے قتل والی فائل کھول لی۔ شروع سے آخر تک ایک ایک تفصیل کو دوبارہ پڑھا۔ اس میں چند باتیں ایسی نظر آئیں جو مشتبہ حمید اور اس کے بھائی رشید کے حق میں جاتی تھیں۔ مثلاً جائے واردات پر آنے اور جانے والے کُھرے پکی سڑک کی طرف سے آئے اور گئے تھے۔ جبکہ جائے واردات تک پہنچنے کے لیے گاؤں سے بہت کم فاصلہ تھا۔ انہیں کیا ضرورت پڑی تھی کہ اتنا لمبا چکر کاٹ کر پکی سڑک کی طرف سے جائے واردات تک پہنچتے۔ میں نے اس پر غور کیا تو ذہن نے کہا کہ پولیس کو بھٹکانے کے لیے ایسا کیا جا سکتا ہے۔

دوسری چیز جو غور طلب تھی وہ جائے واردات سے ملنے والی صلیب تھی۔ دونوں بھائی

مسلمان تھے جبکہ صلیب عیسائی گلے میں پہنتے ہیں۔ اس سلسلے میں، میں نے یہ مفروضہ قائم کیا کہ ہوسکتا ہے اس وقت میں بڑا بھائی رشید شامل نہ ہوا اور حمید نے اپنے کسی عیسائی دوست کو ساتھ ملا کر یہ قتل کیا ہو۔

میں نے مخبروں سے کہا کہ وہ یہ معلوم کریں کہ حمید کی دوستی کسی عیسائی کے ساتھ ہے۔ اگر ہے تو اس عیسائی کے متعلق مکمل معلومات حاصل کریں۔ اس کے علاوہ میں نے ان کو یہ بھی کہا کہ وہ معلوم کریں کہ حمید کی بہن کے مقتول عباس کے ساتھ تعلقات تھے یا نہیں۔ اس کے لیے میں نے سکینہ کو سمجھایا کہ وہ اس کی کسی راز دار سہیلی سے یہ معلومات حاصل کرے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے کھوجی کو بلوا کر کہا کہ وہ حمید کے جوتوں کے نشان لے کر انہیں جائے واردات پر ملنے والے کُھروں سے ملا کر دیکھے کہ یہ ایک ہی طرح کے ہیں یا مختلف۔

کھوجی اسی وقت اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ اس نے حمید کو کچی زمین پر چلا کر اس کے قدموں کے نشان حاصل کر لئے۔ اس نے کُھرے دیکھتے ہی اپنے سر کو دائیں بائیں اس طرح ہلایا جیسے انکار میں ہلایا جاتا ہے۔ پھر وہ میرے پاس آ گیا اس نے بتایا کہ یہ کُھرے جائے واردات پر پائے جانے والے کُھروں سے بہت زیادہ مختلف ہیں۔

میں نے کھوجی سے کہا کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ ملزم نے واردات کے وقت دوسرے جوتے پہن رکھے ہوں۔ مگر کھوجی نے اس امکان کو رد کر دیا اور بتایا کہ حمید کے پاؤں کا سائز جائے واردات پر پائے جانے والے کُھروں کے سائز سے لمبائی میں خاصا چھوٹا ہے اور چوڑائی میں بھی کم ہے۔ اس لیے جوتے بدلنے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔

یہ سن کر میں بڑا مایوس ہوا۔ میں نے مفروضوں کے بل بوتے پر جو عمارت کھڑی کی تھی وہ لرزنے لگی تھی اور کسی بھی وقت دھڑام سے گر سکتی تھی۔ مجھے اب مخبروں کی اطلاعات کا انتظار تھا۔ میں نے اب جو بھی قدم اٹھانا تھا، ان اطلاعات کی روشنی میں اٹھانا تھا۔ دوپہر کے وقت تک مخبر ایک ایک کر کے آنے لگے۔ ان سے جو معلومات حاصل ہوئیں، وہ میرے لیے حوصلے کا باعث نہیں تھیں۔

ان اطلاعات کے مطابق حمید یا رشید دونوں بھائیوں میں سے کسی کا بھی کوئی عیسائی دوست نہ تھا اور نہ ہی قصبے میں کبھی کوئی ایسا عیسائی نوجوان دیکھا گیا ہے جو اپنے گلے میں لکڑی کی صلیب ڈالے رکھتا ہو۔ اس کے علاوہ یہ بھی پتہ لگا کہ ان دونوں بھائیوں کا مقتول عباس سے کبھی بھی کسی طرح کا کوئی تنازعہ یا جھگڑا نہیں ہوا۔

بظاہر ان حالات میں حمید مجھے بے گناہ نظر آنے لگا تھا لیکن میرا اصول تھا کہ تفتیش میں کسی بھی بات کو حرفِ آخر نہیں سمجھتا تھا۔ ابھی مجھے سکینہ کا انتظار تھا۔ مجھے اُمید تھی کہ وہ کوئی کام کی بات معلوم کر لے گی۔ پھر خاصے انتظار کے بعد آخر سکینہ آ ہی گئی۔ اس نے جب اپنی رپورٹ پیش کی تو مجھے لگا کہ میں اب تک غلط رخ پر تفتیش کرتا رہا ہوں۔

سکینہ نے اپنے استادی طریقوں سے کام لیتے ہوئے نوراں کی راز دار سہیلی کو شیشے میں اتار لیا تھا۔ اس سہیلی نے بتایا کہ نوراں قصبے کے ہی ایک نوجوان سے عشق کرتی ہے۔ اس نوجوان کا نام حشمت ہے اور شہر میں سرکاری ملازم ہے۔ حشمت اسے شہر سے بڑے مہنگے تحفے لا کر دیتا ہے جن میں کپڑے، پرفیوم اور بناؤ سنگھار کا سامان ہوتا ہے۔ یہ دونوں راتوں کو چوری چھپے ملاقاتیں بھی کرتے ہیں، یہ دونوں راتوں کو چوری چھپے ملاقاتیں بھی کرتے ہیں۔

نوراں کے بھائیوں کو اس کا علم ہوگیا تھا اور انہوں نے کئی بار اپنی بہن کو مارا پیٹا بھی تھا اور کہا تھا کہ اگر وہ باز نہ آئی تو وہ اسے اور حشمت دونوں کو قتل کر دیں گے۔

سہیلی نے یہ بھی بتایا کہ وہ محبت میں اتنا آگے نکل گئے تھے کہ اب واپسی ناممکن تھی۔ نوراں اپنی سہیلی سے اکثر کہا کرتی تھی کہ اس کے بھائی بے شک اسے قتل کر دیں لیکن وہ حشمت کو نہیں چھوڑ سکتی۔ حشمت بھی اسے دیوانہ وار چاہتا تھا مگر وہ اس کے بھائیوں سے ڈرتا تھا، خاص طور پر نوجوان اور جوشیلے حمید سے وہ بہت گھبراتا تھا۔

ان حالات میں قتل تو حشمت اور نوراں کو ہونا چاہیے تھا مگر قتل عباس ہوگیا تھا جس کا ان سارے حالات سے کوئی تعلق بظاہر نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ یہ کوئی اور ہی چکر ہے۔ میں نے ضروری سمجھا کہ حشمت کو تھانے بلا کر پوچھ گچھ کروں۔

میں جتنا زیادہ اس کیس کے بارے میں غور کرتا، اتنا ہی اُلجھ جاتا، سوچ سوچ کر میرے دماغ کی چولیں ہل گئیں مگر میں کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ مجھے صاف نظر آنے لگا تھا کہ اب تک کی تفتیش اور بھاگ دوڑ سب اکارت گئی ہے اور میں وہیں کھڑا ہوں جہاں سے چلا تھا۔

مجھے کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرے پاس ٹوٹی ہوئی چوڑیوں، ایک ریشمی دوپٹے اور لکڑی کی صلیب کے سوا کچھ نہ تھا۔ اب میں نے انہی کے ذریعے اپنی تفتیش کو آگے بڑھانا تھا۔ ایک اور سراغ جو میرے پاس محفوظ تھا وہ تھا جائے واردات پر پائے جانے والے کُھروں کے مولڈ۔

حالات و واقعات نے کچھ اس طرح پلٹا کھایا تھا کہ میں چکرا کر رہ گیا تھا۔ میں نے اسی

وقت ایک کانسٹیبل کو بلا کر اسے حشمت کے متعلق بتا کر کہا وہ اس کے گھر جائے اور اس کو میرے پاس لے آئے۔ کانسٹیبل چلا گیا اور تقریباً ایک گھنٹے بعد آ کر اس نے بتایا کہ حشمت گھر میں نہیں ہے۔ اس کے گھر والوں نے بتایا کہ وہ کسی دوسرے شہر گیا ہوا ہے۔ اس نے گھر والوں کو بتایا تھا کہ دفتر والے اسے سرکاری کام سے کسی دوسرے شہر بھجوا رہے ہیں اور اس کو ایک ہفتہ لگ جائے گا۔

یہ سن کر مجھ پر جھنجلاہٹ طاری ہوگئی۔ میں جس طرف بھی قدم بڑھاتا تھا، راستہ بند ملتا تھا۔ وہ دن بھی ایسے ہی گزر گیا اور مجھے کام کی کوئی بات معلوم نہ ہو سکی۔

بارش اور بھید

رات کو آسمان پر کالے سیاہ بادل چھا گئے اور پھر موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ یہ بارش تقریباً رات بھر وقفوں وقفوں سے ہوتی رہی۔ صبح ہوئی تو پتہ چلا کہ رات کی بارش نے خاصی تباہی مچائی تھی اور کئی کمزور مکان اس کی زد میں آ کر گر گئے تھے۔ نشیبی علاقے جوہڑوں کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ میں بارش کے پانی سے بچتا بچاتا تھانے پہنچ گیا۔

ابھی مجھے بیٹھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ دو دیہاتی آدمی تھانے میں آئے اور محرر سے بات کرنے لگے۔ محرر نے ان کی بات سنی اور پھر فوراً ہی میرے پاس آ کر بتایا کہ یہ آدمی اطلاع لے کر آئے ہیں کہ کھیتوں سے ذرا ہٹ کر ایک گڑھے میں کسی عورت کی لاش نظر آ رہی ہے۔ لاش کا ایک کندھا اور بازو نظر آ رہا ہے اور باقی جسم زمین کے اندر ہے۔ ان دیہاتیوں کا کہنا تھا کہ لاش کو گڑھا کھود کر دفن کیا گیا تھا مگر رات کی تیز بارش اوپر کی مٹی بہا کر لے گئی تھی۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ جگہ کھیتوں کی نسبت ذرا نشیب میں تھی، اس لیے اوپر کی طرف سے بہہ کر آنے والا بارش کا تیز پانی گڑھے کے اوپر کی ناپختہ مٹی کو بہا کر لے گیا تھا۔

میں اسی وقت اپنے عملے کو ساتھ لے کر ان دیہاتیوں کے ساتھ چل پڑا۔ آبادی سے کافی ہٹ کر کھیتوں کا طویل سلسلہ تھا۔ کھیتوں کے ساتھ ساتھ کچھ پھلوں اور سبزیوں کے باغ بھی تھے۔ ایسے ہی ایک باغ سے ذرا ہٹ کر ایک نشیبی جگہ تھی۔ دیہاتی رہنمائی کرتے ہوئے مجھے اس نشیب میں لے گئے۔ نشیب میں اُتر کر انہوں نے گڑھے کی نشاندہی کی۔ میں نے قریب جا کر دیکھا۔ جس طرح دیہاتیوں نے بتایا تھا، بالکل ویسی ہی صورت حال تھی۔

گڑھے کے اندر مٹی سے ایک انسانی کندھا اور بازو باہر نکلا ہوا تھا اور صاف نظر آ رہا تھا

کہ یہ بازو کسی عورت کا ہے۔ عورت کا نہیں بلکہ نوجوان لڑکی کا۔ گڑھا اگرچہ خاصا گہرا تھا مگر وہی بات کہ نشیبی جگہ پر ہونے کی وجہ سے اور قیامت خیز بارش نے لاش کو ننگا کر دیا تھا۔

میں نے ان دونوں دیہاتیوں سے کہا کہ وہ کھیتوں سے اپنا کھدائی کا سامان لے آئیں۔

وہ دونوں اسی وقت بھاگے گئے اور دو کسیاں اور کھرپے لے آئے۔ میں نے انہیں احتیاط سے لاش کے اردگرد سے مٹی ہٹانے کو کہا۔ تھوڑی دیر میں انہوں نے پوری لاش کے اردگرد سے مٹی ہٹا دی۔ یہ ایک نوجوان لڑکی کی لاش تھی جو ٹیڑھی میڑھی پڑی تھی۔ لڑکی کی شکل وصورت اچھی رہی ہوگی مگر اس وقت خاصی ڈراؤنی لگ رہی تھی۔

میں نے قریب ہو کر غور سے دیکھا۔ اس کو گلا دبا کر مارا گیا تھا۔ اس وجہ سے اس کی بڑی بڑی حسین آنکھیں پھیل گئی تھیں اور ان میں دہشت اور اذیت نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ گلا گھٹنے کی وجہ سے منہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا اور زبان باہر آ گئی تھی۔ اس کے گلے پر دبانے کے واضح نشان نظر آ رہے تھے۔ وہاں جلد کے نیچے خون جم گیا تھا۔ باقی جسم پر کوئی تشدد کا نشان نہ تھا نہ ہی کوئی ایسے آثار نظر آ رہے تھے جن سے یہ معلوم ہو کہ کسی نے اس کے ساتھ جبراً زیادتی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے کپڑے بالکل درست حالت میں تھے۔

میں نے ان دیہاتیوں سے کہا کہ وہ گاؤں سے نمبردار اور ایک دو معزز آدمیوں کو بلا لائیں اور لاش لے جانے کے لیے ایک چارپائی بھی لے آئیں۔ ان آدمیوں کے جانے کے بعد میں نے لاش کے اردگرد کی مٹی کو غور سے دیکھا۔ اکثر جائے واردات پر ملنے والی چھوٹی موٹی اشیاء تفتیش میں بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔ مگر مجھے وہاں کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی۔ لاش کی دونوں مٹھیاں سختی سے بند تھیں۔

لاش کچھ سوج گئی تھی مگر ابھی گلنے سڑنے کا عمل شروع نہیں ہوا تھا۔ کھیت قریب ہونے کی وجہ سے مٹی نمدار تھی۔ مگر لاش سے بدبو آنے لگی تھی۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ قتل ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے۔ یہ دو یا تین دن پہلے کی واردات لگتی تھی۔ میں نے اس نشیب میں اِدھر اُدھر دور تک چل پھر کر زمین کا معائنہ کیا مگر یہ معائنہ فضول ہی تھا۔ اگر زمین پر کوئی سراغ موجود بھی تھا تو رات کی طوفانی بارش میں بہہ گیا ہوگا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دیہاتی ایک چارپائی اٹھائے آتے نظر آئے۔ ان کے پیچھے پیچھے نمبردار اور دو دوسرے آدمی آ رہے تھے۔ نمبردار کے آنے پر میں نے کاغذی کارروائی کی اور لاش کو چارپائی پر رکھوا دیا۔ اب اس لاش کی شناخت کا مرحلہ تھا جو بہت ضروری تھا۔ جب تک

یہ معلوم نہ ہو جاتا کہ یہ مقتولہ کون ہے، اس کے قتل کا باعث معلوم کرنا مشکل تھا۔

میں نے نمبردار اور اس کے ساتھ آنے والے دو آدمیوں کے آگے یہ مسئلہ رکھ دیا۔ لاش دریافت کرنے والے دونوں دیہاتیوں سے بھی کہا کہ وہ قریب آ کر غور سے لاش کا چہرہ دیکھیں اور اسے پہچاننے کی کوشش کریں۔ سب نے میرے کہنے پر بڑے غور سے لاش کا چہرہ دیکھا۔ اگرچہ مٹی میں دفن رہنے کی وجہ سے چہرہ کچھ سوج گیا تھا لیکن اس سے چہرے کے خدوخال اس حد تک نہیں بگڑے تھے کہ پہچانا نہ جاتا۔ باری باری سب نے انکار میں سر ہلا دیا۔

نمبردار نے دونوں آدمیوں سے کہا کہ چارپائی اٹھا کر گاؤں میں لے چلیں۔ ہم سب لاش کے ساتھ گاؤں میں پہنچ گئے۔ وہاں جا کر نمبردار نے لاش اپنے گھر کے باہر رکھوا دی اور اعلان کروا دیا کہ لوگ آ کر لاش کی شناخت کریں۔ ذرا سی دیر میں لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔ اس ہجوم میں سے بعض عورتوں اور مردوں نے لاش کو پہچان لیا۔ ایک عورت نے میرے پاس آ کر کہا۔

''تھانیدار جی، یہ تو لوہاروں کی لڑکی ہے۔ اس کا نام نوراں ہے۔''

نوراں کا نام سن کر میں ایک دم چونک گیا۔ مجھے یاد آ گیا کہ جس نوجوان حمید کو میں نے مقتول عباس کے قتل کے الزام میں مشتبہ بٹھایا ہوا ہے، اس کی بہن کا نام مجھے نوراں بتایا گیا تھا اور اس کے بھائی حمید نے بتایا تھا کہ وہ اپنی خالہ کے پاس کپورتھلہ گئی ہوئی ہے اور وہاں سخت بیمار ہے۔ اس کا بڑا بھائی رشید وہاں اس کی خبر لینے گیا ہوا تھا۔ اگر نوراں کپورتھلہ گئی ہوئی تھی تو یہ لاش کس کی تھی؟

میں نے کہا کہ کوئی فوری طور پر جا کر نوراں کی ماں کو بلا کر لے آئے۔ ابھی میں کسی کو بھیجنے ہی والا تھا کہ اچانک ایک ادھیڑ عمر کی عورت پریشانی کے عالم میں وہاں آ گئی۔ ایک عورت نے بتایا کہ یہ نوراں کی ماں ہے۔ وہ آتے ہی چارپائی پر پڑی لاش پر جھک گئی اور اس کو دیکھنے لگی۔ پھر ایک ہاتھ لاش کے منہ پر پھیرنے لگی۔ میں غور سے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور پھر وہ سسکنے لگی۔ پھر جیسے اس کے صبر کا بند ٹوٹ گیا۔

''نوراں......!'' اس کے منہ سے ایک دھاڑ کی مانند بیٹی کا نام نکلا اور پھر وہ لاش کے اوپر ہی گر پڑی۔ وہ بڑی بے تابی سے اپنی مُردہ بیٹی کا منہ سر چومنے لگی۔ یہ منظر دیکھ کر وہاں کھڑی کئی اور عورتیں بھی رونے لگیں اور بعض مردوں کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ خاصا جذباتی منظر تھا۔ میں بھی ایک انسان ہونے کے ناتے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

اس عورت کے ردِعمل سے یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ یہ لاش نوراں کی ہی ہے۔ بڑی

مشکل سے نوراں کی ماں کو لاش سے الگ کیا گیا۔ میں نے لاش ضروری کارروائی کے بعد پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی اور خود تھانے آ گیا۔

پردے اُٹھنے لگے

تھانے میں بیٹھ کر میں نے سارے واقعات پر غور کیا تو صورت حال واضح ہونے لگی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اپنی بہن نوراں کو حمید نے اکیلے یا دونوں بھائیوں نے مل کر قتل کیا ہے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ رشید بھی اس قتل میں شامل ہے یا نہیں۔ ایک اور بات جو مجھے کھٹک رہی تھی وہ یہ تھی کہ حمید نے یہ کیوں کہا تھا کہ ان کی بہن کپورتھلہ گئی ہوئی ہے۔ اگر یہ بات اس نے قتل پر پردہ ڈالنے کے لیے کی تھی تو یہ جھوٹ کب تک چلنا تھا۔ آخر ایک نہ ایک دن تو اس بھید سے پردہ اٹھنا ہی تھا۔

میں جوں جوں ان معاملات پر غور کرتا گیا، میری آنکھوں کے آگے سے پردے اٹھتے گئے۔ حمید کی گردن پر لگے خراشوں کے نشان یقیناً اس کی بہن نوراں کے ناخنوں کے تھے۔ اب مجھے حمید کی ابتدائی گھبراہٹ اور پریشانی کی وجہ معلوم ہو گئی تھی۔ اگرچہ بہت کچھ میری سمجھ میں آ گیا تھا لیکن پھر بھی کچھ باتیں ایسی تھیں جواب بھی ایک سوالیہ نشان کی طرح میرے سامنے تھیں۔

نوراں کو کپورتھلہ بھیجنے کا ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

حمید کا بڑا بھائی رشید نوراں کی بیماری کا بہانہ کر کے کپورتھلہ کیا لینے گیا تھا؟

حمید نے یہ کیوں کہا تھا کہ نوراں شدید بیمار ہے؟

اس کے علاوہ جو بات سب سے اہم تھی وہ یہ کہ اس سارے چکر میں عباس کا قتل کسی خانے میں فٹ نہیں ہو رہا تھا۔ کیونکہ اب تک کی تفتیش سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ مقتولہ نوراں کا مقتول عباس سے کسی قسم کا کوئی چکر نہیں تھا۔ اگر نوراں آوارگی یا ناجائز تعلقات کے شبہے میں قتل ہوئی تھی تو اس کے ساتھ اس کے آشنا حشمت کو قتل ہونا چاہئے تھا لیکن قتل عباس ہوا تھا۔

یہ بات بھی غور طلب تھی کہ جس جگہ عباس قتل ہوا تھا، مقتولہ نوراں کی لاش اس جگہ سے خاصے فاصلے پر ملی تھی۔ مقتولہ کی لاش کو دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا تھا کہ یہ دونوں قتل ایک ہی دن ہوئے ہوں گے۔ اس کی تصدیق تو پوسٹ مارٹم رپورٹ آنے کے بعد ہی ہو سکتی تھی۔ ایک

اور بات بھی میرے ذہن میں آئی جس نے مجھے اور زیادہ اُلجھا دیا۔ میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ جہاں عباس قتل ہوا اس جگہ پائے جانے والے کُھروں میں سے کوئی کُھر احمید کے کُھروں سے نہیں ملتا تھا۔ اس کا سیدھا سا مطلب نکلتا تھا کہ دونوں وارداتیں الگ الگ مجرموں نے کی ہیں۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ قتل کی ان دو وارداتوں کا آپس میں کوئی تعلق تھا یا نہیں۔

سوچ سوچ کر میرا دماغ گھن چکر بن گیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میرے بہت سے سوالوں کے جواب حوالات میں بند حمید کے پاس ہیں۔ مجھے حمید پر غصہ آنے لگا۔ وہ مجھے چکر دے رہا تھا۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ حوالات سے حمید کو لے آئے۔ کانسٹیبل گیا اور حمید کو لے آیا۔ میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا مگر وہ کھڑا ہی رہا۔

''آپ نے مجھے کس جرم میں یہاں بند کر رکھا ہے؟'' حمید نے ذرا تیز آواز میں مجھ سے کہا۔

میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''تمہاری بہن نوراں کپورتھلہ گئی ہے...... بولو، ہاں یا ناں!''

''ہاں!''

''تمہاری گردن پر ناخن تمہارے دوست نے مارے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں!'' اس نے ذرا متزلزل انداز میں کہا۔

میں نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے بائیں گال پر مارا۔ اس کے قدم اکھڑ گئے اور وہ لڑکھڑا کر ایک طرف کر گیا۔ میں نے بڑی تیزی سے اس کے بال اپنی مٹھی میں لے کر دو تین زوردار جھٹکے دیئے اور کہا۔ ''اب جھوٹ بولو پھر دیکھو میں تمہارا کیا حشر کرتا ہوں...... اب بتاؤ تمہاری بہن نوراں کہاں ہے؟''

''وہ کپورتھ......''

میں نے اس کی بات پوری نہ ہونے دی اور دونوں ہاتھوں سے اس کے بال پکڑ کر ایسا جھٹکا دیا کہ وہ زمین پر آ رہا۔ کانسٹیبل دروازے میں کھڑا تھا۔ میں نے اسے اشارہ کیا۔ وہ میرے اشارے کو سمجھ کر آگے بڑھا اور کرسی اٹھا کر اس کے پائیوں کے نیچے اس کا ایک ایک ہاتھ رکھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ کانسٹیبل خاصا بھاری بھرکم تھا۔ اس کے وزن سے کرسی کے پائے اس کے ہاتھ کی اُلٹی طرف گوشت کے اندر دھنسنے لگے اور ہڈیاں کڑکڑانے لگیں۔ وہ ذبح ہوتے بکرے کی طرح ڈکرانے اور تڑپنے لگا۔ وہ تکلیف کی شدت سے اپنا سر دائیں بائیں

بھٹک رہا تھا اور اس کی ٹانگیں اس طرح سے لرز رہی تھیں جیسے جان ٹانگوں کے راستے نکل رہی ہو۔

''سچ بولو گے تو یہ کانسٹیبل کرسی سے اٹھے گا۔'' میں نے بے رحم لہجے میں کہا۔ ''جھوٹ بولو گے تو ایک اور آدمی بلوا کر کرسی پر بٹھا دوں گا...... تمہاری بہن کی لاش مل گئی ہے۔ بولو اسے تم نے قتل کیا ہے...... کیا ہے یا نہیں؟''

''ہاں......'' اس کے منہ سے ایک کربناک آواز نکلی۔

''تمہارے ساتھ اور کون تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''پپ...... پانی!'' اس نے بڑی مشکل سے کہا اور پھر نڈھال ہو کر سر ایک طرف پھینک دیا۔

میں نے کانسٹیبل کو ہٹنے کو کہا تو وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ اسے پانی پلاؤ۔ وہ پانی لینے چلا گیا تو میں نے حمید کو دیکھا۔ اس پر غشی طاری ہو گئی تھی۔ موسم ویسے بھی گرمیوں کا تھا اور پھر تشدد کی وجہ سے اس کے جسم کا ہر مسام پسینہ اگل رہا تھا جس کی وجہ سے اس کا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

میں پہلے بھی کئی بار بتا چکا ہوں کہ میں تفتیش کے دوران تشدد کا قائل نہیں تھا لیکن کبھی کبھار مجبوراً تھرڈ ڈگری سے کام لینا پڑ جاتا تھا۔ کانسٹیبل پانی لے آیا تو میں نے اس سے کہا کہ وہ حمید کو اٹھا کر کرسی پر بٹھا دے۔ کانسٹیبل نے پانی کا گلاس میز پر رکھا اور حمید کو بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے اٹھا کر کرسی پر بٹھا دیا۔ پھر اس نے حمید کے منہ سے پانی کا گلاس لگا دیا۔ اس نے اتنی بے صبری سے پانی پیا کہ کچھ اس کے کپڑوں پر بھی گر گیا۔

پانی پی کر اس کے حواس کچھ بحال ہوئے۔ اس نے درد کی شدت کم کرنے کے لیے دونوں مضروب ہاتھوں کو اپنی بغلوں میں دبا لیا تھا اور خوفزدہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے مری مری آواز میں اور پانی مانگا۔

''پانی بھی پلاؤں گا اور روٹی بھی کھلاؤں گا۔'' میں نے میز پر پڑے ہوئے بید کو اٹھا کر ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ پر آہستہ آہستہ مارتے ہوئے کہا۔ ''پہلے اقبالی بیان دو۔ ہر بات سچ سچ بیان کرو۔''

وہ کوئی پختہ کار مجرم نہیں تھا جو تشدد برداشت کر لیتا اور اپنے جھوٹے بیان پر اڑا رہتا۔ وہ ایک شریف سا نوجوان تھا جو غیرت کے جوش میں آ کر قتل جیسا بھیانک جرم کر بیٹھا تھا۔ انسانی

خون تو بڑے بڑے بے رحم قاتلوں کو بھی ہضم نہیں ہوتا۔

حمید فوراً اقبالی بیان دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ ابھی میں نے اس سے بیان لینا شروع نہیں کیا تھا کہ میرا ہندو اے ایس آئی میرے پاس آیا اور سلیوٹ کر کے مجھے نوراں کی پوسٹ مارٹم رپورٹ پیش کی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بتایا کہ لاش بھی آ گئی ہے۔

میں نے رپورٹ دیکھی۔ اس میں قتل کی تاریخ وہی لکھی جس روز عباس قتل ہوا تھا۔ اس کی موت کی وجہ گلا دبانا لکھی گئی تھی۔ جس کی وجہ سے مقتولہ دم گھٹنے سے مرگئی تھی۔ یہ بھی لکھا تھا کہ مقتولہ کنواری ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ مقتولہ صاف کردار کی مالک تھی اور اس کے حشمت یا کسی اور کے ساتھ جسمانی تعلقات نہیں تھے۔

عباس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کی طرح اس رپورٹ کے آخر میں بھی، ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ مقتولہ کے ناخنوں میں انسانی گوشت کے ریزے پھنسے ہوئے ملے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک مٹھی کے اندر سے تین چار انسانی بال بھی ملے ہیں۔ رپورٹ کے ساتھ لف ایک چھوٹے لفافے میں یہ بال بھی موجود تھے۔ یہ بال یقیناً حمید کے ہوں گے۔

میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ وہ حمید کو ہتھکڑی لگا دے۔ جب حمید کو ہتھکڑی لگ گئی تو میں نے اسے باہر لانے کا اشارہ کیا۔ تھانے کے برآمدے میں ایک چارپائی پر نوراں کی لاش پڑی تھی۔ میں حمید کو اس کی بہن کی لاش دکھانے کے لیے لے جا رہا تھا۔ ابھی ہم لاش سے کچھ دور ہی تھے۔

''اپنے اس دوست کو دیکھو گے۔'' میں نے ڈرامائی انداز میں اس سے کہا۔ ''جس کے ناخن تمہاری گردن پر لگے تھے۔'' میں نے چارپائی پر چادر میں لپٹی اس کی بہن کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ ہے تمہارا دوست!''

وہ چلتے چلتے رک گیا اور خوفزدہ نظروں سے چارپائی کی طرف دیکھنے لگا جہاں اس کی بہن کی لاش چادر میں لپٹی پڑی تھی۔ جس کانسٹیبل نے اس کی ہتھکڑی پکڑی ہوئی تھی، وہ میرے اشارے پر اس کو آگے کھینچنے لگا۔ حمید چل نہیں رہا تھا بلکہ گھسٹ رہا تھا۔ چارپائی کے پاس لے جا کر اسے کھڑا کر دیا گیا۔ وہ یک ٹک پلکیں جھپکائے بغیر چارپائی پر پڑی لاش کی طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر لاش کے منہ سے چادر ہٹا دی۔ نوراں کا اذیت سے بگڑا ہوا خوفناک چہرہ دیکھ کر حمید کو زبردست جھٹکا سا لگا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں جیسے وہ اپنے

آنسو روکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر یکلخت اس کے اندر بڑی ڈرامائی تبدیلی پیدا ہوئی اور اس کے اعصاب تن گئے اور مٹھیاں بھنچ گئیں۔ مجھے ایسا نظر آنے لگا جیسے وہ لاش پر ہی جھپٹ پڑے گا۔

''بے غیرت!'' اس کے منہ سے قہر بھری سرگوشی نما آواز نکلی اور اس نے نفرت کی شدت سے اپنی بہن کی لاش کی طرف تھوک دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ انتہائی تیزی سے مڑا، ہتھکڑی کو زوردار جھٹکا دیا۔ جھٹکا اتنا شدید تھا کہ ہتھکڑی کی زنجیر کانسٹیبل کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور حمید بھاگ اٹھا۔

ایک دم کھلبلی سی مچ گئی اور وہاں کھڑے پولیس کے ملازم اس کے پیچھے بھاگے۔ میں بھی اضطراری طور پر ان کے پیچھے ہی لپکا۔ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ وہ بھاگتا ہوا تھانے سے باہر جانے کی بجائے سیدھا میرے کمرے میں گھس گیا۔

میں اس کی اس وقت کی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ وہ بیک وقت دو طرح کی کیفیات کے درمیان پس رہا تھا۔ ایک طرف ماں جائی بہن کے پیار کی ٹھنڈک تھی تو دوسری طرف اسی بہن سے نفرت کا الاؤ دہک رہا تھا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو عملے کے لوگ اس طرح گھیرا ڈالے اس کے گرد کھڑے تھے جیسے اس کے اُڑ جانے کا اندیشہ ہو۔ وہ کانسٹیبل جس کے ہاتھ میں ہتھکڑی کا سرا تھا۔ اپنی خفت مٹانے کے لیے حمید کے بال پکڑ کر جھٹکے دے رہا تھا۔ میں نے اسے ڈانٹ کر الگ کیا اور سب کو باہر نکل جانے کو کہا۔ وہ سب باہر نکل گئے۔

اللہ ایسی بہن کسی کو نہ دے

جب سارے باہر چلے گئے تو میں نے حمید کی طرف دیکھا۔ اس کی نفسیاتی حالت اس وقت ایسی ہو گئی تھی جیسے ایک معصوم بچے نے غصے کے عالم میں اپنا من پسند کھلونا توڑ دیا ہو اور اب پچھتا رہا ہو۔ میں نے اس کی اس وقت کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور اسے تسلی دلاسہ دینے لگا۔ اس کے اندر پہلے ہی بڑی ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی۔ مگر وہ صبر کیے ہوئے تھا۔ میرے اس ہمدردانہ رویے کی وجہ سے اس کے صبر وضبط کا بند ٹوٹ گیا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا۔

اس کے منہ سے سسکیاں نکلنے لگیں جو بڑھتے بڑھتے ہچکیوں میں بدل گئیں۔ میں نے اسے کھل کر رونے دیا تاکہ اس کے اندر کا غبار نکل جائے۔ یہ غبار اس نے نہ جانے کب سے اپنے سینے کے اندر روک رکھا تھا۔ جب طوفان گزر گیا تو سکون ہو گیا۔ میں نے اس کے ساتھ

اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں اور باتوں باتوں میں اس کو اقبالی بیان دینے پر آمادہ کر لیا۔

اس نے بڑی تفصیل سے اپنا اقبالی بیان سنایا۔ اس دوران وہ بار بار جذباتی ہو جاتا تھا اور میں اسے سنبھالتا تھا۔ اس دوران میں اپنی ضرورت کے مطابق اس سے سوالات بھی پوچھتا رہا۔ اس کا اتنا لمبا بیان میں ذرا اختصار سے آپ کو سنا دیتا ہوں۔ اس نے اپنے بیان کے دوران کہا تھا کہ اللہ ایسی بہن کسی کو نہ دے۔

رشید اور حمید کا باپ لوہاروں کا کام کرتا تھا اور ایک ماہر کاریگر تھا۔ اس نے بچپن میں ہی دونوں لڑکوں کو اپنے ساتھ کام میں لگا لیا تھا۔ ان کی اکلوتی بہن نور بی بی عرف نوراں دونوں بھائیوں کے درمیان پیدا ہوئی تھی۔ رشید سب سے بڑا تھا۔ اس کے بعد نوراں تھی اور حمید نوراں سے ایک سال چھوٹا تھا۔ اس نے ایسا قد کاٹھ نکالا تھا کہ نوراں سے بڑا لگتا تھا۔

ان کی آمدنی اچھی خاصی تھی جس کی وجہ سے گھر میں خوشحالی تھی۔ نوراں باپ اور دونوں بھائیوں کی لاڈلی تھی اور اس کی ہر خواہش پوری کی جاتی تھی۔ جب ان کا باپ مر گیا تو اس کے بعد بھائیوں نے نوراں کو اس کی کمی محسوس نہ ہونے دی اور اس کے لاڈ اٹھاتے رہے۔ وہ اسے شہر سے کپڑے اور دوسری اشیاء لا کر دیتے تھے۔ اس لاڈ پیار کے ماحول میں نوراں جوان ہوئی تھی۔ وہ کچھ خودسر اور آزاد خیال ہو گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی ہر بات منوانے کی عادی ہو گئی تھی۔

پتہ نہیں کس طرح اس کے تعلقات حشمت سے ہو گئے اور دونوں چوری چھپے ملاقاتیں کرنے لگے۔ اگرچہ یہ چوری چھپے کی ملاقاتیں تھیں مگر دیہات میں کسی کا راز، راز نہیں رہتا، اسی طرح نوراں اور حشمت کے قصے بھی لوگوں کے کانوں تک پہنچ گئے اور پھر دبی دبی سرگوشیاں گونجنے لگیں۔ کئی بار دونوں بھائیوں نے نوراں کو مارا پیٹا تھا مگر وہ ڈھیٹ ہو چکی تھی۔ رشید اور حمید کو پتہ لگا تھا کہ وہ اکثر راتوں کو جب سب سوئے ہوئے ہیں، اٹھ کر باہر نکل جاتی ہے جہاں ایک خاص جگہ پر حشمت اس کا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔ بھائیوں نے اس کا گھر سے نکلنا بند کر دیا اور اس پر سختی کر دی تاکہ وہ رات کو باہر نہ نکل سکے۔

وقوعے والی رات اچانک حمید کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا بہن اپنی چارپائی پر موجود نہیں تھی۔ اس نے فوراً اٹھ کر باہر والا دروازہ دیکھا۔ کنڈی کھلی ہوئی تھی اور نوراں گھر میں کہیں بھی نہیں تھی۔ حمید کا خون کھولنے لگا اور اس نے فوراً بڑے بھائی کو جگا کر صورتِ حال بتائی۔ وہ بھی غصے میں آ گیا۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ آج اس قصے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں گے۔

وہ دونوں غیرت کے جوش میں نوراں اور حشمت کے قتل کا ارادہ کر کے نکلے تھے۔ رشید نے کلہاڑی اٹھا لی اور حمید نے ایک نوکدار سلاخ لے لی۔ وہ کھیتوں سے ہو کر آگے نکلے تو پھلوں کے باغ کے نزدیک پہنچ گئے۔ چاندنی رات میں درختوں کے بیچ نوراں اور حشمت صاف نظر آ رہے تھے۔ غالباً انہوں نے بھی حمید اور رشید کو آتے دیکھ لیا تھا۔ دونوں بھائیوں کو آتے دیکھ کر حشمت خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلا۔

رشید نے حشمت کو بھاگتے دیکھا تو کلہاڑی لے کر اس کے پیچھے بھاگا۔ حشمت خاصا دور نکل گیا تھا۔ اُمید نہیں تھی کہ رشید اس کو پکڑ لے گا۔ ادھر حمید شکار ہاتھ سے جاتا دیکھ کر تلملا کر بہن کی طرف بڑھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، سلاخ پھینک کر دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی اور پوری قوت سے دبانے لگا۔

نوراں نے بہت ہاتھ پیر مارے اور اپنی گردن چھڑانے کی کوشش کی لیکن حمید کے سر پر خون سوار تھا اور وہ پاگل ہو چکا تھا۔ اس نے گردن نہ چھوڑی۔ نوراں نے اس کی گردن پر ناخن گاڑ کر اس کی کھال ادھیڑ دی، اس کے بال کھینچے مگر حمید نے گرفت ڈھیلی نہ کی۔ پھر نوراں کی مزاحمت دم توڑنے لگی اور آخر اس نے حمید کے ہاتھوں میں دم توڑ دیا۔

اتنی دیر میں رشید واپس آ گیا۔ وہ حشمت کو پکڑنے میں ناکام رہا تھا۔ اس نے نوراں کی لاش دیکھی تو پریشان ہو گیا۔ مگر جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ دونوں نے صلاح مشورے کے بعد باغ کے قریب واقع نشیب میں ایک گہرا گڑھا کھود کر لاش اس میں دبا دی اور اوپر مٹی ڈال کر اچھی طرح برابر کر دی۔ اس کے بعد وہ گھر آ گئے اور سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنی ماں کو بھی جگا لیا اور اسے بتایا کہ وہ کیا کر آئے ہیں۔

ماں نے یہ سنا تو رونے لگی۔ دونوں بھائیوں نے اسے ڈرایا کہ بیٹی تو مر گئی ہے اور اب وہ اگر رونا دھونا مچائے گی تو بیٹوں سے بھی جائے گی۔ دونوں پھانسی چڑھ جائیں گے۔ ماں نے جب دونوں جوان بیٹوں کی موت کے متعلق سوچا تو اپنے آنسو اور اپنے بَین سینے کے اندر دبا لئے۔

دونوں بھائیوں نے یہ طے کیا کہ محلے داروں میں یہ مشہور کر دیا جائے کہ نوراں اپنی خالہ کے گھر گئی ہوئی ہے۔ ماں کو بھی انہوں نے یہ پٹی پڑھا دی کہ سب کو یہی بتائے۔

”مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آئی۔“ میں نے حمید سے پوچھا۔ ”اپنی بہن کو تم لوگوں نے مار کر دفن کر دیا تھا اور لوگوں میں یہ مشہور کر دیا کہ وہ کپورتھلہ اپنی خالہ کے ہاں گئی ہے۔ اس کے

بعد یہ کیوں مشہور کیا کو نوراں وہاں بیمار ہوگئی ہے اور رشید اس کی خبر لینے گیا ہے؟''

اس کے جواب میں اس نے مجھے جو کچھ بتایا اس سے مجھے احساس ہوا کہ وہ جرم تو کر بیٹھے تھے اب مختلف طریقوں سے اس پر پردے ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان دونوں نے یہ سوچا تھا کہ پہلے وہ نوراں کی شدید بیماری کی افواہ اُڑائیں گے اور پھر رشید اس کی خبر گیری کے بہانے کپور تھلہ جائے گا اور دو تین دن وہاں رہ کر اطلاع بھجوائے گا کہ نوراں بیماری کی وجہ سے مرگئی ہے اور اسے کپور تھلہ میں ہی دفن کر دیا گیا ہے۔

حمید نے یہ بھی بتایا کہ جب ہندو اے ایس آئی انہیں تھانے لے جانے آیا تھا تو اس وقت رشید بھی حمید کے ساتھ ہی تھا۔ انہوں نے اے ایس آئی شنکر کو رشوت دے کر اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ تھانے جا کر یہ کہہ دے کر رشید کپور تھلہ کیا ہوا ہے۔

میں نے اس کا بیان لکھ کر اس کے دستخط کروا لئے۔ اس کے بعد میں نے مزید ثبوت کے لیے نوراں کی مٹھی سے ملنے والے بالوں اور ناخنوں سے ملنے والے گوشت کے ریزوں کا تجزیہ کرانا تھا کہ یہ بال اور ناخنوں میں پھنسا ہوا گوشت حمید کے ہی ہیں۔ ان کاموں سے فارغ ہونے کے بعد میں نے ایک پولیس پارٹی تشکیل دی اور اسے اے ایس آئی کی قیادت میں کپور تھلہ رشید کو گرفتار کرنے کے لیے بھیج دیا۔ میں نے حمید سے وہاں کا ایڈریس لے لیا تھا۔

اگلے روز رشید کو بھی گرفتار کر کے تھانے میں لایا گیا۔ میں نے اس کا بیان بھی لے لیا۔ پہلے تو وہ ٹال مٹول کرتا رہا مگر جب میں نے اسے حمید کا بیان دکھایا اور یہ بتایا کہ نوراں کے قتل کا پول کھل چکا ہے تو وہ بیان دینے پر آمادہ ہوگیا۔ اس نے بھی حمید کے بیان کی تصدیق کر دی۔

میں نے اپنے اے ایس آئی کو ٹریننگ دینے کے لیے یہ مقدمہ اس سے تیار کروایا اور ساری کارروائیاں اس کے سپرد کر دیں۔ ہم نے یہ مقدمہ تیار کر کے عدالت میں سماعت کے لیے پیش کر دیا۔

میں نے مقتول عباس کے قتل کی تفتیش شروع کی تھی اور بیچ میں نوراں کے قتل کا کیس کود پڑا تھا۔ میں لاعلمی اور نادانستگی میں اس قتل کا سراغ لگا بیٹھا تھا۔ اب ایک بار پھر میں وہیں کھڑا تھا جہاں سے چلا تھا۔ عباس کے قتل کی تفتیش میرے لیے ایک چیلنج بن گیا تھا۔ میں اپنے آپ کو ایک دشوار اور پیچیدہ تفتیش کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنے لگا۔ میں نے یہ چیلنج قبول کر لیا تھا۔

عباس کے قاتل کو پکڑنے کا چیلنج میں نے قبول تو کر لیا تھا لیکن میرے پاس ایسا کوئی سراغ نہ تھا جس کی مدد سے میں اپنی تفتیش کو آگے بڑھاتا۔ میں عباس کے قاتلوں کو پکڑنے کے

لیے سراغ لگاتا ہوا جن راستوں پر اپنی تفتیش کو آگے بڑھاتا رہا تھا، وہ تمام راستے نوراں کی قبر تک جا کے ختم ہوگئے تھے۔ نادانستگی میں، میں ایک اور ہی قتل کا سراغ لگا بیٹھا تھا۔

نوراں کے قتل کا مقدمہ ابھی عدالت میں زیرِ سماعت تھا۔ دو تین پیشیاں ہو چکی تھیں۔ نوراں کے بھائیوں رشید اور حمید نے ایک بڑا ہی قابل ہندو وکیل کھڑا کیا تھا۔ اس کا پورا نام مجھے بھول گیا ہے، صرف ورما یاد رہ گیا ہے۔ ورما بڑا محنتی اور کام کے سلسلے میں ایماندار وکیل تھا۔ وہ پوری تیاری کر کے عدالت میں آتا تھا اور اس کی جرح بڑی سخت ہوتی تھی۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اپنے مؤکلوں کو بچانے یا کم سے کم سزا دلانے کے لیے کوئی نہ کوئی نکتہ نکال ہی لیا تھا۔

میں نے یہ کیس اپنے نالائق ہندو اے ایس آئی شنکر کے سپرد کیا ہوا تھا۔ اس سے پہلے میں نے رشید اور حمید سے رشوت لینے کے چکر میں بڑی سختی سے سرزنش کی تھی اور کہا تھا کہ اگر آئندہ اس کی رشوت خوری یا کسی قسم کی بددیانتی کی رپورٹ ملی تو اس کے خلاف اوپر تک رپورٹ بھجواؤں گا۔ شنکر نے معافی مانگی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ وہ آئندہ شکایت کا موقع نہیں دے گا۔

میرے کہنے کے مطابق شنکر پوری تیاری کر کے عدالت جاتا تھا۔ ویسے بھی میں نے بڑا مضبوط کیس تیار کیا تھا اور کوئی خانہ خالی نہیں چھوڑا تھا۔ میں ان دنوں صرف عباس کے قتل کا سراغ لگانے کے لئے اپنا دماغ کھپا رہا تھا۔

میں تھانے میں بیٹھا عباس کے قتل کی فائل دیکھ رہا کہ ایک ہیڈ کانسٹیبل نے آ کر بتایا کہ ایک نوجوان مجھ سے ملنا چاہتا ہے اور وہ اپنا نام حشمت بتاتا ہے۔ مجھے یاد آ گیا کہ حشمت وہی نوجوان ہے جس کا مقتولہ نوراں کے ساتھ معاشقہ چل رہا تھا اور وہ قتل والی رات رشید اور حمید کو دیکھ کر بھاگ گیا تھا۔ بعد میں پتہ لگا تھا کہ وہ اپنے دفتر کے سرکاری کام سے کسی دوسرے شہر گیا ہوا ہے۔

میں نے اس کو بلوا لیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ایک لمبا تڑنگا صحت مند نوجوان اندر آیا اور اس نے جھک کر مجھے سلام کیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک خوبرو اور مردانہ وجاہت سے بھرپور نوجوان تھا۔ وہ واقعی اس قابل تھا کہ اسے چاہا جائے۔ پھر مجھے نوراں یاد آ گئی جو محاورتاً ہی نہیں حقیقتاً حشمت پر مرمٹی تھی۔ زندگی بھر ساتھ نبھانے کے وعدے کرنے والا یہ عاشق نامراد اسے کڑے وقت میں چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔

اس کا صحت مند جسم اور قد و قامت دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ اگر یہ بھاگنے کی بجائے نوراں کے بھائیوں کے مقابلے میں کھڑا ہو جاتا تو اکیلا ہی دونوں پر بھاری پڑ سکتا تھا۔ مجھے اچانک اس پر غصہ آ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں مر گیا تھا۔

وہ ہونقوں کی طرح میرا منہ دیکھنے لگا اور بولا کچھ بھی نہیں۔

"تم نوراں کو چھوڑ کر بھاگ کیوں گئے تھے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"اپنی جان بچانے کے لیے۔" اس نے شرمندگی سے نظریں جھکا کر کہا۔

"صرف تمہاری بزدلی کی وجہ سے وہ ماری گئی۔" میں نے غصے سے کہا۔ "اگر تم مردوں کی طرح مقابلہ کرتے تو اپنی جان کے ساتھ ساتھ نوراں کی جان بھی بچا سکتے تھے۔"

وہ میری طرف ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے ابھی رو پڑے گا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں اور پھر آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے اور پھر اس کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا اور وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔ اتنا خوبصورت جوان مرد کمزور عورتوں کی طرح آنسو بہاتا ہوا مجھے اچھا نہ لگا۔ میں یوں اسے حیرت سے دیکھنے لگا جیسے وہ دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہو۔ مجھے وہ نارمل نہیں لگ رہا تھا۔

"میں بہت بزدل انسان ہوں۔" حشمت نے اپنے آپ پر قابو پا کر کہا۔ "اتنا صحت مند ہونے کے باوجود لڑائی جھگڑے کا نام سن کر یا کسی کو لڑتے دیکھ کر ہی میری ٹانگیں کانپنے لگتی ہیں...... اپنی اسی بزدلی کی وجہ سے میں نوراں کو موت کے منہ میں چھوڑ کر بھاگ گیا تھا...... میں نوراں کے قابل نہیں تھا بلکہ میں اس دنیا میں رہنے کے قابل ہی نہیں ہوں۔ اس زندگی سے موت اچھی ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ اس کے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے۔ یہی سوچ کر محض اپنی دلچسپی کی خاطر میں نے اسے کریدنا شروع کیا تو اس نے اپنا آپ پوری طرح کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میری اس کے ساتھ بڑی طویل باتیں ہوئی تھیں۔ میں مختصراً آپ کو سنا دیتا ہوں۔

حشمت ابھی تین چار سال کا تھا کہ اس کی ماں مر گئی۔ باپ نے دوسری شادی کر لی۔ سوتیلی ماں روایتی سوتیلی ماؤں جیسی نکلی اور اس نے حشمت کو وہ پیار اور توجہ نہ دی جس کی اسے ضرورت تھی۔ دوسری طرف اس کا باپ نئی نویلی بیوی کے ساتھ مست اور مگن ہو گیا۔ جب سوتیلی ماں کے اپنے بچے ہو گئے تو اس نے بات بے بات حشمت کو مارنا پیٹنا اور ڈانٹنا پھٹکارنا شروع کر دیا۔ باپ کا رویہ بھی بیگانوں جیسا ہی تھا۔

ان حالات میں حشمت پلا بڑھا تھا۔ وہ نفسیاتی مریض بن گیا تھا۔ اس کے اندر خود اعتمادی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ ہر وقت ڈرا سہا رہنے لگا تھا۔ ان حالات میں وہ جوان ہوا تھا۔ وہ جسمانی طور پر بڑا صحت مند اور خوبصورت جوان نکلا تھا لیکن نفسیاتی طور پر بڑی ہی کمزور شخصیت رکھتا تھا۔ اس کے متعلق صحیح رائے تو کوئی ماہر نفسیات ہی دے سکتا ہے۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ وہ شیر جیسے جسم میں گیدڑ جیسا دل رکھتا تھا۔

اس زندگی سے موت اچھی

میں نے اس کا تفصیلی بیان لکھا اور اس کے دستخط کروا لئے۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے گواہی کے لیے تیار کیا۔ اس کی حیثیت موقعہ کے گواہ کی سی تھی اور اس کی گواہی بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ میں نے شنکر سے کہا کہ اگلی پیشی پر وہ حشمت کو بھی پیش کر دے۔

بہر حال کیس چلتا رہا۔ کیس مضبوط تھا مگر ہندو وکیل ورما نے بڑی مہارت اس کا رخ موڑ کر فوری اشتعال ثابت کر دیا۔ عدالت نے جلدی ہی فیصلہ سنا دیا۔ حمید نے اپنی بہن نوراں کا گلا دبا کر قتل کیا تھا اس لیے اسے سات سال اور بڑے بھائی رشید کو اعانتِ جرم اور اس پر پردہ ڈالنے کے جرم میں چار سال قید کی سزا دی گئی۔ ورما کے کہنے پر انہوں نے اس سزا کے خلاف اپیل کر دی۔ ان کی اپیل منظور ہوئی اور سزا کم ہو کر بالترتیب پانچ سال اور دو سال رہ گئی۔

جس دن عدالت سے اس کیس کا فیصلہ ہوا اس سے اگلے دن حشمت میرے پاس تھانے آ گیا۔ وہ بڑا گھبرایا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ خیریت تو ہے وہ اتنا گھبرایا ہوا کیوں ہے۔

"آپ تو کہتے تھے ان کو پھانسی ہو گی۔" اس نے پریشانی سے کہا۔ "مگر وہ دونوں زندہ بچ گئے ہیں۔ وہ جب رہا ہو کر آئیں گے تو مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

مجھے یاد آ گیا کہ میں نے اسے یہ کہہ کر گواہی دینے کے لیے تیار کیا تھا کہ اس کی گواہی سے رشید اور حمید کو پھانسی کی سزا ہو جائے گی اور اس طرح وہ ان سے نوراں کے قتل کا انتقام لے سکتا ہے۔

میں نے اس کو اپنے پاس بٹھا کر تسلی دی کہ وہ بالکل نہ گھبرائے۔ وہ رہا ہو کر آئیں گے تو میں ان کو سختی سے وارننگ دوں گا اور نیک چلنی کی ضمانت لوں گا۔ میں اسے خاصی دیر تک سمجھاتا رہا مگر مجھے لگتا تھا کہ میری کوئی بات اس کے پلے نہیں پڑی۔ پھر وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ میں نے غور سے سنا۔

''میں تمہارا مجرم ہوں نوراں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں تمہارا انتقام بھی نہیں لے سکا...... وہ دونوں بچ گئے ہیں...... میں کیا کروں؟''

پھر وہ کچھ سوچنے لگا اور یوں سر ہلانے لگا جیسے کسی مسئلے پر غور کر رہا ہو۔ پھر اس نے فیصلہ کن انداز میں سر ہلایا اور بڑبڑایا۔ ''یہ ٹھیک ہے...... ہاں ہاں، سارے مسئلے کا حل یہی ہے۔''

پھر وہ بڑی تیزی سے اٹھا اور بغیر کچھ کہے تھانے سے نکل گیا۔

میں نے اسے روکنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن وہ نہیں رکا۔ مجھے ڈر تھا کہ اس کا دماغ نہ چل جائے۔ وہ پیار کا بھوکا تھا اور زندگی میں پہلی بار اسے کسی نے پیار دیا تھا وہ بھی قتل ہوگئی۔ اس کا حشمت کے دماغ پر بہت برا اثر پڑا تھا۔

وہ تھانے کے صحن میں جاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ میں اسے آخری بار دیکھ رہا ہوں۔ اگلے دن تھانے میں یہ المناک اطلاع آئی کہ رات حشمت نے چھت کے شہتیر میں پھندہ باندھ کر خودکشی کر لی ہے۔ میں خود موقعہ پر گیا۔ یہ کڑیوں والی چھت تھی جس کے درمیان میں ایک بڑا شہتیر لگا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ چارپائی کی ادوائن کا پھندہ پڑا ہوا تھا اور پھندے سے حشمت کی لاش لٹک رہی تھی۔ اس کی گردن کھچ کر لمبی ہوگئی تھی اور آنکھیں حلقوں سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔

مجھے اس نوجوان کی حرام موت کا بڑا افسوس ہوا۔ اصل میں اس کی موت کے ذمہ دار اس کا باپ اور سوتیلی ماں تھے لیکن میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ضروری کارروائی کر کے لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیا۔ جب میرا عملہ حشمت کی لاش لے کر جا رہا تھا تو میرے دماغ میں اس کے کہے ہوئے الفاظ گونج رہے تھے کہ اس زندگی سے تو موت اچھی ہے۔

حشمت کی المناک موت کے ساتھ عشق و محبت کا یہ خونی ڈرامہ ختم ہوگیا۔

گرہیں کھلنے لگیں

دوسری طرف عباس کے قتل کو بیس بائیس دن گزر گئے تھے۔ عباس کا قتل میرے لیے معمہ بن گیا تھا جو کسی طرح حل ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ ڈی ایس پی ایک ہندو تھا جس کا نام جگدیش تھا۔ میں نے سنا تھا کہ وہ بڑا متعصب ہے اور مسلمانوں سے دشمنی رکھتا ہے۔ وہ عباس کے کیس کے متعلق پوچھتا رہتا تھا کہ کتنی پیش رفت ہوئی ہے۔ اب اتنے دن گزر جانے کے بعد اس نے میری جان کو آ جانا تھا۔

ہر طرف سے مایوس ہو کر میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ وہ میری مدد کرے اور اپنے نام لیوا کو ایک بت پرست کے سامنے ذلیل و خوار ہونے سے بچا لے۔ یہ دعا مانگ کر میں مطمئن سا ہوگیا کہ اللہ ضرور میری مدد کرے گا۔

وہ دن بھی یوں ہی گزر گیا اور کوئی پیش رفت نہ ہوئی۔ اگلے دن میں تھانے میں بیٹھا ہوا تھا جب قصبے کا نمبردار آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک جواں عمر آدمی تھا۔ نمبردار نے جب اس آدمی کا تعارف کرایا تو میں اپنی کرسی پر سیدھا کر بیٹھ گیا۔

''اس کا نام شکور ہے۔'' نمبردار نے کہا۔ ''اور یہ مقتول عباس کا دوست ہے۔ یہی اس سے ملنے آیا کرتا تھا۔''

میں نے اس کو بٹھا لیا۔ وہ کچھ پریشان سا نظر آ رہا تھا۔ میں نے نمبردار کو باہر بیٹھنے کو کہا تو وہ سلام کر کے باہر چلا گیا۔ میں نے شکور کے ساتھ دو چار باتیں ویسے ہی کیں تاکہ اس کی جھجک ختم ہو جائے۔ پھر میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اسے معلوم ہے کہ اس کا دوست عباس قتل ہوگیا ہے۔ اس کے جواب میں اس نے بتایا کہ اسے ابھی نمبردار سے یہ خبر ملی ہے۔ شکور نے یہ بتا کے مجھے حیران کر دیا کہ وہ عباس کا دوست نہیں ہے بلکہ عباس کے دوست کا ملازم ہے اور وہ اس کے حکم پر عباس کی خیر خبر معلوم کرنے کے لیے آتا رہتا ہے۔

''تم کس کے ملازم ہو؟'' میں نے شکور سے پوچھا۔

''میں دراب صاحب کا ملازم ہوں۔'' شکور نے بتایا۔ ''ان کی شہر میں بہت بڑی حویلی ہے۔''

میں نے شکور سے عباس اور دراب کے متعلق بہت سے سوال پوچھے۔ اس نے جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ تھا کہ دراب خاندانی امیر تھا اور ماں باپ کے مرنے کے بعد ان کی تمام جائیداد کا اکیلا وارث تھا۔ عباس درمیانے سے خاندان کا تھا اور دراب سے اس کی دوستی اتنی پکی تھی کہ وہ ایک دوسرے پر جان دیتے تھے۔

کچھ عرصہ پہلے شہر میں عباس کا لڑائی جھگڑا ہو گیا تھا جس میں عباس کے ہاتھوں مخالفوں کا ایک آدمی شدید زخمی ہو گیا تھا۔ وہ لوگ تھانے نہیں گئے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ وہ عباس کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ دراب نے عباس کو مشورہ دیا کہ وہ کچھ عرصے کے لیے کسی جگہ روپوش ہو جائے۔ جب معاملہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو وہ اسے اطلاع کر دے گا۔ اس مشورے کے بعد عباس اس گاؤں میں آ کر رہنے لگا تھا۔

میرے اس سوال کے جواب میں کہ اس لڑائی جھگڑے یا دشمنی کی وجہ کیا تھی، شکور نے بتایا کہ اسے پوری بات کا علم نہیں ہے لیکن اتنا ضرور پتہ ہے کہ جھگڑے کا باعث کوئی کامنی نامی کی لڑکی ہے۔ اس نے بتایا کہ کامنی عباس کے پیچھے گھر سے نکل آنے کو تیار تھی اور اس نے دراب سے رابطہ رکھا ہوا تھا۔ دراب عباس کو شکور کے ذریعے پیغام بھجواتا رہتا تھا۔ کبھی زبانی اور کبھی تحریری۔

"زبانی پیغام کیا ہوتے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی خطرہ ہے۔" شکور نے کہا۔ "دشمن تمہاری تلاش میں ہیں، کامنی پر سختی کر دی گئی ہے، اور آخری پیغام یہ تھا کہ پنچھی اُڑنے کو تیار ہے وہ بھی تیار رہے۔"

میں نے شکور کی باتوں پر غور کیا تو اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ کامنی گھر سے بھاگ کر عباس کے پاس پہنچ گئی تھی مگر اس کے دشمنوں کو اس کا علم ہو گیا اور انہوں نے تعاقب کر کے موقعہ پر عباس کو قتل کر ڈالا اور کامنی کو اٹھا کر لے گئے۔ "پنچھی اُڑنے کو تیار ہے۔" کا مطلب یہی نکلتا تھا کہ کامنی گھر سے نکلنے کے لیے تیار ہے۔

یہ اندازہ میں نے اس وجہ سے لگایا تھا کہ جہاں عباس قتل ہوا تھا، وہاں عورت کی موجودگی ثابت ہوتی تھی اور زنانہ جوتی کے کھرے بھی پائے گئے تھے۔ میں نے شکور سے پوچھا کہ کیا اسے معلوم ہے کہ کامنی عباس تک پہنچ گئی تھی۔

"کامنی عباس کے پاس پہنچ گئی تھی۔" شکور نے کہا۔ "اسے میں نے دراب صاحب کے کہنے پر خود عباس تک پہنچایا تھا۔"

"تم نے کامنی کو کس جگہ پہنچایا تھا؟" میں نے پوچھا۔ "اور یہ کس تاریخ کی بات ہے؟"

شکور نے ذرا سا ذہن پر زور دیا اور انگلیوں پر دن گننے لگا پھر اس نے وہ تاریخ بتائی جس دن اس نے کامنی کو عباس تک پہنچایا تھا۔ پھر اس نے گاؤں سے باہر وہی جگہ بتائی جہاں عباس قتل ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ جگہ اس نے اور عباس نے پہلے سے مقرر کر لی تھی۔ یہاں سے عباس نے کامنی کو لے کر کسی اور شہر نکل جانا تھا۔

میں نے شکور کی بتائی ہوئی تاریخ پر غور کیا تو یہ وہی تاریخ بنتی تھی جب عباس قتل ہوا تھا۔ اس طرح میں واقعات کی کڑیاں ملاتا گیا۔

میں نے شکور سے اور بھی بہت سی باتیں پوچھیں۔ وہ میرے سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ بعض جگہ پر مجھے شک ہوا کہ وہ کچھ چھپا رہا ہے مگر میں نے اسے زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا۔

میں نے اسی وقت اسے ساتھ لے کر دراب سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔

نوابی شوق

میں نے ایک کانسٹیبل کو ساتھ لے لیا اور شکور کو ساتھ لے کر شہر کی طرف چل پڑا۔ ان دنوں تھانوں کی اپنی ٹرانسپورٹ نہیں ہوتی تھی۔ اگر تھی تو سائیکلوں کی صورت میں۔ میں نے ایک تانگے کا بندوبست کر لیا تھا۔ ہم بسوں کے اڈے تک پہنچے اور وہاں سے شہر جانے والی بس پر سوار ہو گئے۔

دراب کے ملازم شکور کی راہنمائی میں ہم شہر کے ایک صاف ستھرے علاقے میں پہنچ گئے۔ یہاں زیادہ تر امیر لوگ رہتے تھے۔ آخر شکور ایک عالی شان حویلی کے سامنے جا کر رک گیا اور بتایا کہ یہ دراب صاحب کی حویلی ہے۔ اس نے ہمیں انتظار کرنے کہا اور خود اندر اطلاع کرنے چلا گیا۔ اس نے واپسی میں زیادہ دیر نہیں لگائی اور ہمیں حویلی کے اندر لے گیا۔ اس نے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا اور مشروب سے ہماری تواضع کی۔ اس دوران میں وہاں سجی ہوئی قیمتی آرائشی چیزوں کا جائزہ لیتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ڈرائنگ روم کے اندرونی دروازے کا پردہ ہلا اور ایک خوش پوش پختہ عمر آدمی اندر داخل ہوا۔ اس نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور میرے قریب ہی بیٹھ گیا یہ دراب تھا۔

"ابھی شکور نے عباس کے متعلق بتایا ہے۔" دراب نے گفتگو میں پہل کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین نہیں آیا...... کیا یہ سچ ہے کہ عباس قتل ہو چکا ہے؟"

"ہاں، یہ سچ ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو آپ کے دوست کے قتل کی خبر دے رہا ہوں...... میں اسی قتل کی تفتیش کے سلسلے میں آیا ہوں۔"

اس کے اتنے اچھے چہرے کے تاثرات میری بات سن کر بگڑ گئے اور وہ اضطراری حالت میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ وہ کبھی اپنی مٹھیاں بھینچتا اور کبھی ایک ہاتھ کا مکہ دوسرے ہاتھ پر مارتا۔ ساتھ ساتھ وہ کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا۔ میں نے اپنی سماعت کی پوری قوت اس کی بڑبڑاہٹ سننے پر مرکوز کر دی۔ مجھے پوری بات تو نہ سنی گئی مگر ایک لفظ صاف سمجھ میں آ گیا۔ یہ لفظ تھا "جیکب" یہ عیسائیوں والا نام تھا اور یہ نام سنتے ہی میرے ذہن میں موقعۂ واردات پر ملنے والی صلیب آ گئی۔ میں سمجھ گیا کہ میرے اصل ملزم کا نام جیکب ہے اور اطمینان بخش بات یہ تھی کہ دراب جیکب کو جانتا تھا۔

"یہ جیکب کون ہے؟" میں نے دراب سے پوچھا۔

دراب نے چونک کر میری طرف دیکھا اور ٹہلتے ٹہلتے رک گیا۔

"مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہے۔" دراب نے کہا۔ "کہ عباس کو جیکب نے قتل کیا ہے۔"

"جیکب کون ہے؟" میں نے دراب سے پوچھا۔ "اور اس نے عباس کو کیوں قتل کیا ہے؟"

"میں آپ کو تفصیل سے بتاتا ہوں۔" دراب نے کہا۔ "اس طرح آپ سارا معاملہ سمجھ جائیں گے۔"

اس کے بعد دراب نے مجھے بڑی لمبی بات سنائی۔ درمیان میں، میں اس سے اپنی ضرورت کے مطابق سوال بھی پوچھتا گیا۔ اس طرح جو بات سامنے آئی وہ میں آپ کو اپنے الفاظ میں سنا دیتا ہوں۔

دراب کے آباؤ اجداد نوابوں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ پھر نوابی تو ختم ہو گئی مگر اس خاندان کے لوگوں کے دماغ سے نوابوں والی عادتیں نہ گئیں۔ انہوں نے اپنے طور طریقے نوابی ہی رکھے۔ دراب نے بھی اسی ماحول میں آنکھ کھولی تھی اور پلا بڑھا تھا۔ اس لیے اس میں بھی نوابوں والی عادات پائی جاتی تھیں۔ ان عادتوں میں ایک گانا سننے کا شوق بھی تھا۔ وہ اکثر گانا سننے طوائفوں کے ہاں جایا کرتا تھا۔

عباس سے اس کی دوستی سکول کے زمانے سے تھی۔ یہ دوستی اس عمر میں آنے تک قائم رہی تھی۔ عباس درمیانے طبقے سے تعلق رکھتا تھا اور بڑا لائق اور ذہین طالب علم تھا۔ جبکہ دراب پڑھنے سکھنے میں بس واجبی سا ہی تھا اور اکثر عباس سے مدد لیا کرتا تھا۔ یہی وجہ ان دونوں کے درمیان دوستی کا باعث بن گئی تھی۔ دراب عباس کی مالی مدد بھی کرتا رہتا تھا اور ہر مشکل وقت میں اس کا ساتھ دیتا تھا۔ اس کے جواب میں عباس بھی ہر وقت دراب پر جان چھڑکنے کے لیے تیار رہتا تھا۔

دراب اکثر گانا سننے طوائفوں کے ہاں جایا کرتا تھا۔ اس کا یہ شوق صرف گانا سننے کی حد تک ہی تھا۔ وہ بدکاری کا قائل نہیں تھا نہ ہی اس کی نفیس طبیعت اس بات کی اجازت دیتی تھی۔ وہ عباس کو بھی اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ وہ ایک دو غزلیں یا گانے سن کر آ جاتے تھے۔ وہاں کی تقریباً تمام گانے والیاں دراب کو جانتی تھیں اور اس کی بڑی آؤ بھگت کرتی تھیں۔

کامنی کا کوٹھا

انہی دنوں پتہ لگا کہ بازار میں ایک نئی گانے والی انبالے سے آئی ہے اور آتے ہی دھوم

مچا دی ہے۔ اس کے متعلق سنا گیا کہ جتنی وہ خوبصورت ہے۔ اس سے کہیں زیادہ اس کی آواز رسیلی ہے۔ یہ مغنیہ کامنی بائی انبالے والی کے نام سے مشہور تھی۔ اس سے پہلے اس کی ماں نے اپنی جوانی میں بڑا نام کمایا تھا۔

یہاں میں یہ وضاحت کر دوں کہ اس قسم کی طوائفیں صرف گانے بجانے کا کام کرتی تھیں، جسم فروشی کا دھندا نہیں تھا۔ اس کے باوجود چند عیاش قسم کے لوگ ان گانے والیوں پر عاشق ہو جاتے تھے۔ ان عاشقوں کو یہ گانے والیاں خواب اُلو بناتی اور پیسے بٹورتی ہیں۔

طوائفوں اور ناچنے گانے والیوں کی اپنی ایک الگ دنیا ہوتی ہے۔ ان کے طور طریقے دنیا سے نرالے، ان کی چاہت، ان کی دوستی دشمنی کا تصور بھی کچھ اور ہوتا ہے۔ یہ اپنے جسم اور ناز و انداز کا کاروبار کرتی ہیں۔ ان کو سچی محبت صرف پیسے سے ہوتی ہے۔ پولیس والے اس دنیا کے باسیوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔

دراب کامنی کی شہرت سن کر عباس کو ساتھ لے کر کامنی کے کوٹھے پر گانا سننے چلا گیا۔ انہوں نے کامنی سے ایک گیت اور دو غزلیں سنیں۔ جتنی انہوں نے کامنی کی تعریف سنی تھی، اس سے بڑھ کر پایا۔ اس کی آواز میں ایسا لوچ اور گداز تھا کہ سننے والا مسحور ہو جاتا۔

دراب اور عباس کامنی کے کوٹھے سے نکلے تو دراب نے محسوس کیا کہ عباس کچھ کھویا کھویا سا ہے۔ دراب کی ہر بات کا جواب وہ بس ہوں ہاں میں دیتا تھا۔ اس دن کے بعد سے عباس کی خواہش یہی ہوتی تھی کہ گانا سننے کامنی کے کوٹھے پر ہی جایا جائے۔ دراب نے محسوس کیا کہ عباس کامنی میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے لگا ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کو بھول کر کامنی میں کھو جاتا۔

دراب نے عباس کو سمجھایا کہ وہ یہاں عشق و محبت کا کھیل شروع نہ کر دے۔ یہ لوگ ایسے جذبات کو نہیں مانتے مگر عباس نے یہ کہہ کر اسے حیران کر دیا کہ یہ اس کے دل کا معاملہ ہے اور اس کا دل اس کے بس میں نہیں۔ اگر وہ اس کی کوئی مدد کر سکتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دے۔

عباس کوئی ایسا گیا گزرا آدمی نہیں تھا۔ وہ جوان اور وجیہہ تھا۔ کسی لڑکی کے لیے اسے نظر انداز کرنا مشکل تھا۔ ایک دن موقع پا کر اس نے کامنی سے اظہارِ عشق کر دیا۔ کامنی نے بتایا کہ وہ پہلے ہی اس کی نظروں اور حرکتوں سے سمجھ چکی تھی لیکن اس کا خیال تھا کہ عباس محض اس کے جسم کا طلبگار ہے۔ عباس نے اسے بڑی مشکل سے یقین دلایا کہ وہ دل و جان سے اسے

چاہنے لگا ہے اور اس کی چاہت میں کچھ بھی کر سکتا ہے۔

کامنی کو یہ جوان پسند آیا تھا اور بعد میں اس نے عباس کو بتایا کہ وہ دل ہی دل میں اسے پسند کرتی تھی لیکن وہ جس دنیا میں رہتی ہے وہاں ایسی باتوں کی گنجائش نہیں ہوتی۔ بہرحال آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی تھی۔ عباس کامنی سے ملنے کے لیے روزانہ اس کے ہاں پہنچ جاتا اور موقع پا کر دل کی بات کر لیتا۔ دوسری طرف کامنی نے یہ دلیری دکھائی کہ کسی نہ کسی بہانے نکل آتی اور عباس سے ملتی۔

جسم بیچنے والیوں اور ناچنے گانے والیوں کے ہاں ہر قسم کے لوگ آتے ہیں۔ انہیں صرف پیسے سے غرض ہوتی ہے۔ ایک دن جب عباس، دراب کے ساتھ کامنی کا گانا سننے گیا تو وہاں چند اور نوجوان بھی آ گئے۔ وہ شکلوں سے ہی لفنگے نظر آ رہے تھے اور ان کا انداز لوفروں جیسا تھا۔ وہ کامنی کی طرف ایسی نظروں دیکھ رہے تھے جیسے نظروں سے ہی کھا جائیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ فحش قسم کے اشارے کر رہے تھے۔

ان کی حرکتیں دیکھ کر عباس کا خون کھولنے لگا۔ ممکن تھا کہ وہ ان سے اُلجھ جاتا، دراب نے بڑی مشکل سے اسے روکا۔ پھر آئے دن یہی کچھ ہونے لگا۔ یہ تین نوجوان تھے جن میں سے ایک ان کا لیڈر لگتا تھا۔ اسے وہ جیکب کے نام سے مخاطب کرتے تھے۔ جیکب کے چہرے پر بائیں گال پر زخم کا نشان تھا جو کسی لڑائی بھڑائی کی یادگار ہوگا۔ وہ شکل سے ہی خطرناک لگتا تھا۔ کامنی کو تنگ کرنے میں وہ پیش پیش ہوتا۔

ایک دن جیکب نے حد ہی کر دی۔ گانے سے فارغ ہونے کے بعد جب کامنی اٹھ کر جانے لگی تو جیکب نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا اور اپنی طرف گھسیٹنے لگا۔ کامنی نے بازو چھڑانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ عباس سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ تلملا کر اٹھا اور جیکب کا گریبان پکڑ کر زور دار جھٹکا دیا۔ جیکب نے کامنی کا بازو چھوڑ دیا اور عباس سے لپٹ گیا۔ دونوں میں ہاتھا پائی ہونے لگی۔

قریب بیٹھے سازندوں نے اور دراب نے آگے بڑھ کر بیچ بچاؤ کرایا۔ جیکب کے ساتھی بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور ان کے تیور خطرناک نظر آ رہے تھے۔ کامنی کی ماں شیلا بائی بھی درمیان میں آ گئی۔ معاملہ ٹھنڈا کرنے لگی۔

''اگر اب اسے ہاتھ لگایا تو ہاتھ توڑ دوں گا۔'' عباس نے غصے سے جلتے ہوئے کہا۔

''کیوں، یہ رنڈی تمہاری ماں لگتی ہے؟'' جیکب نے کہا۔

جیکب کی بات نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا اور عباس اس پر جھپٹ پڑا۔ اچھی خاصی دھینگا مشتی ہونے لگی۔ بڑی مشکل سے عباس کو جیکب سے الگ کیا گیا۔

''میری بیٹی رنڈی نہیں ہے۔'' شیلا بائی نے جیکب سے کہا۔ ''تم نے اس میں کون سی بات رنڈیوں والی دیکھی ہے۔ یہ صرف گاتی ہے، جسم نہیں بیچتی۔''

دراب اور عباس نے شیلا بائی سے کہا کہ وہ جیکب اور اس کے دوستوں کو یہاں آنے سے منع کر دے تا کہ آئندہ ایسا واقعہ نہ ہو۔ شیلا بائی پکی کاروباری ذہنیت رکھتی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ کسی بھی گاہک کو ناراض کر کے اپنا کاروبار خراب نہیں کر سکتی۔

یہ عباس اور جیکب کی دشمنی کا نقطۂ آغاز تھا۔

وہ انمول تھی

اس دن جیکب عباس کو دھمکیاں دیتا ہوا چلا گیا کہ وہ اس سے نمٹ لے گا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ کھوکھلا آدمی نہیں اور نہ ہی کھوکھلی دھمکیاں دے رہا ہے۔ دراب نے عباس کو خبردار کر دیا کہ وہ جیکب سے بچ کر رہے اور کہیں آتے جاتے محتاط رہے۔

یہاں سے میں نے دراب کو روک کر اس سے پوچھا کہ کیا وہ بتا سکتا ہے کہ اس نے جیکب گلے میں صلیب دیکھی ہو۔ اس کے جواب میں دراب نے بتایا کہ جیکب گلے میں ہر وقت ایک لکڑی کی صلیب پہنے رکھتا تھا اور اسے قمیص کے اندر رکھنے کی بجائے باہر رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دراب کو یہ صلیب یاد رہ گئی تھی۔

دراب کے جواب سے ثابت ہوا کہ جائے واردات پر ملنے والی صلیب جیکب کی ہے اور وہی میرا اصل مجرم ہے۔ اب میں پھر عباس اور کامنی کے قصے کی طرف آ جاتا ہوں۔

عباس کامنی کو مجبور کرنے لگا کہ وہ گناہوں کی اس دنیا سے نکل آئے اور وہ کسی اور شہر میں جا کر شادی کر لیں گے۔ کامنی اسے ٹالتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس کی ماں سے بات کر کے دیکھے۔ اگر وہ نہ مانی تو پھر وہ عباس کے ساتھ نکل جائے گی۔

عباس کا سب سے بڑا سہارا دراب ہی تھا۔ اس نے سارا معاملہ اس کے آگے رکھا اور کہا وہ کہ کامنی کی ماں سے بات کرے۔ دراب نے عباس کو سمجھایا کہ یہ ناممکن سی بات ہے، وہ کسی قیمت پر راضی نہیں ہوگی۔ کامنی اس کے لیے سونے کے انڈے دینے والی مرغی ہے اور وہ کبھی اس سے دستبردار نہیں ہوگی۔

اس کے باوجود عباس کی ضد سے مجبور ہو کر دراب نے شیلا بائی سے بات کی اور اسے بتایا کہ کامنی اور عباس ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور وہ شادی کرنا چاہتے ہیں۔ بہتر ہے ان کی شادی کر دی جائے۔ یہ سن کر شیلا بائی ہتھے سے اکھڑ گئی اور اس نے صاف انکار کر دیا۔

''وہ میرے بڑھاپے کا سہارا ہے۔'' شیلا نے دراب سے کہا۔ ''ایسی کماؤ بیٹی کسی قسمت والی کو نصیب ہوتی ہے۔ ہماری دنیا میں جذبات کی زبان کوئی نہیں سمجھتا، یہاں صرف سکہ رائج الوقت چلتا ہے۔ بہتر ہوگا عباس سے کہو کہ وہ کامنی کا خیال دل سے نکال دے۔ وہ یہاں گاہک بن کر آ سکتا ہے، عاشق بن کر نہیں۔''

دراب نے شیلا کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہ مانی۔ دراب نے اسے روپے پیسے کی پیشکش بھی کی لیکن شیلا نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ کامنی انمول ہیرا ہے اور وہ اسے کسی قیمت پر نہیں بیچے گی۔

دراب نے یہ سب کچھ عباس کو بتا دیا۔ عباس نے یہ باتیں کامنی کو بتائیں۔ کامنی نے بتایا کہ اس نے یہ ساری باتیں اپنے کانوں سے سنی تھیں۔ پھر اس کے آنسو نکل آئے اور اس نے کہا کہ اسے اپنی ماں کی یہ بات سن کر بڑا رنج ہوا ہے کہ اس نے اسے پیسہ کمانے کی مشین سمجھا ہے اور اس کے جذبات کا خیال نہیں رکھا بلکہ اسے اپنا بڑھاپا آرام سے گزارنے کی فکر ہے۔

اس کے بعد عباس اور کامنی بھاگ جانے کے منصوبے بنانے لگے۔ عباس نے کامنی سے کہا کہ وہ دراب سے مشورہ کر کے اسے دن اور وقت بتا دے گا۔ پھر وہ اس شہر سے نکل جائیں گے۔ کامنی نے کہا کہ وہ ہر وقت اس کے ساتھ نکل جانے کو تیار ہے۔

پنچھی اُڑ گیا

اس سے اگلے ہی دن ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے عباس کو شہر سے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔ ہوا یوں کو رات کے وقت حسب معمول عباس کامنی کے کوٹھے سے باہر نکلا۔ اس دن دراب اس کے ساتھ نہیں تھا۔ دراب ہفتے میں دو دن گانا سننے آتا تھا مگر جب سے عباس کامنی کا دیوانہ ہوا تھا۔ دراب ہفتے میں تین دن بھی آ جاتا تھا۔ مگر عباس کا یہ روز کا معمول تھا۔ وہ صرف کامنی کا دیدار کرنے کے لیے وہاں جاتا تھا۔

وہ جونہی ذرا آگے گیا، جیکب اور اس کے ایک ساتھی نے اسے روک لیا اور اس پر حملہ کر دیا۔ وہ دو تھے اور عباس اکیلا۔ وہ دونوں مل کر عباس کو مارنے لگے۔ عباس ان دنوں اپنی حفاظت کے خیال سے ایک لمبے پھل والا چاقو اپنے پاس رکھتا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ جیکب اور اس کے ساتھی اسے نہیں چھوڑیں گے تو اس نے چاقو نکال لیا۔ جیکب کا ساتھی اس کی زد میں آ گیا اور عباس نے اس کے پیٹ میں چاقو اتار دیا۔ چاقو دیکھ کر اور اپنے ساتھی کا بہتا خون دیکھ کر جیکب وہاں سے بھاگ نکلا۔

بہت سے لوگ لڑائی دیکھ کر اکٹھے ہو گئے تھے۔ یہ لڑائی ان کے لیے عجوبہ نہیں تھی اور نہ وہ اس سے خوف زدہ تھے۔ یہاں آئے دن ایسے واقعات ہوتے رہتے تھے۔ گناہ کے اس بازار میں ایک تماشبین نے دوسرے کا پیٹ پھاڑ دیا تھا۔ یہ خون خرابہ سنسنی خیز تو تھا مگر حیرت انگیز نہیں تھا۔

یہاں میں کہانی سے ہٹ کر اپنی رائے پیش کر دوں۔ گناہ کے بازاروں میں آنے والے لوگ تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جوان کے ہاں جاتے ہیں اور گناہ کر کے واپس آ جاتے ہیں۔ دوسری قسم کے لوگ دولت مند اور عیاش ہوتے ہیں۔ یہ جانتے بھی ہیں کہ بازار میں بیٹھی ہوئی عورت پیشہ ور ہے اور صرف پیسے کی یار ہے کسی انسان کی نہیں۔ اس کے باوجود یہ اُلو کے پٹھے انہیں اپنا سمجھتے ہیں اور آنکھوں دیکھی مکھی نگلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان کے ہاں جانے والی تیسری قسم جرائم پیشہ لوگوں کی ہے۔ ان میں نامی گرامی غنڈے، استاد اور بدمعاش ہوتے ہیں۔ ان سب نے کسی نہ کسی بازاری عورت کو اپنی محبوبہ کا درجہ دے رکھا ہوتا ہے اور یہ لوگ عام عاشقوں کی طرح جذبۂ رقابت کا شکار بھی ہوتے ہیں۔ اس رقابت میں یہ چاقوؤں، خنجروں اور دوسرے اسلحہ کا استعمال آزادی سے کرتے ہیں۔

اس تجزیے کے حساب سے دیکھا جائے تو یہ سب لوگ ابنارمل ذہنیت کے ہوتے ہیں۔

عباس نے ایک بندے کے پیٹ میں چاقو اتار دیا تو تب اسے احساس ہوا کہ وہ کیا کر بیٹھا ہے۔ اس نے وہاں سے کھسک جانے میں ہی عافیت جانی۔ زخمی اپنا پیٹ پکڑے تڑپ رہا تھا۔ چند آدمی اسے سنبھالنے لگے۔ عباس نے موقع غنیمت جانا اور خون آلود چاقو لہراتا ہوا وہاں سے نکل آیا۔ کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

عباس سیدھا دراب کی حویلی جا پہنچا اور اسے تمام صورت حال بتائی کہ وہ کیا کر آیا ہے۔ دراب نے کہا کہ اس کا حویلی میں رکنا مناسب نہیں۔ پولیس جلد ہی اس کا سراغ لگا کر حویلی

تک پہنچ جائے گی۔ بہتر ہوگا کہ وہ کہیں جا کر چھپ جائے۔ پھر دارب نے ہی اسے مشورہ دیا کہ وہ کسی دیہاتی علاقے میں جا کر رُوپوش ہو جائے۔

عباس نے کہا کہ وہ اسے ایک دو دن کے لیے یہیں کہیں چھپا لے اور کامنی کو اطلاع کر دے۔ پھر وہ کامنی کو لے کر کسی دور دراز شہر چلا جائے گا۔ مگر دراب نہ مانا اور اس نے کہا کہ فی الحال وہ اپنی جان بچائے۔ اگر زخمی مر گیا تو اسے پھانسی بھی ہو سکتی ہے۔ یہ سن کر عباس گھبرا گیا۔ دراب نے کہا کہ وہ اس دوران کامنی اور دراب دونوں سے رابطہ رکھے اور کوئی مناسب موقع دیکھ کر ان کے فرار کا انتظام کر دے گا یا کامنی کو وہاں سے نکال کر عباس تک پہنچا دے گا۔

صبح پو پھٹنے سے پہلے ابھی اندھیرا تھا، دراب نے اپنے ملازم شکور کو عباس کے ساتھ بھیجا کہ وہ عباس کا ٹھکانہ دیکھ آئے کہ وہ کہاں روپوش ہوتا ہے۔ عباس نے دراب کو بتایا تھا کہ ایک گاؤں (جہاں عباس قتل ہوا تھا) میں اس کا ایک پرانا دوست رہتا ہے وہ اس کے پاس جائے گا۔

گاؤں پہنچے تو عباس نے اپنے دوست کا پوچھا تو پتہ چلا کہ اس کا دوست چار پانچ پہلے یہ گاؤں چھوڑ کر جا چکا ہے۔ بہر حال عباس نے وہیں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا اور ملازم شکور نے جا کر دراب کو بتا دیا کہ وہ عباس کو کہاں چھوڑ آیا ہے۔

ادھر جیکب کا زخمی ساتھی بچ گیا تھا۔ چاقو کا زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ پولیس نے عباس کے خلاف اقدام قتل کا پرچہ درج کر لیا تھا اور تفتیش کرتی ہوئی دراب تک بھی پہنچی تھی۔ دراب کوئی معمولی آدمی نہیں تھا کہ خوفزدہ ہو جاتا اس نے پولیس والوں کو مطمئن کر دیا کہ عباس اس کا دوست ضرور ہے مگر اسے اس کی روپوشی کے متعلق کچھ علم نہیں۔

دوسری طرف دراب نے کامنی سے مل کر اس کو تسلی دی۔ کامنی بہت پریشان تھی۔ اس نے کامنی سے کہا کہ وہ تیار رہے جونہی خطرہ کم ہوگا وہ اس کو عباس کے پاس پہنچا دے گا جہاں سے وہ کسی اور طرف نکل جائیں گے۔ دراب اپنے ملازم شکور کو بھیج کر عباس کی خیر خیریت معلوم کرتا اور اسے کامنی کے خیریت سے آگاہ کرتا۔

اِدھر یہ چکر چل رہا تھا۔ دوسری طرف عباس کے گھر والے پریشان تھے۔ پولیس والے عباس کی تلاش میں ان سے پوچھ گچھ کرتے رہتے تھے۔ اس سے محلے میں ان کی بڑی بے عزتی ہوتی تھی۔ عباس کے باپ کو معلوم تھا کہ اس کے بیٹے کی دراب سے گہری دوستی ہے، وہ دراب سے ملا اور عباس کے متعلق پریشانی ظاہر کی۔ دراب نے عباس کے باپ کو تسلی دی کہ عباس محفوظ جگہ پر ہے اور وہ فکر نہ کریں۔

اس دوران دراب نے ایک دو مرتبہ جیکب کو اپنی حویلی کے پاس منڈلاتے دیکھا۔ پھر اس نے جیکب کو کامنی کے کوٹھے کے ارد گرد بھی دیکھا۔ وہ غالباً عباس سے انتقام لینے کی فکر میں تھا۔ ایک دن دراب کے ملازم شکور نے دراب کو بتایا کہ جیکب نے اسے بازار میں روک لیا تھا اور عباس کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ اس نے دھمکی بھی دی تھی کہ وہ عباس کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

دوسری طرف عباس نے شکور کے ذریعے پیغام بھجوایا کہ وہ سارا دن فارغ رہ رہ کر تنگ آ گیا ہے۔ دراب نے دوستی کی خاطر اسے کچھ سامان اور پیسے بھجوائے کہ وہ وقت گزاری کے لیے گاؤں میں چھوٹی سی دکان کر لے۔ پھر عباس نے گاؤں میں دکان کھول لی۔

اس دوران جب عباس کی تلاش کا معاملہ کچھ ٹھنڈا پڑ گیا تو دراب نے کامنی کو بتا دیا کہ وہ فلاں دن نکل کر اس کی حویلی میں آ جائے۔ دوسری طرف اس نے عباس کو پیغام بھجوایا کہ فلاں دن رات کو کامنی اس تک پہنچ جائے گی۔ عباس نے شکور کو گاؤں سے باہر وہ جگہ دکھا دی جہاں اس نے کامنی کا انتظار کرنا تھا۔

ادھر دراب نے کامنی کو نکالنے کا انتظام کر لیا تھا۔ کامنی مقررہ وقت پر نکل آئی تھی۔ وہ بغیر کسی رکاوٹ کے دراب کی حویلی پہنچ گئی۔ انہوں نے رات کو نکلنا تھا اور عباس کی بتائی ہوئی جگہ پہنچنا تھا۔ دراب کا ارادہ تھا کہ وہ خود کامنی کو لے کر عباس کے پاس جائے گا مگر پھر عین وقت پر اس نے خود جانے کا ارادہ بدل دیا اور کامنی کو شکور کے ساتھ بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ کامنی کی گمشدگی کے وقت حویلی میں رہنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کامنی کے ہاں گانا سننے بھی جائے گا تاکہ کوئی اس پر شک نہ کرے کہ کامنی کی گمشدگی میں اس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

پھر اس نے کامنی کو مسلمان عورتوں والا برقعہ پہنا کر شکور کے ساتھ بھیج دیا اور شکور کو ہدایت کی کہ وہ کامنی کو عباس کے حوالے کر کے انہی قدموں واپس آ جائے۔ شکور کامنی کو لے کر چلا گیا۔

شکور اور کامنی کے جانے کے ایک گھنٹہ بعد دراب شیلا بائی کے کوٹھے پر جا پہنچا۔ وہاں سب پریشان تھے۔ شیلا بائی کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ اس نے ہر طرف اپنے آدمی دوڑائے تھے مگر کامنی کا کہیں پتہ نہیں چل رہا تھا۔ یہ ان لوگوں کے دھندے کا ٹائم تھا اور گاہک آ آ کر واپس جا رہے تھے۔

دراب کو دیکھتے ہی شیلا بائی چونک گئی اور اس سے عباس کے متعلق پوچھنے لگی۔ اسے شک

تھا کہ اس کی بیٹی عباس کی محبت میں پھنس گئی تھی اور اب اسے عباس ہی بھگا لے گیا ہے۔ دراب نے اسے بتایا کہ عباس تو خود پولیس سے چھپتا پھر رہا ہے وہ کامنی کو کیسے لے جا سکتا ہے۔ پھر دراب نے اسے مشورہ دیا کہ وہ کچھ اور انتظار کر لے اگر کامنی پھر بھی نہ آئی تو وہ تھانے میں اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا دے۔ وہ خود اس کے ساتھ چلے گا۔

خاصی رات گزر گئی مگر کامنی کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ اس دوران دراب شیلا بائی کو تسلیاں دیتا رہا تھا۔ پھر وہ اس کے ساتھ تھانے چلا گیا اور انہوں نے کامنی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا دی۔ شک میں اس نے عباس کا اور ایک دوسری بائی کا نام لکھوایا جس کا کاروبار کامنی کی وجہ سے ٹھنڈا پڑ گیا تھا اور کئی بار ان کی آپس میں زبانی کلامی جھڑپیں ہو چکی تھیں۔

دراب تھانے میں رپورٹ درج کرانے کے بعد شیلا بائی کو اس کے کوٹھے پر چھوڑ کر اپنی حویلی آ گیا۔ جب وہاں سے آنے کے لیے نکلا تھا تو شیلا بائی ہچکیاں لے کر رو رہی تھی۔

دراب اپنی حویلی میں آیا تو ابھی شکور نہیں آیا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد شکور آ گیا۔ اس نے بتایا کہ سب کام تسلی بخش ہو گیا ہے اور وہ کامنی کو عباس کے حوالے کر آیا ہے۔ یہ سن کر دراب نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسے پتہ تھا کہ راتوں رات عباس کامنی کو لے کر کسی دور دراز شہر نکل جائے گا اور پھر وہاں سے رابطہ کرے گا۔

کامنی کہاں گئی؟

"عباس اور کامنی کو نکلے تقریباً مہینہ پورا ہونے کو ہے۔" دراب نے اتنی لمبی تفصیل مجھے سنانے کے بعد کہا۔ "میں پریشان تھا کہ عباس نے اب تک مجھ سے رابطہ کیوں نہیں کیا۔ اسی پریشانی کے عالم میں، میں نے شکور کو اس گاؤں بھیجا تھا کہ وہ معلوم کر کے آئے کہ عباس نے گاؤں کب چھوڑا یا اس کے ساتھ کوئی حادثہ تو نہیں پیش آ گیا ہے۔ اب آپ نے بتایا کہ عباس کو کسی نے قتل کر دیا تھا...... مجھے یقین ہے کہ یہ جیکب کا کام ہے۔"

"یقین تو مجھے بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جیکب کو کیسے پتہ لگا کہ اس کا رقیب فلاں گاؤں میں چھپا بیٹھا ہے اور پھر اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کامنی عباس کے ساتھ نکل رہی ہے۔ پھر اس نے عین موقع پر پہنچ کر عباس کو قتل کر دیا۔"

میری یہ بات سن کر دراب بھی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے کہا۔ "میں یہ سوچ رہا تھا کہ

کامنی کہاں گئی؟ کیونکہ وہ اپنی ماں کے پاس بھی نہیں پہنچی۔"

یہ سوال بھی اہم تھا کہ اگر عباس کو قتل کر دیا گیا تھا تو پھر کامنی کہاں گئی۔ مجھے کھوجی کے وہ الفاظ یاد آنے لگے جو اس نے عباس کے قتل کے وقت موقعۂ واردات پر کہے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ عورت اپنی مرضی سے نہیں چل رہی۔ اسے گھسیٹا جا رہا ہے۔ پھر ذرا آگے چل کر کھوجی نے بتایا کہ مرد نے لڑکی کو اٹھا لیا ہے۔

اس خیال کے آتے ہی میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ کامنی بھی جیکب کے پاس ہے۔ اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ میں جیکب کو گرفتار کر لوں۔ یہ چونکہ میرا علاقہ نہیں تھا۔ اس لیے قانونی طور پر میں نے اس علاقے کے تھانیدار سے ملنا تھا اور اس کی مدد سے جیکب کو گرفتار کرنا تھا۔ اس کے علاوہ ابھی عباس کے گھر والوں کو اطلاع دینی تھی کہ ان کا بیٹا قتل ہو گیا ہے۔ میں تصور کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا کہ یہ خبر سن کر عباس کے ماں باپ کا کیا حال ہو گا۔ مگر میں اپنی ڈیوٹی سے مجبور تھا اور یہ ناخوشگوار اطلاع دینا میرا فرض تھا۔ اس کے لیے میں نے دراب کو ساتھ لے کر جانا تھا۔

میں اس کیس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگا۔ پھر میرا ذہن اس بات پر اٹک گیا کہ آخر جیکب عباس تک کس طرح پہنچا۔ جیسا کہ دراب نے بتایا تھا کہ جیکب کو اس نے دو تین مرتبہ حویلی کے اردگرد منڈلاتے دیکھا ہے اور پھر شکور نے بھی بتایا تھا کہ جیکب نے اسے روک کر عباس کے متعلق پوچھا تھا اور عباس کو قتل کرنے کی دھمکی بھی دی تھی۔ اس سے مجھے یہ خیال آیا کہ جیکب یا اس کا کوئی ساتھی اور اب اور اس کے ملازم شکور کی نگرانی کرتا رہا ہے اور وہ لوگ اس کا پیچھا کرتے ہوئے عباس تک پہنچ گئے۔ پھر مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اگر وہ انتقام لینے کے لیے عباس کو تلاش کر رہے تھے تو انہوں نے فوری طور پر عباس پر حملہ کیوں نہ کیا۔ کیا انہیں معلوم تھا کہ کامنی کا عباس کے ساتھ بھاگنے کا پروگرام ہے اور وہ اسی موقع کا انتظار کر رہے تھے۔

گھر کا بھیدی

سوچ سوچ کر میرا دماغ چکرانے لگا۔ اسی دوران شکور میرے لیے کھانا لے کر آ گیا۔ میں خالی الذہن ہو کر کھانے کے برتنوں کو گھورنے لگا۔ شکور ٹرے میں سے ایک ایک برتن اٹھا کر میرے آگے میز پر رکھ رہا تھا۔ اچانک میں چونک اٹھا۔ میں نے غور کیا کہ شکور کے ہاتھ بڑے واضح انداز میں کانپ رہے تھے۔ اس کی عمر ہاتھ کانپنے والی نہیں تھی۔ وہ جواں عمر تھا۔ میں

نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے مجھ سے نظریں چرالیں۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے واضح آثار نظر آ رہے تھے۔

میں نے اس کی حالت پر غور کیا تو اچانک میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا اور مجھے روشنی دکھا گیا۔ مجھے خیال آیا کہ عباس کی مخبری کرنے والا شکور بھی تو ہوسکتا ہے۔ جیکب کو الہام تو نہیں ہوا تھا کہ فلاں دن، رات کو فلاں وقت کامنی عباس کے پاس جائے گی۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے شکور کو لپیٹ میں لینے کا فیصلہ کرلیا۔

میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ شکور کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کا جواب مجھے اپنے ذہن سے یہ ملا کہ پیسے کا لالچ یا جان کا خوف اسے اس کام پر مجبور کرسکتا تھا۔ جیکب جیسے غنڈے سے یہی اُمید تھی کہ اس نے یقیناً شکور کو جان سے مار دینے کی دھمکی دی ہوگی۔

شکور جلدی جلدی برتن رکھ کر کمرے سے نکلنے لگا تھا جب میں نے اسے آواز دے کر روک لیا۔

''جی سرکار؟'' اس نے واضح طور پر لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

میں نے اسے اپنے پاس آنے کو کہا تو وہ یوں میری طرف آیا جیسے بکرا قصائی کے پاس ذبح ہونے جا رہا ہو۔

''جیکب نے تمہیں کیا دھمکی دی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ مجھ سے عباس کے متعلق پوچھ رہا تھا۔'' شکور نے کہا۔ ''اور کہہ رہا تھا کہ تمہارے مالک دراب نے اس بھگوڑے کو چھپا رکھا ہے۔''

''اور کیا کہا تھا اس نے؟'' میں نے پوچھا۔

''اور جی.....'' شکور نے اٹکتے ہوئے کہا۔ ''اس نے کہا تھا کہ وہ عباس کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''ایک دھمکی اس نے تمہیں بھی تو دی تھی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''وہ بھی بتاؤ۔''

میں اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ اس کا رنگ ایک دم فق ہوگیا اور وہ مجھ سے نظریں چرانے لگا۔ میں نے اسے حوصلہ دیا کہ اسے کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں اور یہ کہ جیکب جیسے غنڈوں کو میں تھانے میں اُلٹا لٹکا دوں گا۔

''اس نے کہا تھا کہ وہ میری.....'' وہ کہتے کہتے رک گیا اور پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

پھر اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میری ایک جوان بہن ہے سرکار، جیکب ایک رات اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ میرے گھر آیا تھا اور اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اس کا ساتھ نہ دیا تو وہ میری جوان بہن کو...... مجھے معاف کردیں جی، میں مجبور ہوگیا تھا۔''

پھر وہ باقاعدہ رونے لگا۔ دراب بڑی حیرانی اور غصے کے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس سے کچھ اور باتیں پوچھیں۔ بات یہ نکلی کہ شکور اس دھمکی کے بعد جیکب کے ہاتھوں میں کھیلنے لگا تھا۔ اسی نے جیکب کو بتایا تھا عباس کہاں چھپا ہوا ہے اور کامنی اور وہ کسی دوسرے شہر بھاگنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ جیکب نے اس سے کہا تھا کہ جس دن کامنی عباس کے پاس پہنچے گی، وہ ان کو اطلاع کردے۔ شکور نے جیکب کو بتا دیا کہ فلاں دن فلاں وقت کامنی عباس کے پاس جائے گی۔

جس رات شکور کامنی کو عباس کے پاس پہنچانے کے لیے دراب کی حویلی سے نکلا، جیکب اپنے ایک ساتھی کے ساتھ اس کے تعاقب میں تھا۔ جب شکور کامنی کو لے کر درختوں میں گھری اس جگہ پہنچا تو عباس ان کا منتظر تھا۔ شکور نے کامنی کو عباس کے پاس چھوڑا اور انہی قدموں واپس پلٹ گیا۔ وہ سڑک کی طرف نکلا تو اس نے دیکھا کہ جیکب اور اس کا ساتھی وہاں کھڑے تھے اور قریب ہی ایک تانگہ کھڑا تھا۔ جیکب نے اس سے کہا وہ اب چلتا پھرتا نظر آئے۔ اگر اس نے زبان کھولی تو پھر وہ اس کی بہن کو اٹھا کر لے آئیں گے۔ شکور خوفزدہ ہوکر وہاں سے آگیا اور دراب کو بتایا کہ وہ امانت پہنچا آیا ہے۔ اس کے بعد وہاں کیا ہوا، اس کا شکور کو علم نہیں تھا۔

میں نے شکور کا سارا بیان لکھ کر اس کے دستخط کرالئے۔ پھر دراب کا بھی باقاعدہ بیان لیا۔ اب میں نے جیکب اور اس کے ساتھی کو گرفتار کرنا تھا اور اس کے لیے مجھے اس علاقے کے تھانیدار سے ملنا تھا۔ اس علاقے کا تھانیدار ایک سکھ تھا۔ اس کا نام نانک سنگھ تھا۔ میں اس کے پاس چلا گیا اور ساری صورتِ حال اس کے آگے رکھ دی۔ اس کیس سے اس کے تھانے کا تعلق بھی بنتا تھا کیونکہ کامنی کی گمشدگی کی رپورٹ نانک سنگھ کے تھانے میں درج تھی اور وہ اس کی بازیابی کے سلسلے میں خاصا پریشان تھا۔

میری تفتیش کے متعلق سن کر وہ بڑا خوش ہوا اور کہنے لگا کہ اس کا مسئلہ بھی حل ہوگیا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں جیکب اور اس کے ساتھی کو گرفتار کرنا چاہتا ہوں اس سلسلے میں وہ میری

مدد کرے۔اس کے جواب میں اس نے جیکب کو تین چار ننگی گالیاں دیں اور کہا کہ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

ہر تھانے میں علاقے کے جرائم پیشہ افراد کی مکمل تفصیل ہوتی ہے۔ نانک کے تھانے میں جیکب کا ریکارڈ بھی موجود تھا۔اس سے پہلے وہ چوری چکاری، غنڈہ گردی اور لڑائی جھگڑے کے کیسوں میں تھانے آچکا تھا اور نانک سنگھ اسے جانتا تھا۔اس نے اسی وقت ایک چھاپہ مار پارٹی تیار کی اور مجھے ساتھ لے کر چل پڑا۔

ہم لوگ ایک ایسے علاقے میں جا پہنچے جسے لوئر کلاس سے بھی نچلے درجے کے لوگوں کا علاقہ کہا جا سکتا تھا۔ ہر طرف غربت کے آثار نظر آرہے تھے۔ تنگ اور گندی گلیوں میں چکراتے ہوئے ایک چھوٹے سے مکان کے دروازے پر جا کر نانک سنگھ رک گیا۔ یہی جیکب کا گھر تھا۔

دروازہ کھٹکھٹانے پر ایک آدمی نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور پھر پولیس کو دیکھتے ہی دروازہ بند کرنے کی کوشش کی لیکن نانک سنگھ اس سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا اور اس نے ایک زوردار ٹھوکر دروازے پر ماری۔ یہ ٹھوکر اتنی زوردار تھی کہ وہ آدمی دروازے کے دھکے سے پیچھے کو گر پڑا۔فوراً کانسٹیبلوں نے آگے بڑھ کر اس آدمی کو قابو کر لیا۔ہم سب بڑی تیزی سے اندر داخل ہوئے۔میں نے اور نانک سنگھ نے اپنے پستول نکال لئے تھے۔

دروازے سے آگے چھوٹا سا صحن تھا۔اس کے بعد برآمدہ اور دو کمرے تھے۔ایک کمرہ بڑا تھا اور دوسرا چھوٹا۔ چھوٹے کمرے کو تالا لگا ہوا تھا اور بڑے کمرے میں چار نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔کمرہ سگریٹوں کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا اور اس کی بدبو سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ یہ چرس کی بدبو ہے۔پاس گھٹیا قسم کی دیسی شراب کی دو بوتلیں بھی رکھی تھیں۔

ہمیں دیکھ کر سب ہڑبڑا کر اٹھے۔ایک نوجوان کے پاؤں کی ٹھوکر سے شراب کی بوتل گر گئی اور شراب بہہ کر فرش پر پھیل گئی۔ میں نے جیکب کو دیکھا ہوا نہیں تھا۔اس لیے اندازہ نہ لگا سکا کہ ان میں جیکب کون ہے۔

''جیکب کہاں ہے؟'' نانک سنگھ نے کڑک دار آواز میں پوچھا۔

تب مجھے معلوم ہوا کہ ان میں سے کوئی بھی جیکب نہیں۔ایک نوجوان نے نشے سے لڑکھڑاتی آواز میں بتایا کہ جیکب آج کل اونچی ہواؤں اُڑ رہا ہے اور کافی دن سے یہاں نہیں آیا۔پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ ہمیں جمعہ خان کی سرائے میں ملے گا اس کی آج کل جمعہ خان

سے بڑی یاری ہے۔میرے پوچھنے پر نانک سنگھ نے بتایا کہ جمعہ خان کی سرائے بسوں کے اڈے کے قریب ہے اور وہاں کوئی شریف آدمی نہیں جاتا۔زیادہ تر جرائم پیشہ لوگ یا پھر ایسے ڈرائیور جو نشہ کرتے تھے، وہاں پائے جاتے تھے۔

کامنی مل گئی

وہاں سے ہم فوراً جمعہ خان کی سرائے کی طرف چل پڑے۔راستے میں نانک سنگھ نے بتایا کہ جمعہ خان پٹھان ہے اور ہر قسم کے جائز ناجائز کام کرتا ہے۔ پھر اس نے بائیں آنکھ دبا کر کہا کہ وہ پولیس کو باقاعدہ حصہ دیتا ہے اور ہر خدمت کے لیے تیار رہتا ہے۔

ہم سرائے پہنچے تو باوردی پولیس والوں اور دو تھانیداروں کو دیکھ کر وہاں موجود لوگ سراسیمہ ہو گئے۔نانک سنگھ کی معیت میں ہم لوگ ایک کمرے کے سامنے پہنچ گئے۔اس کے باہر لکھا ہوا تھا بغیر اجازت اندر آنا منع ہے۔نانک سنگھ سکھ تھا اور اس نے سکھوں والا کام ہی کیا۔ ایک زوردار لات دروازے کو ماری۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا اس لیے دونوں پٹ کھل گئے۔میں اور نانک اندر داخل ہو گئے۔ایک بڑی میز کے پیچھے بڑا صحت مند سرخ و سفید پٹھان بیٹھا تھا۔اس نے بڑا قیمتی لباس پہن رکھا تھا۔اس کے سامنے والی کرسی پر ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا وہ شکل سے ہی چھٹا ہوا بدمعاش نظر آرہا تھا۔اس کے گال پر چاقو کے زخم کا نشان صاف نظر آرہا تھا۔اس کا سانولا رنگ اور حلیہ دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ یہ جیکب ہو سکتا ہے۔ہمیں دیکھ کر جیکب کے چہرے پر خوف کا تاثر پیدا ہو گیا۔

''بڑے غصے میں لگ رہے ہیں سردار جی!'' پٹھان نے مسکرا کر کہا۔''خان کو حکم دیتے۔ وہ خود حاضر ہو جاتا۔ہم تو آپ کے دوست ہیں۔''

''ہم سے بالا ہی بالا کام کرتے ہو۔'' نانک سنگھ نے طنزیہ انداز میں کہا۔''اور دوستی کا دعویٰ بھی کرتے ہو۔ایسی حرکتوں سے دوستی دشمنی میں بدل سکتی ہے۔''

''کیا قصور ہو گیا ہے سردار جی!'' جمعہ خان نے عاجزی سے کہا۔

''جیکب تو مل گیا۔'' نانک نے نوجوان کے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر اس کے بال مٹھی میں جکڑ لئے اور جمعہ خان سے کہا۔''لڑکی کہاں ہے؟''

''کون لڑکی حضور؟'' جمعہ خان نے حیران ہو کر کہا۔

جمعہ خان پرانا کھلاڑی تھا اور اتنی آسانی سے ماننے والا نہیں تھا لیکن اس کی مجبوری یہ تھی

کہ اس کی دکھتی رگیں نانک سنگھ کے ہاتھ میں تھیں۔

نانک سنگھ نے ایک کانسٹیبل کو اندر بلا کر کہا کہ وہ جیکب کو ہتھکڑی لگا لے۔ جیکب کو ہتھکڑی لگ چکی تو نانک نے کہا کہ وہ ویسے ہی یہاں نہیں آ گیا اس کے پاس مکمل ثبوت ہیں۔ پھر اس نے کانسٹیبل سے کہا کہ وہ جیکب کو کمرے سے باہر لے جائے۔ کانسٹیبل اسے باہر لے گیا تو نانک نے جمعہ خان سے کہا اگر وہ اس کے علاقے میں اپنا یہ دھندا جاری رکھنا چاہتا ہے تو لڑکی کو برآمد کرا دے ورنہ وہ لڑکی کو خود برآمد کرے گا تو پھر کوئی لحاظ نہیں کرے گا اور اس کی سرائے کو سیل کر کے اسے باقاعدہ گرفتار کر لے گا۔

"اب ہماری دوستی کی یہی صورت ہے۔" نانک سنگھ نے کہا۔ "لڑکی دے دو تو میں تمہارا نام نہیں آنے دوں گا، ورنہ پھر وہی کروں گا جو قانون کے مطابق ہو گا۔"

اس دوران میں خاموش تماشائی بنا رہا۔ میرا اندازہ تھا کہ جمعہ خان کسی بھی صورت میں علاقہ تھانیدار سے دشمنی مول نہیں لے سکتا اور پھر یہی ہوا۔ جمعہ خان اٹھا اور ہم دونوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ سرائے کے پچھلے حصے میں کچھ الگ کمرے بنے ہوئے تھے۔ جمعہ خان نے ایک کمرے کے باہر لگا ہوا تالا کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ میں اور نانک بھی اس کے ساتھ اندر چلے گئے۔ اس کمرے کے اندر ایک اور دروازہ نظر آ رہا تھا۔ اسے تالا نہیں لگا تھا بلکہ باہر سے صرف کنڈی لگی ہوئی تھی۔ جمعہ خان نے کنڈی کھولی۔ کمرے میں اندھیرا نہیں تھا، لائٹ جل رہی تھی۔

ایک کونے میں پڑے پلنگ پر ایک انتہائی حسین و جمیل لڑکی سہمی بیٹھی تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور وہ اُجڑی اُجڑی نظر آ رہی تھی۔ اس کے باوجود بڑی پُرکشش لگ رہی تھی۔ دو باوردی تھانیداروں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر رونق آ گئی۔

"جاؤ کامنی، یہ تمہیں لینے آئے ہیں۔" جمعہ خان نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

کامنی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور ہمارے پاس آ گئی۔ اسے لے کر ہم باہر آ گئے۔ جمعہ خان نے نانک سنگھ سے کہا کہ اب وہ اپنا وعدہ پورا کرے اور اس قصے میں اس کا نام نہ آنے دے۔ نانک سنگھ نے اسے کہا کہ وہ فکر نہ کرے، اب اس کے ساتھ دوستی قائم رہے گی، پھر اس نے بڑی بے شرمی کا مظاہرہ کرتے ایک آنکھ دبا کر ہوئے سرگوشی میں جمعہ خان سے پوچھا کہ اس نے خوب موج میلہ کیا ہو گا۔

"خان سب گناہ کرتا ہے۔" جمعہ خان نے کہا۔ "شراب نہیں پیتا اور زنا نہیں کرتا۔ لڑکی جیسی آئی تھی ویسی جا رہی ہے۔"

بہرحال ہم کامنی اور جیکب کو وہاں سے لے کر تھانے آ گئے۔ نانک سنگھ نے کاغذوں کا پیٹ بھرا اور جمعہ خان کو صاف بچا لیا۔ جمعہ خان نے بتایا کہ جیکب نے اسے بتایا کہ کس طرح وہ کامنی کو اُڑا لایا ہے اور اب اس کے پاس کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ جمعہ خان نے کہا کہ وہ لڑکی لے آئے، اسے عصمت فروشوں کے آگے بیچ دیا جائے گا۔ ابھی کامنی کا سودا نہیں ہوا تھا کہ میں اور نانک وہاں پہنچ گئے۔ جیکب نے جمعہ خان کو نہیں بتایا تھا کہ وہ ایک آدمی کو قتل کر کے آیا ہے۔

تھانے میں آ کر ہم دونوں تھانیداروں نے جیکب کو گھیر لیا۔ میں نے جیکب کو بتایا کہ دراب کے ملازم شکور نے سب کچھ بتا دیا ہے اس لیے وہ اقبالی بیان دے دے۔ میں نے اور نانک سنگھ نے بغیر کسی تشدد کے اسے بیان دینے پر آمادہ کر لیا۔ اس نے بڑی تفصیل اسے اپنا اقبالی بیان دیا۔ چونکہ اس واردات کی ساری تفصیلات میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ اس لیے جیکب کا بیان سنانے کی ضرورت نہیں۔

میں نے جیکب سے پوچھا کہ قتل کی واردات کے وقت اس کے ساتھ کون شامل تھا۔ اس نے ایک ہندو لڑکے کے متعلق بتایا کہ ان دونوں نے مل کر یہ واردات کی تھی۔ اس ہندو نوجوان کا نام موہن تھا۔ یہ وہی نوجوان تھا جس کے پیٹ میں عباس نے چاقو مارا تھا۔ نانک سنگھ نے جیکب سے اس کا پتہ پوچھ کر اپنے اے ایس آئی کو بھیجا کہ اسے گرفتار کر کے لے آئے۔ اے ایس آئی اسی وقت چلا گیا۔

اس کے بعد نانک سنگھ نے کامنی کی ماں شیلا بائی کو اطلاع بھیجی کہ اس کی بیٹی بازیاب ہو گئی ہے۔ وہ گویا اُڑتی ہوئی تھانے پہنچی اور آتے ہی کامنی سے لپٹ گئی۔ ہم نے کامنی کو اس کی ماں کے حوالے کر دیا لیکن میں نے اس سے کہا کہ چونکہ کامنی موقعہ کی گواہ ہے۔ اس لیے اسے عدالت میں گواہی کے وقت پیش ہونا پڑے گا۔

نانک سنگھ کا اے ایس آئی موہن کو گرفتار کر کے لیے آیا تھا۔ اس کے بعد کاغذی کارروائی کر کے نانک سنگھ نے جیکب اور موہن کو میرے حوالے کر دیا۔ اس نے اپنے دو کانسٹیبل بھی میرے ساتھ روانہ کر دیئے تھے تاکہ ملزموں کو حفاظت سے لے جایا جا سکے۔

میں دونوں کو لے کر اپنے تھانے میں آ گیا۔ میں نے بڑی محنت سے مقدمہ تیار کر کے عدالت میں پیش کر دیا۔ جیکب نے جس کلہاڑی سے عباس کو قتل کیا تھا۔ وہ میں نے اس کی نشاندہی پر برآمد کر لی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے دراب اور اس کے ملازم شکور کے بیان بھی

عدالت میں دلوائے۔

اس کے علاوہ موقعۂ واردات پر ملنے والے کُھروں کے مولڈ میرے پاس محفوظ تھے۔ میں نے جیکب اور موہن کے کُھرے ان سے ملا کر یہ بھی عدالت میں پیش کر دیئے۔ جیکب نے یہ اعتراف بھی کر لیا تھا کہ موقعۂ واردات سے ملنے والی لکڑی کی صلیب اسی کی تھی۔

اس کیس میں سب زیادہ اہم گواہی کامنی کی تھی کیونکہ وہ عینی شاہد تھی۔ اس نے بڑے جذباتی انداز میں اپنا بیان دیا تھا اور اس دوران کئی بار اس کا رونا بھی نکل آیا۔ اس کا بیان آہوں، ہچکیوں اور آنسوؤں سے بھرپور تھا۔

جج کے لیے فیصلہ کرنا بالکل مشکل نہ تھا۔ اس نے جیکب کو سزائے موت اور اس کے ساتھی موہن کو عمر قید کی سزا سنا دی۔ دونوں نے اس سزا کے خلاف اپیل کی مگر جیکب اور موہن چونکہ پہلے بھی سزا یافتہ تھے، اس لیے ان کی یہ سزا برقرار رہی۔

☆======☆======☆

قاتل کنواں اور چھلّا

قتل کا منصوبہ بڑا شاندار تھا۔ انہوں نے لڑکی کو بڑی کامیابی سے قتل کیا، اس کا سر کاٹ کر زمین میں کہیں دفن کر دیا اور لاش بوری میں بند کر کے کنویں میں پھینک دی...... جرم کا کوئی ثبوت نہ تھا...... کوئی گواہ نہ تھا لیکن...... اللہ دیکھ رہا تھا۔

پچھلے چند ماہ سے اخباروں میں اس قسم کی خبریں آ رہی ہیں کہ فلاں جگہ سے بوری بند لاش ملی۔ ان میں بعض لاشیں ایسی بھی ملیں جن کے سر غائب تھے۔ یہ لاشیں پولیس کے لیے مصیبت بن گئی ہیں اور سر نہ ہونے کی وجہ سے ان کی شناخت ناممکن نظر آتی ہے۔ پولیس کا خیال ہے کہ یہ وارداتیں لوگوں میں دہشت پھیلانے کے لیے کی جا رہی ہیں۔

قتل و غارت کی خبریں اتنی کثرت سے اخباروں میں چھپتی ہیں کہ اب لوگ انہیں پڑھتے ہی نہیں ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے میں سو بچوں کے قتل کی خبروں نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ پرانے وقتوں میں کبھی کبھار کوئی قتل ہو جاتا تھا تو کہرام مچ جاتا تھا۔ حیرت کی بات ہے کہ سو سے زیادہ بچے غائب ہو گئے اور پھر ایک گنجان آباد محلے کے مکان میں ان کو قتل بھی کیا گیا اور پولیس سمیت محلے دار بھی اس سے بے خبر رہے۔ اس المناک واقعے کے پیچھے جہاں پولیس کی نااہلی کا ہاتھ ہے وہاں لوگوں کی بے حسی بھی افسوس ناک ہے۔

ہمارے وقتوں میں قتل چوری ڈکیتی کی کوئی واردات ہو جاتی تو متعلقہ علاقے کے تھانیدار کی جان عذاب میں آ جاتی۔ انگریز افسر باقاعدگی سے روزانہ رپورٹ مانگتے اور جلد از جلد ملزم مانگتے تھے۔

میں نے شروع میں بوری بند لاشوں کا ذکر کیا ہے۔ اخبار میں بوری بند لاشوں کی خبریں پڑھ کر مجھے ایک بوری بند لاش یاد آ گئی جو میرے لیے مصیبت بن گئی تھی۔ یہ اُن دنوں کا کیس ہے جب پاکستان کا تصور ابھی واضح نہیں ہوا تھا۔ میں موجودہ ہندوستان کے ایک قصبے کے تھانے انچارج تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا اور اس کے ارد گرد کافی گاؤں تھے۔ جرائم کے معاملے میں یہ علاقہ کافی پُرسکون تھا۔ بڑا جرم مثلاً قتل اور ڈکیتی وغیرہ بہت کم ہوتا تھا البتہ لڑائی جھگڑے اور معمولی چوری چکاری کی وارداتیں اکثر ہو جاتی تھیں۔

ایک صبح دس گیارہ بجے کا وقت ہو گا جب ایک قریبی گاؤں کا نمبردار تھانے میں آیا۔ اس کے ساتھ تین لڑکے تھے جن کی عمریں تیرہ چودہ سال کے لگ بھگ ہوں گی۔ تینوں لڑکے گھبرائے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ نمبردار نے لڑکوں کو باہر کھڑا ہونے کو کہا اور خود میرے پاس آ گیا۔ یہ نمبردار ہندو تھا اور میں اسے بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا نام آنند رام تھا۔

یہاں میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ علاقہ ہندوؤں کی اکثریت کا تھا لیکن مسلمان بھی خاصی تعداد میں تھے۔ تھوڑی تعداد میں سکھ بھی تھے۔ یہ تینوں قومیں مل جل کر رہتی تھیں۔ اگر کبھی ہندو اپنی اکثریت کے بل بوتے پر بدمعاشی کرنے کی کوشش کرتے تو مسلمان ان سے نمٹ لیتے تھے۔

اس ہندو نمبردار نے اندر آتے ہی تقریباً رکوع میں جا کر دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے سلام کیا۔ میں نے اسے بیٹھنے کو کہا تو وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور میری خوشامد اور چاپلوسی والی باتیں کرنے لگا۔ میں نے اسے ٹوک دیا اور کہا کہ وہ جس کام سے آیا ہے اس کے متعلق بات کرے۔ اس نے جو بات بتائی وہ میں آپ کو مختصراً سنا دیتا ہوں۔

اس قصبے سے ایک چھوٹی سی نہر گزرتی تھی۔ جہاں جہاں سے یہ نہر گزرتی تھی وہاں کے لوگوں نے آبپاشی کے لیے نالے بنا لئے تھے اور ان کے ذریعے اپنی زمینوں کو سیراب کرتے تھے۔ اس علاقے میں کنویں بھی بڑی تعداد میں تھے جن سے کھیتوں کے لیے پانی مہیا کیا جاتا تھا۔ نہری پانی کی سہولت کی وجہ سے لوگوں نے کنوؤں کا استعمال بہت کم کر دیا تھا۔ اس وجہ سے بہت سے کنویں بے آباد اور ویران ہو گئے تھے۔

ایسے ویران اور بے آباد کنوؤں کو ڈل کہا جاتا تھا۔ ان ویران کنوؤں کے اندر جنگلی کبوتروں اور دوسری نوع کے پرندوں نے گھونسلے بنا لئے تھے۔ دیہاتی لڑکے ان کنوؤں سے پرندوں کے انڈے اور بچے نکالنے کے لیے اکثر ان کے اندر اُتر جاتے تھے۔

یہ جو تین لڑکے نمبردار کے ساتھ تھانے میں آئے تھے، ایسے ہی ایک ویران کنوئیں میں اُترے۔ انہیں کنویں کی تہہ میں ایک بوری نظر آئی۔ کنویں میں پانی بہت کم تھا اور بوری پانی کی سطح کے اوپر تھی۔ لڑکوں نے سمجھا کہ بوری کے اندر کوئی سامان وغیرہ ہو گا جو چوروں ڈاکوؤں نے واردات کے بعد بھاگتے ہوئے یہاں پھینکا ہے۔

ایک لڑکا ذرا اور نیچے اُترا جہاں سے بوری واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ بوری ایک طرف سے ذرا سی پھٹی ہوئی ہے اور اس میں سے دو انسانی انگلیاں نظر آ رہی ہیں۔ لڑکا گھبرا گیا اور بڑی تیزی سے کنوئیں سے باہر نکلا۔ اس نے اپنے باقی دو ساتھیوں کو یہ بات

بتائی۔ ان تینوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس بوری کی اطلاع نمبردار کو دینی چاہیے۔ انہوں نے نمبردار آنند رام کو یہ بات بتائی تو آنند رام اسی وقت ان کے ساتھ کنویں پر گیا اور اپنی آنکھوں سے بوری کو دیکھا۔

نمبردار نے اپنے ایک آدمی کو کنویں کے پاس کھڑا کیا اور خود ان تینوں لڑکوں کو لے کر میرے پاس آ گیا۔ میں نے تینوں لڑکوں سے چند باتیں پوچھیں اور اس لڑکے سے جس نے نیچے اُتر کر بوری قریب سے دیکھی، تصدیق کی کہ اسے یقین ہے کہ بوری سے انسانی انگلیاں ہی نظر آ رہی تھیں۔ اس لڑکے نے پورے وثوق سے بتایا کہ وہ انسانی انگلیاں ہی تھیں۔

میں نے دو کانسٹیبل اپنے ساتھ لئے اور نمبردار اور لڑکوں کو ساتھ لے کر کنویں کی طرف چل پڑا۔ میرا اے ایس آئی ایک ہندو جوگندر پال تھا۔ وہ بڑا سمجھدار اور قابل نوجوان تھا۔ اس میں ایک خرابی تھی کہ وہ شراب پیتا تھا اور اکثر ڈیوٹی کے اوقات میں بھی داؤ لگانے سے نہیں چوکتا تھا۔ جوگندر پال اس وقت تھانے میں نہیں تھا۔ وہ تھانے کے کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ میں نے محرر حوالدار سے کہا کہ جونہی جوگندر پال آئے اسے کنویں پر بھیج دے۔

چاندی کا چھلاّ اور ساڑھی

کنویں پر جا کر میں نے اوپر سے جھانک کر دیکھا۔ مجھے کنویں کی تہہ میں ایک بوری نظر آئی جو اوپر سے پوری طرح نظر نہیں آ رہی تھی۔ اب اس بوری کو کنویں سے باہر نکالنے کا مسئلہ تھا۔ میں نے نمبردار سے کہا کہ کسی ایسے آدمی کا بندوبست کرے جو نیچے اُتر سکے۔ اس کے علاوہ میں نے اسے ایک مضبوط رسہ بھی منگوانے کے لیے کہا۔ نمبردار نے اپنا آدمی بھیج کر رسہ اور مطلوبہ آدمی بلا لیا۔ یہ آدمی ہندو تھا اور شمشان گھاٹ پر مُردے جلانے کا کام کرتا تھا۔

میں نے اس آدمی کو سمجھایا کہ نیچے اُتر کر بوری کے گرد رسہ مضبوطی سے باندھ دے۔ رسہ اس طرح باندھے کہ بوری کے گرد تین چار بل دے کر مضبوط گرہ لگا دے تاکہ جب بوری اور کھینچی جائے تو رسے سے نکل نہ جائے۔ اس آدمی نے نیچے جا کر میرے کہنے کے مطابق بڑی مہارت سے بوری کو بڑی مضبوطی سے باندھ دیا۔

گاؤں کے لوگوں کو بوری میں بند لاش کی خبر مل چکی تھی اور بہت سے لوگ تماشہ دیکھنے کے لیے اکٹھے ہو گئے تھے۔ میں نے چھ سات آدمیوں کو آگے بلایا اور انہیں رسہ کھینچنے کے لیے کہا۔ سب نے مل کر رسہ کھینچا تو بوری بڑی آسانی سے باہر آ گئی۔ بوری سے رسہ کھولا گیا اور میں

نے قریب جا کر دیکھا۔ میں وہ سوراخ دیکھنا چاہتا تھا جس کا ذکر تھانے میں لڑکے نے کیا تھا اور بتایا تھا کہ اس سوراخ سے دو انسانی انگلیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ میں نے بوری کو غور سے دیکھا تو مجھے وہ سوراخ نظر آ گیا۔ اس میں سے واقعی دو انسانی انگلیاں نظر آ رہی تھیں۔

میں نے بوری کے قریب بیٹھ کر انگلیوں کو دیکھا۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ یہ کسی عورت کی انگلیاں ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ بوری میں بند لاش کسی عورت کی ہے۔ میں نے موقعہ پر جو کارروائی کرنی تھی، وہ کی اور نمبردار سے کہا کہ لاش کو تھانے پہنچانے کا بندوبست کرے۔ نمبردار نے فوری طور پر ایک بیل گاڑی کا بندوبست کر دیا۔ میں نے بوری بیل گاڑی پر رکھوائی اور دونوں کانسٹیبلوں کو بیل گاڑی پر ساتھ آنے کے لیے کہا۔

تھانہ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ لاش کو کنویں سے نکالنے اور دیگر کارروائیوں میں تین گھنٹے لگ گئے تھے۔ میں تھانے واپس جانے کے لیے روانہ ہونے لگا تو اے ایس آئی جوگندر پال آتا دکھائی دیا۔ جب وہ میرے پاس پہنچا تو میں لاش بیل گاڑی میں رکھوا کر تھانے کی طرف روانہ کر چکا تھا۔ میں نے جوگندر پال کو ساری تفصیل سنائی اور ہم دونوں تھانے کی طرف چل پڑے۔

تھانے پہنچ کر میں نے بوری کھلوائی اور لاش کو باہر نکالا۔ جب میرے کہنے پر کانسٹیبلوں نے لاش بوری سے نکالی تو لاش دیکھ کر میرے چودہ طبق روشن ہو گئے اور میں پریشان ہو گیا۔ میری پریشانی یہ تھی کہ لاش کے ساتھ اس کا سر نہیں تھا۔ لاش ایک نوجوان لڑکی کی تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ اس کے جسمانی خدوخال اور جلد سے اور ہاتھ پیروں کو دیکھنے سے ہوتا تھا۔ لاش کے جسم پر ایک ساڑھی لپٹی ہوئی تھی۔ یہ عام سی ساڑھی تھی۔ ساڑھی کا کپڑا سفید رنگ کا تھا اور اس پر نیلے رنگ کے خانے بنے ہوئے تھے۔

میں نے لاش کا نظری معائنہ کیا۔ مجھے اس کے جسم پر کہیں کوئی زخم یا خراشوں وغیرہ کا نشان نظر نہ آیا۔ ایک چیز مجھے ایسی نظر آئی جو تفتیش میں کام آ سکتی تھی۔ یہ چاندی کا ایک چھلا تھا جو مقتولہ کے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے ساتھ والی انگلی میں تھا۔ میں نے یہ چھلا اتار لیا۔ یہ عام گول چھلا نہیں تھا بلکہ اس کی گولائی لہریے دار تھی۔ میں نے چھلا جیب میں ڈال لیا۔

لاش کی گردن کسی تیز دھار آلے سے بڑی صفائی سے کاٹی گئی تھی۔ لاش کے جسم پر ساڑھی بالکل ٹھیک بندھی ہوئی تھی اور لاش کی ظاہری حالت سے بھی یہ اندازہ ہوتا تھا کہ مرنے سے پہلے مقتولہ کے ساتھ زیادتی یا کسی قسم کا تشدد نہیں ہوا۔ مقتولہ کے ساتھ زیادتی نہیں ہوئی تھی اور تشدد بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ قتل کا باعث کچھ اور ہے۔

شناخت کا مسئلہ

میرے لیے سب سے بڑا مسئلہ لاش کی شناخت کا تھا۔ اگر لاش شناخت ہو جاتی تو پھر تفتیش کرنا مشکل نہ تھا۔ بہرحال میں نے ضروری کارروائی کر کے لاش پوسٹ مارٹم کے لئے سرکاری ہسپتال بھجوا دی۔ مقتولہ کے جسم پر موجود ساڑھی اسے ہندو ظاہر کر رہی تھی۔ میں نے نمبردار آنند رام سے کہا کہ وہ اپنے علاقے میں معلوم کرے کہ کسی ہندو گھر کی کوئی جوان لڑکی غائب تو نہیں ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنے تھانے کے مخبروں کو طلب کیا اور انہیں کہا کہ وہ اردگرد کے دیہات میں پھیل جائیں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ کسی کے گھر سے کوئی جوان لڑکی غائب تو نہیں ہوئی۔

اس کے بعد میں نے یہ کارروائی کرنی تھی کہ اردگرد کے تھانوں سے یہ معلوم کرنا تھا کہ کسی تھانے میں کسی نوجوان لڑکی کی گمشدگی کی رپورٹ تو درج نہیں ہے۔ میں نے اپنے اے ایس آئی جوگندر پال سے اس کی رائے پوچھی تو اس نے دوٹوک لہجے میں کہا کہ مقتولہ ہندو ہے، اس لیے ہندو گھرانوں سے ہی اس کا سراغ مل سکتا ہے۔

دوسرے دن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آ گئی۔ میری توقع کے عین مطابق رپورٹ میں لکھا تھا کہ مقتولہ کی موت گردن کٹنے سے ہوئی ہے۔ گردن کو کسی تیز دھار آلے سے بڑی صفائی سے کاٹا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مقتولہ پر کسی قسم کا تشدد نہیں ہوا۔ رپورٹ میں یہ بھی لکھا تھا کہ مقتولہ کنواری تھی۔ یہ بات میں نے خاص طور پر نوٹ کر لی۔

لاش کو میں نے غور سے دیکھا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ مقتولہ کنواری ہو گی۔ رپورٹ میں یہ بات میرے لیے حیرانی کا باعث نہ تھی۔

بہرحال میں نے مقتولہ کی بے سر کی لاش اور اس کی ساڑھی جو ہسپتال والوں نے لاش کے ساتھ ایک پیکٹ میں بھجوا دی تھی، شناخت کے لیے تھانے کے صحن میں رکھوا دی۔ لاش کا چہرہ تو تھا ہی نہیں اس لیے اس کے پہچان لئے جانے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس کے علاوہ مقتولہ کے جسم پر ایسی کوئی واضح نشانی یا کسی زخم وغیرہ کا نشان بھی نہیں تھا۔ مقتولہ کی ساڑھی میں نے نمایاں کر کے تھانے کے صحن میں لٹکا دی۔

لوگ آ آ کر لاش اور ساڑھی کو دیکھتے اور لاعلمی کا اظہار کر کے چلے جاتے۔ لاش کی حالت بری ہو رہی تھی اور اب بدبو چھوڑنے لگی تھی۔ میں نے لاش لاوارث قرار دے کر کاغذی کارروائی کی اور دفن کرا دی۔ ساڑھی میں نے بدستور وہیں لٹکتی رہنے دی تھی۔ اس بے سر کی لاش

کی شہرت اردگرد کے دیہات تک پہنچ گئی تھی اور لوگ دہشت زدہ ہو گئے تھے۔ ہر جگہ لوگوں کی گفتگو کا موضوع اسی لاش کے متعلق ہوتا تھا۔

آج کل قتل اتنی کثرت سے ہوتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ اس کے نتیجے میں لوگوں کا ردعمل اور پولیس کی لاپروائی دیکھ کر شک ہونے لگتا ہے کہ کوئی انسان نہیں بلکہ کتا بلا مارا گیا ہے جس کی کسی کو کوئی فکر ہی نہیں ہے۔

میرے سارے مخبروں کی رپورٹ ایک ہی جیسی تھی کہ کسی گھر سے کوئی نوجوان لڑکی غائب نہیں ہے۔ ایک مخبر نے ذرا الگ رپورٹ دی۔ اس نے بتایا کہ پچھلے دنوں واردات والے کنوئیں سے تھوڑی ہی دور خانہ بدوشوں نے ڈیرا لگایا ہوا تھا۔ اس نے شک ظاہر کیا کہ ہو سکتا ہے یہ لڑکی خانہ بدوشوں کی ہو اور انہوں نے اسے کسی وجہ سے قتل کر کے کنوئیں میں ڈال دیا ہو۔

خانہ بدوش تو آج کل بھی نظر آ جاتے ہیں لیکن اس دور کے خانہ بدوش بہت خطرناک ہوا کرتے تھے۔ یہ بڑے خونخوار لوگ ہوتے تھے۔ قتل چوری ڈاکے جیسے جرائم ان کے لیے معمولی سی بات ہوتی تھی۔ ان کی عورتیں بڑی خوبصورت اور تیز طرار ہوا کرتی تھیں۔ یہ لوگ قبیلے کے اندر ہی شادیاں کرتے تھے اور اپنی لڑکیاں باہر نہیں بیاہتے تھے۔ اگر کوئی نوجوان لڑکی یا لڑکا قبیلے کے قوانین سے بغاوت کرتا تو اسے سخت سزا دی جاتی تھی۔

شہروں اور دیہات کے نوجوان لڑکے اکثر اوقات ان کے گرد منڈلاتے رہتے تھے لیکن یہ عورتیں کسی کو گھاس نہیں ڈالتی تھیں۔ اگر کوئی خانہ بدوش لڑکی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر قبیلے سے باہر کسی مرد کی محبت میں گرفتار ہو جاتی تو قبیلے والے اس پر سختی کرتے تھے پھر بھی اگر وہ باز نہ آتی اور قبیلے سے بھاگنے کی کوشش کرتی تو ایسی لڑکی کو قتل کر دیا جاتا تھا۔

میں نے اس پہلو پر غور کیا تو یہ بات دل کو نہ لگی۔ لڑکی کا لباس خانہ بدوشوں والے مفروضے کو غلط ثابت کر رہا تھا۔ خانہ بدوش عورتوں کا لباس خاص قسم کا ہوا کرتا تھا جو گھاگھرا اور اس کے اوپر چھوٹی سی قمیص پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ چاندی کے بھاری بھرکم زیورات ان کے لباس کا لازمی حصہ ہوتا تھا۔ ان ساری باتوں کو سامنے رکھ کر میں نے اپنے مخبر کے اس خیال کو مسترد کر دیا اور تفتیش کا رخ ہندو گھرانوں کی طرف ہی رکھا۔

نشان سنگھ کی نشاندہی

تین دن گزر گئے اور مجھے کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ کسی طرف سے ذرا سا اشارہ بھی نہ ملا کہ فلاں کی لڑکی غائب ہے۔ مخبر بھی ناکام ہو گئے اور کام کی کوئی اطلاع نہ لا سکے۔ میرے پاس صرف یہی

ایک کیس نہ تھا، تھانے میں اور بھی بہت سے کیس زیر تفتیش تھے۔ میں نے یہ کیس عارضی طور پر اپنے اے ایس آئی جوگندر پال کے سپرد کر دیا اور خود دوسرے کاموں میں مصروف ہوگیا۔

دو دنوں بعد جوگندر پال کسی کام سے ایک دوسرے گاؤں میں گیا۔ اس گاؤں کا نام اب مجھے یاد نہیں آ رہا۔ آپ اس گاؤں کا نام بڈیالہ سمجھ لیں۔ کچھ اسی قسم کا نام تھا۔ وہاں جوگندر پال کا ایک سکھ دوست رہتا تھا۔ اس کا نام نشان سنگھ تھا۔ باتوں باتوں میں تھانے اور وارداتوں کا ذکر چل نکلا۔ جوگندر پال نے موقع غنیمت جانا اور نشان سنگھ سے کہا کہ وہ اپنے گاؤں میں دھیان رکھے کہ کسی کے گھر سے کوئی نوجوان لڑکی غائب تو نہیں ہے۔ پھر اس نے نشان سنگھ کو کنوئیں سے ملنے والی بغیر سر کی لاش کے متعلق اور اس ساڑھی کے متعلق بتایا جو مقتولہ کے جسم پر موجود تھی۔

یہ ساری بات مجھے جوگندر پال نے بعد میں سنائی تھی۔ اس نے بڑی لمبی بات سنائی تھی جو میں آپ کو مختصر کر کے سنا رہا ہوں۔

جوگندر پال کی بات سن کر نشان سنگھ سوچ میں پڑ گیا۔

''ہمارے گاؤں کی ایک لڑکی غائب تو ہے۔'' نشان سنگھ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

''لیکن اس کے گھر والوں نے بتایا ہے کہ وہ اپنی خالہ کے ساتھ رہنے کے لیے اس کے گھر گئی ہوئی ہے۔ اس کی خالہ ایک تحصیل کے بڑے گاؤں میں رہتی ہے۔ چند دن پہلے وہاں سے خط آیا کہ ان کی لڑکی جس کا نام شانتا ہے، طاعون کی بیماری سے مرگئی ہے اور اس کا کریا کرم کر دیا گیا ہے۔ شانتا کے گھر والوں نے یہاں اس کا ماتم کیا اور ساری رسمیں کی تھیں۔''

یہاں میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس زمانے میں طاعون کی وبا عام تھی اور یہ کہیں نہ کہیں پھوٹتی رہتی تھی۔ آج کل کی طرح جدید سہولتیں اور علاج نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے لوگ مرجاتے تھے۔ یہ بیماری چوہوں کے خون میں موجود جراثیم کے ذریعے پھیلتی ہے۔ شروع میں مریض کے گلے میں ایک گلٹی نکلتی اور پھر دو تین دنوں میں متاثرہ شخص مرجاتا۔

کہیں سے افواہ بھی اُڑ جاتی کہ طاعون پھیل گیا ہے تو لوگ سچ مان لیتے اور وہاں سے اپنے بال بچوں کو ساتھ لے کر کسی محفوظ مقام پر چلے جاتے تھے۔ خالہ کے گاؤں سے جب خط آیا کہ شانتا طاعون کی وجہ سے مرگئی ہے تو اس کے بڑے بھائی مدن لعل نے سارے گاؤں کو یہ خبر سنائی اور شانتا کا باقاعدہ ماتم کیا گیا۔

نشان سنگھ کی زبانی یہ ساری بات سن کر جوگندر پال کو کچھ مایوسی سی ہوئی۔ اس نے یہ

رپورٹ مجھے سنائی مجھے یہ سارا واقعہ کچھ غیر حقیقی سا لگا۔ اس میں کئی باتیں غور طلب تھیں۔ مثلاً اگر شانتا وہاں طاعون سے مرگئی تھی تو خالہ نے اس کے ماں باپ کو بلائے بغیر اس کی لاش کیوں جلا دی تھی؟ کیا خط ملنے کے بعد شانتا کے والدین وہاں گئے تھے جہاں ان کی بیٹی کی موت ہوئی تھی؟ یہ اور ایسے بہت سے سوالات میرے دماغ میں آ رہے تھے۔

میں نے ضروری سمجھا کہ شانتا کے گھر جا کر اپنی تسلی کروں۔ اگلے دن میں نے جوگندر پال کو ساتھ لیا اور بڈیالہ گاؤں جا پہنچا۔ ہم پہلے نشان سنگھ کے گھر گئے۔ وہ ہمیں شانتا کے گھر لے گیا۔ میرے کہنے پر اس نے دروازے پر دستک دی تو ایک نوجوان نے دروازہ کھولا۔ میں اور جوگندر پال دروازے سے ذرا ہٹ کر کھڑے ہوئے تھے۔ وہ نشان سنگھ سے باتیں کرنے لگا۔ اچانک اس کی نظر ہم دونوں پر پڑ گئی۔ ہم دونوں وردی میں تھے۔ جونہی اس کی نظر ہم دونوں پر پڑی اس کو واضح طور پر جھٹکا سا لگا اور اس کے چہرے کے تاثرات یکدم بدل گئے۔ ان تاثرات میں خوف کا عنصر صاف نظر آ رہا تھا۔ پھر وہ اندر چلا گیا۔ نشان سنگھ نے بتایا کہ یہ شانتا کا بھائی آنند لعل ہے۔ بڑے بھائی کا نام مدن لعل تھا اور وہ اس وقت گھر میں نہیں تھا۔ راستے میں آتے ہوئے نشان سنگھ نے مجھے بتایا تھا کہ دونوں بھائی مل کر پرچون کی دکان چلاتے ہیں جو نزدیکی قصبے میں ہے۔

اُمید کی ایک کرن

تھوڑی دیر بعد آنند لعل نے بیٹھک کا دروازہ کھولا اور ہمیں اندر لے گیا۔ میں، جوگندر پال اور نشان سنگھ اندر بیٹھ گئے۔ آنند پال ہمارے سامنے کھڑا ہوگیا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ ہمارے آنے سے بڑا پریشان اور خوفزدہ ہے۔ میں نے اسے دلاسا دیا اور اس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ اس کا خوف کچھ کم ہوگیا اور وہ میرے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ آنند لعل نے بتایا کہ ان کا باپ مر چکا ہے اور ماں گھر میں بیمار پڑی ہے۔ آنند لعل کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی جبکہ بڑے بھائی مدن لعل کی شادی ہو چکی تھی اور اس کی ایک چھ سات سال کی بچی تھی۔ اس کے بعد ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

''مدن لعل کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بڑے بھیا اس وقت دکان پر ہیں۔'' آنند لعل نے کہا۔ ''پہلے ٹائم وہ دکان پر بیٹھتے ہیں اور دوپہر کے بعد میں جا کر انہیں گھر بھیج دیتا ہوں۔''

''سنا ہے تمہاری ایک بہن بھی ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

پوچھا۔ ''وہ کہاں ہے؟''

میں نے غور سے دیکھا۔ وہ ایک دم گھبرا سا گیا تھا لیکن پھر اس نے فوراً ہی اپنی گھبراہٹ پر قابو پالیا۔ گھبراہٹ کا یہ لمحہ اتنا مختصر سا تھا جیسے بجلی چمک کر بجھ گئی ہو۔

''آپ شانتا کے متعلق پوچھ رہے ہیں؟'' آنند لعل نے کہا۔ ''اس کا دیہانت ہو گیا تھا جی!''

''کب؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے آٹھ دس دن پہلے کی ایک تاریخ بتائی۔

''تمہاری بہن شانتا کیسے مرگئی؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا وہ بیمار تھی؟''

''وہ تو جی بھلی چنگی تھی۔'' آنند لعل نے جواب دیا۔ ''خالہ کے گھر گئی تھی۔ وہاں پلیگ کی وبا پھیل گئی۔ وہ اسی بیماری میں مبتلا ہو کر مری تھی۔''

''کیا تم لوگ اس کے کریا کرم میں شامل ہوئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں جی!'' آنند لعل نے کہا۔ ''خالہ نے بیماری پھیلنے کے ڈر سے فوراً ہی اس کا کریا کرم کر دیا تھا۔''

''پھر تم لوگوں کو کیسے پتہ چلا؟'' میں نے پوچھا۔

''خالہ نے اسی دن ہمیں خط لکھ دیا تھا جس دن شانتا مری تھی۔'' اس نے کہا۔

''خط ملنے کے بعد تم لوگ وہاں گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں جی!'' آنند لعل نے کہا اور ہم سے نظریں چرانے لگا۔

مجھے اس کی یہ بات سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ ان کی جوان بہن مرگئی تھی اور وہ اس کی چتا تک دیکھنے نہیں گئے تھے۔ یہ بڑی انہونی بات تھی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔

''کیوں نہیں گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''مرنے والی تو مرگئی تھی جی!'' آنند لعل نے کہا۔ ''ہم نے وہاں جا کر کیا کرنا تھا۔ خواہ مخواہ اتنا سفر کرتے اور کرائے وغیرہ میں پیسے ضائع کرتے۔ دکان بند کرنے سے الگ نقصان ہونا تھا۔ یہی سوچ کر ہم نے صبر کر لیا تھا۔''

ابھی اس کا جواب پورا ہوا ہی تھا کہ بیٹھک کے دوسرے دروازے سے جو گھر کے اندر کھلتا تھا، ایک چھ سات سال کی بچی اندر آ گئی۔ ابھی وہ کچھ کہنے بھی نہیں پائی تھی کہ آنند لعل گولی کی سی تیزی سے اٹھا اور جھپٹ کر بچی کو گھر کے اندر کی طرف لے گیا۔ میں، جوگندر پال اور

نشان سنگھ اس کی اس حرکت پر حیران رہ گئے۔ کوئی عام آدمی ہوتا تو اس بظاہر معمولی بات پر اتنی توجہ نہ دیتا لیکن میں تھانیدار تھا اور ہر بات پر غور کرتا تھا۔ میں نے حسب عادت سوچنا شروع کر دیا کہ ایسی کیا خاص بات تھی کہ آنند لعل نے اتنی تیزی دکھائی۔

میں نے اپنے ذہن میں وہ سارا منظر دوبارہ دہرایا اور میرے ذہن میں ری پلے کی طرح وہ منظر چلنے لگا۔ بچی کا اندر آنا، آنند لعل کا بڑی تیزی سے اٹھنا اور جھپٹ کر تقریباً گھسیٹتے ہوئے اسے بیٹھک سے باہر لے جانا۔ میں جتنا اس پر غور کرتا اتنا ہی ذہن اُلجھ جاتا۔ کوئی بات ایسی تھی جو میرے ذہن میں چبھ رہی تھی۔ غور کرتے کرتے اچانک میرے ذہن میں روشنی سی چمکی اور وہ بات میری سمجھ میں آگئی۔

میں نے پہلے اس پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ میرے ذہن میں چبھنے والی چیز اندر آنے والی بچی کے کپڑے تھے۔ بچی نے جو کپڑے پہنے ہوئے تھے، ان کا ڈیزائن ہو بہو وہی تھا جو مقتولہ کی لاش سے ملنے والی ساڑھی کے کپڑے کا تھا۔ وہی درمیانہ سا سفید رنگ کا کپڑا اور اس پر بنے ہوئے نیلے رنگ کے خانے۔ میں نے اس بات کو ذہن میں رکھ لیا۔

آنند لعل بچی کو اندر چھوڑ کر آیا تو میں نے اس کے ساتھ کچھ باتیں اور کیں اور پھر وہاں سے آ گیا۔

آگ پانی کا ملن

وہاں سے نکلے تو دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ نشان سنگھ بڑا اصرار کر کے ہمیں اپنے گھر لے گیا۔ اس نے سکھوں والی روایتی مہمان نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیں بڑا پُر تکلف کھانا کھلایا۔ کھانے کے بعد میں نے نشان سنگھ سے پوچھا کہ اسے یاد ہے کہ شانتا کس دن اپنی خالہ کے ساتھ گاؤں سے گئی تھی اور کیا اس نے اسے گاؤں سے جاتے وقت دیکھا تھا۔

نشان سنگھ نے انکار میں سر ہلا کر بتایا کہ اس نے نہیں دیکھا۔

''آپ جو بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں وہ مجھے بتا دیں۔'' نشان سنگھ نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''میں آپ کی مطلوبہ معلومات حاصل کر لوں گا۔''

نشان سنگھ تھا تو سکھ لیکن عام سکھوں کی طرح نہیں تھا۔ وہ بڑا سلجھا ہوا اور دھیمے مزاج کا سکھ تھا۔ وہ کم بولتا تھا اور سوچ کر بات کرتا تھا۔ میں نے اس سے کام لینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ وہ معلوم کرے کہ جس دن شانتا اپنی خالہ کے ساتھ گئی تھی، اس دن اس نے

کیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔ کپڑے کا رنگ اور ڈیزائن بھی معلوم کرنا تھا۔

میرے ذہن میں جس شک نے سر ابھارا تھا، میں نے اس پر کام شروع کر دیا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ میرا شک ٹھیک نکلتا۔ میرے شک کی بنیاد مقتولہ کی ساڑھی کا کپڑا تھا۔ ایسے ہی کپڑے کا لباس مدن لعل کی بچی نے پہن رکھا تھا۔ میں ایک بڑی ہی موہوم اُمید کے سہارے آگے بڑھ رہا تھا۔ ایسا کپڑا بازار میں بہت بکتا ہوگا اور بہت سے لوگوں نے خریدا ہو گا۔ اگر صرف کپڑے کی ہی بات ہوتی تو شاید میں اتنی توجہ نہ دیتا۔ میرے ذہن میں شانتا کا خالہ کے گھر جا کر طاعون سے مرنا، اس کے گھر والوں کا اس کی آخری رسومات میں شریک نہ ہونا، پولیس کو دیکھ کر گھبرانا اور سب سے بڑھ کر آنند لعل کا بچی کا دبوچ کر بیٹھک سے باہر لے جانا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ نہیں چاہتا ہوگا کہ ہماری نظر کپڑوں پر پڑے۔

یہ ساری باتیں ایسی تھیں کہ ذرا سی بھی عقل رکھنے والا تفتیشی افسر انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ وہاں سے ہم تھانے واپس آ گئے۔ تھانے سے کچھ ہی فاصلے پر مجھے رہائش کے لیے ایک چھوٹا سا مکان ملا ہوا تھا۔ یہ سرکاری تھا۔ شام کو جب میں گھر لیٹا آرام کر رہا تھا تو تھانے سے ایک کانسٹیبل آ گیا۔ میں نے اپنے سارے سٹاف سے کہہ رکھا تھا کہ کوئی ایمرجنسی ہو یا کوئی ضروری مسئلہ ہو تو وہ آدھی رات کو بھی مجھے جگا لیا کریں۔

کانسٹیبل نے بتایا کہ ایک سکھ آپ سے ملنا چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کے پاس آپ کے لیے ایک ضروری اطلاع ہے۔ میرے ذہن میں فوراً نشان سنگھ کا چہرہ گھوم گیا۔ میں نے کانسٹیبل سے پوچھا کہ اس سکھ کا نام کیا ہے تو کانسٹیبل نے میرے ذہن میں ابھرنے والے خیال کی تصدیق کر دی۔ مجھ سے ملنے کے لیے آنے والا سکھ نشان سنگھ ہی تھا۔ میں اسی وقت کانسٹیبل کے ساتھ تھانے کی طرف چل پڑا۔ تھانے پہنچے تو نشان سنگھ میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے چہرے جوش سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کوئی اہم خبر لایا ہے۔

میں نے اسے اپنے کمرے میں بٹھا لیا۔ اس نے جو معلومات حاصل کی تھیں وہ مجھے سنا دیں۔ وہ بڑی اہم اطلاع لے کر آیا تھا۔ اس کی باتیں سن کر میرا دماغ روشن ہو گیا۔ اس سے پہلے میں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا۔ نشان سنگھ نے جو بات سنائی وہ میں اپنے الفاظ میں سنا دیتا ہوں۔

نشان سنگھ کی بیوی بڑی تیز طرار اور زندہ دل عورت تھی۔ نشان سنگھ نے اس سے بات کی تو اس نے کہا یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ وہ اسی وقت شانتا کی ایک سہیلی کے گھر چلی گئی۔ شانتا اور

اس لڑکی میں بڑی گہری دوستی تھی۔ نشان سنگھ کی بیوی کا شانتا کی اس سہیلی کے گھر آنا جانا تھا۔ نشان سنگھ کی بیوی نے باتوں باتوں میں شانتا کی باتیں شروع کر دیں۔ شانتا کی یہ سہیلی مسلمان تھی اور اس کا نام سعیدہ تھا۔

شانتا کا ذکر سن کر سعیدہ جذباتی ہو گئی اور خود ہی اس کی باتیں کرنے لگی۔ باتوں باتوں میں نشان سنگھ کی بیوی نے بڑی استادی سے گفتگو کا رخ اس کی اور شانتا کی آخری ملاقات کی طرف موڑ دیا جس دن وہ اپنی خالہ کے ساتھ گئی تھی۔

''مجھے کہہ کر گئی تھی کہ ایک ہفتے بعد واپس آ جاؤں گی۔'' سعیدہ نے نشان سنگھ کی بیوی کو بتاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اسے واپس آنا نصیب ہی نہ ہوا۔''

''جس دن وہ گئی تھی، سنا ہے بڑی پیاری لگ رہی تھی۔'' نشان سنگھ کی بیوی نے کہا۔ ''اس نے کون سے کپڑے پہنے ہوئے تھے؟''

سعیدہ نے اسے بتایا کہ شانتا نے اس روز نیلے رنگ کی خانوں والی نئی سفید ساڑھی پہنی تھی۔ یہ ساڑھی اس پر بہت جچ رہی تھی۔

''اب تو شانتا مر گئی ہے۔'' سعیدہ نے نشان سنگھ کی بیوی سے کہا۔ ''اس لیے یہ بات بتانے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ شانتا نے اپنا یہ راز صرف مجھے بتایا تھا۔ وہ ایک مسلمان لڑکے کو پسند کرتی تھی اور اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی۔ اس لڑکے کا نام اکبر ہے اور وہ ساتھ والے گاؤں کے ایک خوشحال خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر وہ مر نہ جاتی تو اس نے گھر سے بھاگ جانا تھا اور مسلمان ہو کر اکبر سے شادی کر لینی تھی۔''

اس کے علاوہ بھی بہت سی باتیں تھیں لیکن وہ میں یہاں بیان کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ ان معلومات کی روشنی میں مجھے صاف نظر آنے لگا تھا کہ کنوئیں سے بوری میں بند بے سر کی لاش شانتا کی ہے اور اسے اس کے بھائیوں نے قتل کیا ہے یا اس قتل میں ان کا ہاتھ ضرور ہے۔ یہ محض اتفاق بھی ہو سکتا تھا کہ شانتا نے اسے روز ویسی ہی ساڑھی پہنی ہوئی تھی جیسی مقتولہ کی لاش سے ملی تھی۔ ویسے بھی اس قسم کی باتوں سے کسی کے خلاف عدالت میں جرم ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے شانتا کی سہیلی سے ملنا ضروری سمجھا۔ اس سے بہت کام کی باتیں معلوم ہو سکتی تھیں۔ میں نے نشان سنگھ کو شاباش دی اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ نشان سنگھ خوش ہو گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں شانتا کی سہیلی سعیدہ سے ملنا چاہتا ہوں اور وہ اس سلسلے میں میری مدد کرے۔ نشان سنگھ نے کہا کہ اس کی بیوی کا سعیدہ کے ہاں آنا جانا ہے اور وہ کل صبح کسی بہانے سے اسے

اپنے گھر بلا لے گی۔

میں چاہتا تو سعیدہ کو تھانے بلا کر بھی اپنا کام نکال سکتا تھا لیکن یہ میں نے مناسب نہ سمجھا کہ ایک شریف مسلمان لڑکی کو تھانے بلاؤں۔ میں نے نشان سنگھ سے کہا کہ کل صبح گیارہ بجے میں بغیر وردی اس کے گھر آؤں گا، وہ اپنی بیوی سے کہہ دے کہ سعیدہ کو بلا کر رکھے۔

میں نے نشان سنگھ کو بھیج دیا اور خود گھر آ کر سو گیا۔

چھلے کا بھید

اگلے دن میں نے جوگندر پال کو ساتھ لیا اور ہم نشان سنگھ کے گھر چلے گئے۔ ہم دونوں سادہ کپڑوں میں تھے۔ اگر وردی میں جاتے تو لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے اور خواہ مخواہ لوگ اکٹھے ہو جاتے۔ میں وہاں تماشہ نہیں بنانا چاہتا تھا۔ نشان سنگھ نے ہمیں اپنی بیٹھک میں بٹھایا۔ اس نے بتایا کہ اس کی بیوی سعیدہ کو لے آئی ہے اور اسے سمجھا دیا ہے کہ تھانیدار صاحب اس سے شانتا کے متعلق کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ نشان سنگھ نے یہ بھی بتایا کہ پہلے تو سعیدہ مان ہی نہیں رہی تھی لیکن جب اسے بتایا گیا کہ تھانیدار اسے تھانے میں بلا سکتا ہے تو وہ مان گئی۔

میں نے نشان سنگھ سے کہا کہ وہ سعیدہ کو اندر بھیج دے۔ تھوڑی دیر بعد ایک جوان لڑکی اندر آئی۔ اس کے پیچھے نشان سنگھ کی بیوی بھی تھی۔ لڑکی کے چہرے پر گھبراہٹ صاف نظر آ رہی تھی۔ میں نے اسے بیٹھنے کو کہا۔ سعیدہ کی عمر اٹھارہ انیس سال کے لگ بھگ ہو گی۔ وہ درمیانی سی شکل و صورت والی قبول صورت لڑکی تھی۔ میں نے اس کی گھبراہٹ اور جھجک دور کرنے کے لیے اس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ ذرا ہی دیر میں اس کا خوف دور ہو گیا اور وہ کھل کر باتیں کرنے لگی۔ میں مقتولہ کی ساڑھی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

"یہ ساڑھی غور سے دیکھو۔" میں نے اسے کہا۔ "اور بتاؤ کہ جس دن شانتا اپنی خالہ کے ساتھ گئی تھی، کیا اس نے یہی ساڑھی پہنی ہوئی تھی؟"

سعیدہ نے ساڑھی کو میرے ہاتھ سے لے کر بڑے غور سے دیکھا۔ کچھ دیر وہ دیکھتی رہی۔

"میرا خیال ہے شانتا نے بالکل ایسی ہی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔" سعیدہ نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"خوب غور کر کے دیکھو۔" میں نے سعیدہ سے کہا۔ "خیال کی بجائے پورے یقین سے بات کرو۔" اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی جیب سے وہ چھلا نکالا جو مقتولہ کی لاش کے بائیں

ہاتھ کی انگلی سے اتارا تھا۔ میں نے وہ چھلا اس کے سامنے رکھ کر کہا۔ "اسے پہچانتی ہو؟"

چھلے کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی اور اس نے ہاتھ بڑھا کر چھلا اٹھا لیا اور اُلٹ پلٹ کر غور سے دیکھنے لگی۔

"یہ آپ کو کہاں سے ملا ہے؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تم پہلے میرے سوال کا جواب دو۔" میں نے اس سے کہا۔ "اس چھلے کو پہچانتی ہو؟"

"یہ...... یہ تو شانتا کی انگلی میں تھا۔" سعیدہ نے کہا اور پوچھا۔ "آپ کے پاس کیسے آ گیا؟"

"تمہیں پورا یقین ہے کہ یہ شانتا کی انگلی میں تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جی!" اس نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "یہ چھلا اسے......"

وہ آگے کچھ کہتی کہتی رک گئی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھ سے کچھ چھپانا چاہتی تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس سے صاف بات کروں گا تا کہ جو کچھ وہ مجھ سے چھپا رہی ہے، کھل کر بتا دے۔

"دیکھو، سعیدہ!" میں نے اسے کہا۔ "مجھے شک ہے کہ تمہاری سہیلی کو قتل کیا گیا ہے۔ میں اس کے قاتل کو پکڑنا چاہتا ہوں۔ اگر تم مجھ سے کچھ چھپاؤ گی تو میں قاتل کو نہیں پکڑ سکوں گا۔ مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ اور قاتل کو پکڑنے میں میری مدد کرو۔"

وہ میری بات سن کر بڑی حیران نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کے انداز میں بے یقینی صاف نظر آ رہی تھی۔

"وہ تو پلیگ سے مر گئی تھی جی!" اس نے کہا۔ "اس کی خالہ کا خط آیا تھا۔"

میں نے اسے کنوئیں سے ملنے والی لاش کے متعلق بتایا پھر اس سے ملنے والی ساڑھی اور چھلے کے متعلق بتایا۔ میری بات سن کر وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"یہ چھلا شانتا کا ہی ہے۔" سعیدہ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "اب مجھے یقین یقین ہو گیا ہے کہ یہ ساڑھی بھی شانتا کی ہی ہے...... یہ چھلا اسے اکبر نے دیا تھا۔"

"یہ اکبر کون ہے؟"

"ساتھ والے گاؤں کا لڑکا ہے۔" سعیدہ نے کہا۔ "شانتا اور اس کی محبت تھی، وہ چھپ چھپ کر ملتے تھے۔ دونوں شادی کرنا چاہتے تھے لیکن مذہب کی دیوار ان کے راستے میں حائل تھی۔ جس دن اکبر نے شانتا کو چھلا دیا تھا اسی دن اس نے مجھے دکھایا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ نہیں چھپاتی تھی۔"

سعیدہ نے مجھے بڑی لمبی بات سنا دی۔ اس دوران کئی بار اس کے آنسو بھی نکل آئے۔ اس نے جو بات سنائی وہ میں مختصر کر کے آپ کو سنا دیتا ہوں۔ یہ تقریباً چھ ماہ پہلے کی بات تھی۔ گاؤں میں ایک مسلمان لڑکی کی شادی تھی۔ بارات ساتھ والے گاؤں سے آئی تھی۔ دلہا اکبر کا بڑا بھائی تھا۔ بارات دیکھنے کے لیے گاؤں کی لڑکیاں اور عورتیں باہر نکل آئی تھیں۔ شانتا بھی ان عورتوں میں شامل تھی۔ اسی موقع پر اکبر نے شانتا کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور وہ پہلی نظر کی محبت کا شکار ہو گئے۔

اس کے بعد اکبر ان کے گاؤں آتا جاتا رہا۔ اس کے بھائی کی سسرال وہاں تھی اور اس کے پاس بار بار آنے کا بڑا اچھا بہانہ موجود تھا۔ وہ ایک عورت کے ذریعے شانتا کو پیغام بھجوا دیتا۔ اس طرح ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ چلتا رہا اور عہد و پیمان ہوتے رہے۔ ان کی شادی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ لڑکی ہندو تھی اور لڑکا مسلمان۔ یہ تو آگ اور پانی کے ملاپ والی بات تھی۔ اکبر نے اپنے گھر بات کی تو اس کے باپ نے صاف انکار کر دیا۔ شانتا اکبر کی محبت میں مسلمان ہونے پر تیار تھی۔ اکبر نے اپنے باپ سے کہا کہ لڑکی مسلمان ہو جائے گی اس کا باپ پھر بھی نہ مانا۔ اس کے باپ کا کہنا تھا کہ ہندوؤں کو جب پتہ چلے گا کہ ایک ہندو لڑکی نے مسلمان ہو کر ایک مسلمان سے شادی کر لی ہے تو ہندو مسلم فساد ہو جائے گا۔

اکبر کے باپ کی سوچ بالکل ٹھیک تھی لیکن اکبر دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ وہ کسی قیمت پر پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔ کوئی راہ نہ پا کر انہوں نے گھروں سے بھاگنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن اس سے پہلے ہی شانتا مر گئی۔

''کیا شانتا کے بھائیوں کو اس کا علم تھا؟'' میں نے ساری بات سن کر سعیدہ سے سوال کیا۔

''دو مہینے پہلے انہیں پتہ لگ گیا تھا۔'' سعیدہ نے کہا۔ ''ان سے یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔''

''اس پر ان کا ردِعمل کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلے تو پیار سے سمجھاتے رہے۔'' سعیدہ نے کہا۔ ''پھر چھوٹے بھائی آنند لعل نے ایک دن اسے بہت مارا تھا۔ اس کے بعد شانتا بتاتی رہتی تھی کہ اکثر اس کے ساتھ مار پیٹ ہونے لگی ہے۔''

''کیا شانتا نے تمہیں کبھی بتایا تھا'' میں نے پوچھا ''کہ اس کے بھائیوں نے اسے قتل

کی دھمکی دی ہو؟''

''شانتا مجھ سے کچھ نہیں چھپاتی تھی۔'' سعیدہ نے کہا۔ ''ایک دن شانتا نے بتایا کہ آج اس کے بھائیوں نے اسے بہت مارا ہے۔ اس نے بتایا کہ آنند لعل نے تو اس کی گردن دونوں ہاتھوں میں دبا لی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ آج میں اس کا قصہ ہی ختم کر دیتا ہوں۔ شانتا کی آنکھیں باہر کو نکل آئیں تو بڑے بھائی مدن لعل نے اس کی گردن آنند لعل سے چھڑائی اور اسے سمجھانے لگا کہ اس کو مار کر تم خود بھی پھانسی چڑھ جاؤ گے۔ بڑے بھائی نے یہ بھی کہا کہ ہر کام کا ایک طریقہ ہوتا ہے...... اس دن شانتا بہت روئی تھی۔''

سعیدہ کے بیان سے میری تفتیش بہت آسان ہو گئی تھی۔ صاف نظر آنے لگا تھا کہ دونوں بھائیوں نے مل کر یا چھوٹے بھائی اکیلے نے شانتا کو قتل کیا ہے۔ تمام واقعاتی شہادتیں دونوں بھائیوں کے خلاف جا رہی تھیں۔ اب مدن لعل اور آنند لعل سے پوچھ گچھ کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے سعیدہ کا شکریہ ادا کیا اور اسے سمجھایا کہ اس نے جو باتیں مجھے بتائی ہیں وہ کسی کو پتہ نہ چلیں۔ اس کے بعد میں اور جوگندر پال وہاں سے آ گئے۔ جوگندر پال نے سعیدہ کا سارا بیان لکھ لیا تھا۔

16 جون کا چکر

سعیدہ کا بیان لینے میں بہت وقت لگ گیا تھا۔ میرا ارادہ وہاں سے سیدھا شانتا کے گھر جا کر اس کے بھائیوں سے پوچھ گچھ کرنے کا تھا لیکن جوگندر پال نے کہا کہ دونوں بھائیوں کو تھانے بلا کر پوچھ گچھ کی جائے تو بہتر ہو گا۔ مجھے جوگندر پال کی یہ تجویز اچھی لگی۔ تھانے کی اپنی ایک دہشت ہوتی ہے اور ملزم نروس ہو جاتا ہے۔

تھانے پہنچ کر میں نے کاغذی کارروائی کی۔ پھر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد میں نے ایک کانسٹیبل کو بڈیالہ گاؤں بھیجا کہ وہ شانتا کے بھائی آنند لعل کو بلا لائے۔ میں نے کانسٹیبل کو یہ بھی کہا کہ اسے کسی سے بات نہ کرنے دے اور سیدھا تھانے لے آئے۔ کانسٹیبل اسی وقت چلا گیا۔ میں تھانے کے دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ میں نے مقتولہ کی ساڑھی کو اب نمایاں جگہ رکھنے کی بجائے اپنی میز کی دراز میں رکھ لیا تھا۔ لاش کے ہاتھ سے ملنے والا چھلا میری جیب میں محفوظ تھا۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ کانسٹیبل آ گیا جسے میں نے آنند لعل کو لانے کے لیے بھیجا تھا۔ وہ آنند لعل کو لے آیا تھا۔ میں نے اسے آنند لعل کو اندر بھیجنے کو کہا۔ کانسٹیبل نے آنند لعل کو اندر بھیج

دیا۔ وہ اندر آیا تو میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ آنند لعل سے میری دوسری ملاقات تھی۔ آنند لعل خوبصورت جوان تھا۔ اس کا رنگ گورا تھا اور چہرے کے نقش تیکھے تھے۔ یہ لوگ ہندو راجپوت تھے۔ یہ عام ہندوؤں کی طرح بزدل، موٹے اور پلپلے جسم کے مالک نہیں ہوتے تھے۔ عزت غیرت کے معاملے میں قتل تک کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔

میں نے اس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی دو چار باتیں کیں اور پھر باتوں کو شانتا کی موت کی طرف لے آیا۔ باتوں باتوں میں، میں نے مقتولہ کی ساڑھی دراز سے نکالی اور آنند لعل کے آگے پھینک دی۔ آنند لعل آگے کو جھک کر دونوں ہاتھ میز پر رکھے بیٹھا ہوا تھا۔ ساڑھی اس کے ہاتھوں کے پاس گری تو وہ یوں بدک کر پیچھے ہٹا جیسے میں نے ساڑھی نہ پھینکی ہو، کوئی زہریلا سانپ اس کی طرف پھینکا ہو۔ میں نے دیکھا، وہ خوفزدہ نظروں سے ساڑھی کو گھور رہا تھا۔

''یہ شانتا کی ساڑھی ہے نا!'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''ہاں ..ہی...... ن نہیں جی!'' اس نے بوکھلا کر کہا۔ ''مجھے کیا معلوم یہ کس کی ساڑھی ہے۔''

''اس دن شانتا نے یہی ساڑھی پہنی ہوئی تھی؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

وہ کوئی جواب دینے کی بجائے ہونقوں کی طرح میرا منہ دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا اتنے اچھے صحت مند جوان کا رنگ دق کے مریضوں کی طرح پیلا پڑ گیا تھا۔ میں نے اپنا سوال دہرایا اور ذرا سختی سے اسے جواب دینے کو کہا۔

''ساڑھی تو ایسی ہی تھی۔'' اس نے بڑی مشکل سے کہا۔ ''وہ تو دوسرے شہر خالہ کے گھر چلی گئی تھی، یہ ساڑھی آپ کو کہاں سے ملی؟''

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا، بس اسے گھورتا رہا۔

''شانتا کی موت کی اطلاع کیسے ملی تھی؟'' میں نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

''خالہ نے خط لکھا کہ شانتا مر گئی ہے۔'' آنند لعل نے کہا۔ اب وہ تھوڑا سا سنبھل گیا تھا۔

''وہ خط کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''خط میں نے سنبھال کر رکھا ہے۔'' آنند لعل نے کہا۔ ''میرے صندوق میں پڑا ہے۔''

میں نے خط کو قبضے میں لینا ضروری سمجھا اور اسی وقت ایک کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ وہ آنند لعل کے گھر جائے اور اس کی بھابی سے کہے کہ آنند لعل نے صندوق میں رکھا ہوا وہ خط منگوایا

ہے جس میں شانتا کی موت کی اطلاع ہے۔ آنند لعل نے بھی کانسٹیبل کو خط کے متعلق سمجھا دیا۔ کانسٹیبل اسی وقت چلا گیا۔

''سنا ہے شانتا ایک مسلمان سے شادی کرنا چاہتی تھی؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا تمہیں معلوم ہے؟''

''یہ غلط بات ہے۔'' اس نے تڑپ کر کہا۔ ''ہماری بہن ایسی نہیں تھی۔''

''یہ بالکل صحیح ہے۔'' میں نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔ ''تم اسے اس بات پر مارتے پیٹتے رہتے تھے اور جب وہ کسی بھی طرح نہ مانی تو تم نے اسے قتل کر دیا۔''

میری بات سن کر وہ قسمیں کھا کھا کر اور اچھل اچھل کر انکار کرنے لگا۔

''شانتا کا سر کہاں ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور آگے کو جھک کر اس سے پوچھا۔

اس کا رنگ بحال ہونا شروع ہو گیا تھا لیکن میری بات سن کر لاش کی طرح سفید پڑ گیا اور آنکھیں باہر نکل آئیں۔ اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر اس سے بولا نہ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اب ٹوٹ گیا ہے اور اقبالی بیان دے دے گا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اس پر اور دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔

''قتل تم نے اکیلے کیا تھا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔ ''یا دونوں بھائیوں نے مل کر قتل کیا تھا؟''

وہ کچھ بھی نہ بولا، بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اقبالی بیان دے دے تو میں اس کی مدد کروں گا اور کم سے کم سزا دلاؤں گا۔ ابھی میں اسے اقبالی بیان کے لیے زور دے رہا تھا کہ وہ کانسٹیبل واپس آ گیا جو آنند لعل کے گھر سے خط لینے گیا تھا۔ وہ خط لے آیا تھا۔ میں نے خط کھول کر پڑھا۔ آج اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد مجھے خط کی تحریر پوری طرح یاد نہیں رہی۔ کچھ اس قسم کا مضمون تھا کہ ہمارے علاقے میں پلیگ کی وبا پھیل گئی ہے۔ شانتا کو پلیگ نے پکڑ لیا تھا اور اس کا دیہانت ہو گیا ہے۔ آپ سب لوگ آ جاؤ۔ گاؤں والوں کے اصرار پر میں اس کا کریا کرم جلدی کرنے پر مجبور ہوں، مجھے شما کر دینا۔ آگے خالہ کا نام لکھا تھا جو مجھے آج بھی یاد ہے۔ اس کا نام تھا، رام پیاری۔

میں نے اس بات کی بھی تصدیق کرنی تھی کہ یہ خط واقعی شانتا کی خالہ نے لکھا ہے۔ میں نے لفافہ دیکھا تو اس پر اس شہر کی مہر لگی ہوئی تھی جہاں خالہ رہتی تھی۔ مہر کے ساتھ تاریخ بھی

لکھی تھی۔ میں نے تاریخ دیکھی تو وہ 16 جون لکھی تھی۔ میں نے ایک خیال کے تحت آنند لعل سے پوچھا کہ شانتا کس تاریخ کو خالہ کے گھر گئی تھی۔ خط کی وجہ سے آنند لعل کچھ حوصلے میں نظر آ رہا تھا۔

''وہ سولہ تاریخ کو گئی تھی؟'' اس نے انگلیوں پر حساب لگا کر بتایا۔

''شانتا وہاں جا کر کتنے دنوں بعد مر گئی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''دو دن وہ وہاں بالکل ٹھیک رہی تھی۔'' آنند لعل نے کہا۔ ''پھر تیسرے دن وہ مر گئی تھی۔''

اس کے جواب سے خط کا فراڈ ہونا ثابت ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ شانتا سولہ تاریخ کو خالہ کے گھر گئی تھی جبکہ جس خط میں شانتا کی موت کی اطلاع لکھی گئی تھی وہ بھی سولہ تاریخ کو وہاں سے پوسٹ ہوا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اب مجھے شک ہونے لگا تھا کہ خالہ بھی قتل کی اس سازش میں شریک ہے۔ اس خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ شانتا کو سولہ تاریخ کو ہی قتل کر دیا گیا تھا اور اسی دن خط بھی پوسٹ کر دیا گیا تھا۔ یہاں قاتلوں سے غلطی ہو گئی تھی۔

میں ٹہلتے ٹہلتے آنند لعل کے قریب کھڑا ہو گیا اور لفافے کا مہر والا حصہ اوپر کر کے اس کے سامنے رکھ دیا۔ میں نے انگلی رکھ کر اسے مہر دکھائی۔ وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اسے کہا کہ تاریخ پڑھو۔

''اب بتاؤ'' میں نے کہا۔ ''تم کہتے ہو کہ شانتا سولہ تاریخ کو یہاں سے گئی تھی اور تیسرے دن مر گئی تھی۔ یہ خط بھی سولہ تاریخ کو لکھا گیا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جس دن وہ یہاں سے گئی اسی دن اس کے مرنے کی اطلاع بھی ڈاک سے بھیج دی گئی ہو۔''

''وہ جی مجھ سے غلطی ہو گئی ہو گی۔'' اس نے گڑبڑا کر کہا۔ ''میرے خیال میں شانتا بارہ تاریخ کو گئی تھی، مجھے یاد نہیں رہا۔''

مجھے اس پر بڑا غصہ آیا۔ وہ مجھے چکر دینے کے لیے جھوٹ پر جھوٹ بول رہا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر ایسا زوردار تھپڑ مارا کہ وہ کرسی سمیت اُلٹ کر پیچھے کر جا گرا۔ اس کی ٹانگیں اوپر ہو گئیں۔ وہ ابھی اٹھ ہی رہا تھا کہ میں نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے اور اوپر کو کھینچے۔ وہ تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے دھکا دے کر اسے دیوار کے ساتھ لگا دیا۔

''اب مجھے چکر دینے کی کوشش کی تو اُلٹا لٹکا دوں گا۔'' میں نے اس سے کہا۔ ''جلدی بتاؤ شانتا کو تم نے قتل کیا تھا یا مدن لعل نے......؟ یا تم دونوں بھائیوں نے مل کر یہ کام کیا ہے؟''

''قتل میں نے کیا تھا۔'' آنند لعل نے کہا۔

''مدن لعل بھی تمہارے ساتھ تھا؟''

''مدن بھائی نے کچھ نہیں کیا تھا۔'' آنند لعل نے کہا۔ ''شانتا کو میں نے مارا تھا۔''

''کیوں مارا تھا؟''

''غیرت کی بات تھی۔'' آنند لعل نے نظریں جھکا کر کہا۔

''صاف صاف بتاؤ'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''گول مول باتیں نہ کرو۔''

''وہ ایک مسلمان سے ملتی تھی۔'' آنند لعل نے بدستور نظریں نیچی کیے ہوئے کہا۔ ''وہ اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی...... آپ خود ہی سوچیں، وہ اپنا دھرم بھرشٹ کر رہی تھی۔''

میں نے آنند لعل سے کہا کہ وہ اپنا بیان پوری تفصیل سے دے۔ آنند لعل سے بیان لینے سے پہلے میں نے اپنے اے ایس آئی جوگندر پال کو کہا کہ وہ دو کانسٹیبل ساتھ لے کر جائے اور آنند لعل کے بڑے بھائی مدن لعل کو تھانے لے آئے۔ میں نے اسے دکان کا پتہ سمجھا دیا جو مجھے آنند لعل نے بتایا تھا۔ جوگندر پال اسی وقت چلا گیا۔

خدا دیکھ رہا تھا

آنند لعل نے بڑا لمبا بیان دیا جو میں آپ کو مختصر کر کے اور غیر ضروری تفصیلات حذف کر کے سنا رہا ہوں۔ اس دوران جہاں ضرورت پڑی میں اس سے سوال بھی کرتا رہا۔ اس طرح جو بات سامنے آئی وہ پیش ہے۔

یہ لوگ ہندو راجپوت تھے اور ان کے باپ کی پرچون کی دکان تھی۔ دونوں بھائی بہن سے بڑے تھے۔ بڑے بھائی مدن کی شادی کے ڈیڑھ سال بعد ان کا باپ ہیضے کے مرض میں مبتلا ہو کر مر گیا تھا۔ ان کی ماں کو ٹی بی کا مرض تھا جس کا خاطر خواہ علاج نہیں کرایا گیا تھا۔ اس لیے وہ زیادہ تر چارپائی پر ہی پڑی رہتی تھی۔

شانتا گھر بھر کی لاڈلی تھی اور سب ہی اس سے پیار کرتے تھے۔ وہ جب بڑی ہوئی تو بہت خوبصورت نکلی۔ زیادہ لاڈ پیار کی وجہ سے وہ کچھ خودسر اور ضدی ہو گئی تھی۔ ہندو ہونے کی وجہ سے اس پر ایسی کوئی پابندی نہیں تھی کہ وہ پردہ کرے اور باہر نہ نکلا کرے۔ وہ بڑی آزادی سے گاؤں بھر میں پھرتی تھی۔ اس کا زیادہ میل ملاپ ایک مسلمان لڑکی سعیدہ کے ساتھ تھا جسے دونوں بھائی پسند نہیں کرتے تھے لیکن وہ شانتا کا دل نہیں توڑنا چاہتے تھے۔ اس لیے برداشت کر لیتے تھے۔

پھر شانتا کی ملاقات اکبر سے ہو گئی۔ اکبر اس دور کے معیار کے مطابق صحت مند اور

خوبرو جوان تھا۔ پہلی نظر میں وہ شانتا کے دل میں اُتر گیا۔ دونوں میں ملاقاتیں شروع ہوگئیں۔ گاؤں میں کسی کا راز، راز نہیں رہتا۔ آہستہ آہستہ یہ بات پھیلنے لگی اور دونوں بھائیوں کے کانوں تک جا پہنچی۔ انہوں نے شانتا سے پوچھا تو اس نے اعتراف کرلیا کہ یہ بات سچ ہے اور وہ اس مسلمان لڑکے سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ دونوں بھائیوں نے اسے پیار سے سمجھایا کہ وہ یہ خیال دل سے نکال دے۔ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ مگر شانتا اپنے ارادے پر ڈٹی رہی اور اکبر سے ملنے سے باز نہ آئی۔

اس بات پر اسے مارا پیٹا بھی گیا لیکن وہ کچھ سمجھنے کے لیے تیار نہ تھی۔ ایک روز غصے میں آ کر آنند لعل نے اس کا گلا گھونٹ کر مارنے کی کوشش بھی کی لیکن بڑے بھائی مدن لعل نے شانتا کو چھڑا دیا۔ مدن لعل ٹھنڈے دل و دماغ کا آدمی تھا۔ نوجوان ہونے کی وجہ سے آنند لعل بڑا غصیلا اور ہتھ چھٹ تھا لیکن مدن لعل اسے قابو کیے رکھتا تھا۔

دونوں بھائی اس مسئلے کے حل کے لیے سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ان کی پورے گاؤں میں بدنامی ہو رہی تھی۔ لوگ منہ پر تو کچھ نہیں کہتے تھے لیکن پیٹھ پیچھے بڑی شرمناک باتیں کرتے تھے۔ انہوں نے یہ بھی سوچا کہ اکبر کو ہی غائب کر دیا جائے تو مسئلہ حل ہو جائے گا لیکن مدن لعل نے یہ تجویز یہ کہہ کر رد کر دی یہ بات سب کو معلوم ہے۔ پولیس کا شک سیدھا ان پر آئے گا۔

سوچ سوچ کر انہوں نے یہی فیصلہ کیا کہ اگر شانتا کسی طریقے سے نہ مانی تو اسے کسی ایسے طریقے سے مار دیا جائے کہ کسی کو شک بھی نہ ہو۔ انہی دنوں ان کی خالہ ان کے گھر آئی ہوئی تھی۔ وہ اپنی بہن کی بیمار پُرسی کے لیے آئی تھی۔ یہیں سے مدن لعل کے دماغ میں ایک خیال ابھرا اور اس نے یہ منصوبہ آنند لعل کو بتایا تو آنند لعل اس سے متفق ہوگیا۔

چند دن بعد ان کی خالہ نے واپس جانا تھا۔ آنند لعل نے شانتا سے کہا کہ وہ خالہ کے ساتھ چلی جائے اور دو چار دن وہاں رہ آئے۔ شانتا یہ سن کر بہت خوش ہوئی اور خالہ کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوگئی۔

منصوبے کے مطابق خالہ کی واپسی کے دن دونوں بھائی خالہ کو سٹیشن تک چھوڑنے کے لیے ساتھ چل پڑے۔ سٹیشن وہاں سے خاصا دور تھا۔ انہوں نے دو گھوڑیاں لے لیں۔ ایک پر خالہ کو اور دوسری پر شانتا کو بٹھایا اور چل پڑے۔ راستہ بعض جگہ سے بالکل سنسان اور اجاڑ تھا۔ ریلوے سٹیشن پر پہنچ کر طے شدہ پروگرام کے مطابق مدن لعل نے خالہ سے کہا کہ وہ شانتا کو ساتھ نہ لے جائے۔ بہانہ یہ بنایا کہ اسے خیال نہیں رہا تھا کہ اس کی یعنی مدن لعل کی بیوی اپنی

ماں کے گھر رہنے کے لیے چلی گئی ہے اور وہ ایک ہفتے بعد آئے گی۔ گھر میں ماں کو سنبھالنے والا کوئی نہیں ہے۔

دونوں بھائیوں نے اصرار کر کے شانتا کو اور اپنی خالہ کو اس بات پر رضامند کرلیا۔ شانتا بھی بھائیوں کی ہاں میں ہاں ملانے لگی۔ گاڑی شام کے چھ بجے آئی۔ انہوں نے خالہ کو گاڑی میں سوار کرا کے رخصت کر دیا اور شانتا کو گھوڑی پر بٹھا کر واپس چل پڑے۔ منصوبے کے مطابق انہوں نے ایسا راستہ اختیار کیا جو نسبتاً زیادہ ویران اور جنگلاتی تھا۔ شانتا نے پوچھا تو اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ یہ مختصر راستہ ہے، جلدی گاؤں پہنچ جائیں گے۔

جب وہ مقرر کردہ جگہ پہ پہنچے تو مدن لعل نے، جو شانتا والی گھوڑی کی لگام پکڑے ہوئے تھا، شانتا سے کہا کہ وہ ذرا نیچے اُتر آئے، آگے اترائی ہے کہیں وہ گھوڑی سے گر نہ پڑے۔ گرمیوں کی وجہ سے شام جلدی نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے چھ بجے سے اوپر وقت ہونے کے باوجود ابھی دن کی ہلکی ہلکی روشنی باقی تھی۔ شانتا نہیں جانتی تھی کہ اس کے جان سے زیادہ چاہنے والے بھائی اس کی جان کے دشمن بن چکے ہیں۔ اپنے انجام سے بے خبر، وہ بڑے اطمینان سے نیچے اُتر آئی۔ آنند لعل ان کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ اس نے اپنی کمر پر بندھے تھیلے سے تیز دھار ٹوکہ نکالا اور پیچھے سے شانتا کی گردن پر زوردار وار کیا۔ شانتا کی گردن آدھی کٹ گئی۔ اسے ہائے کرنے کا موقع بھی نہ ملا اور وہ وہیں گر پڑی۔

آنند لعل نے دوسرا وار کیا تو سر صاف کٹ کر الگ ہوگیا۔ وہ دونوں وہیں کھڑے اپنی بہن کا خون مٹی میں ملتا دیکھتے رہے۔ جب خون بہنا بند ہوگیا تو انہوں نے گھوڑی پر ڈالی ہوئی بوری اتاری اور شانتا کی سر بریدہ لاش بوری میں ڈال کر بوری کا منہ بند کر دیا۔ جس جگہ انہوں نے ساری کارروائی کی تھی وہاں سے دن کے وقت بھی اکا دکا لوگ ہی گزرتے تھے۔ شام کے وقت تو کسی کی آمد کا رتی بھر امکان نہ تھا۔

اس لیے انہیں اطمینان سے ساری کارروائی پوری کرنے کا موقع مل گیا۔

انہوں نے راستے سے ہٹ کر جھاڑیوں اور سرکنڈوں کے درمیان ایک موزوں جگہ پر خاصا گہرا گڑھا کھودا۔ اس گڑھے میں شانتا کا سر اور ٹوکہ دبانے کے بعد انہوں نے مٹی ڈال کر گڑھے کا منہ بند کر دیا اور زمین اچھی طرح ہموار کر دی۔ گڑھے سے نکلنے والی جو مٹی باقی بچ گئی تھی، وہ انہوں نے جائے قتل پر پھیلے خون پر پھیلا کر دھبوں کو چھپا دیا۔

انہیں پتہ تھا کہ یہاں کچھ دور ایک خشک کنواں ہے۔ وہ شانتا کی لاش والی بوری گھوڑی

پر رکھ کر کنوئیں تک لے گئے اور پھر بوری کنوئیں میں پھینک دی۔ وہاں سے وہ ایک قریبی نالے پر گئے اور اپنے ہاتھ پاؤں اچھی طرح دھوئے تاکہ اگر اتفاقیہ خون کا کوئی داغ ان کے جسم پر رہ گیا ہو تو دور ہو جائے۔ سارا کام ان کے منصوبے کے مطابق بڑی صفائی اور تیزی سے مکمل ہو گیا۔

لاش ٹھکانے لگانے کے بعد مدن لعل دونوں گھوڑیاں لے کر گاؤں کی طرف چل پڑا اور آنند لعل ریلوے اسٹیشن کی طرف۔ آنند لعل نے وہاں سے اس شہر کا ٹکٹ لیا جہاں کے ایک گاؤں میں اس کی خالہ رہتی تھی۔ اگلی گاڑی پر وہ وہاں پہنچ گیا۔ وہاں اُتر کر وہ خالہ کے گاؤں چلا گیا اور پہلے سے لکھا ہوا خط اس نے گاؤں والے لیٹر بکس میں ڈال دیا۔ یہ وہی خط تھا جس میں یہ اطلاع لکھی تھی کہ شانتا طاعون کی وجہ سے مر گئی ہے۔

خط پوسٹ کر کے آنند لعل اسی روز رات تک واپس پہنچ گیا۔ پھر جب دو تین دنوں بعد وہ خط انہیں ملا تو انہوں نے سارے گاؤں میں اس خط کی تشہیر کی اور شانتا کا باقاعدہ ماتم بھی کیا۔ کسی کو شک تک نہ ہوا کہ وہ اپنی بہن کو ایک مسلمان سے محبت کرنے کے جرم میں ٹھکانے لگا چکے ہیں۔ وہ دونوں بالکل مطمئن تھے۔ وہ اپنے جرم کے سارے ثبوت وشواہد مٹا چکے تھے...... لیکن خدا دیکھ رہا تھا۔

آلۂ قتل اور سر

اس کے بعد کے واقعات آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔ میں ان دونوں بھائیوں کی ذہانت پر حیران تھا۔ انہوں نے بڑی عقلمندی سے سارا منصوبہ تیار کیا تھا اور پھر اس پر اتنی ہی عقلمندی سے عمل بھی کیا تھا لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ خدا دیکھ رہا تھا۔ خط کے معاملے میں آنند لعل سے غلطی ہو گئی اور اس نے تاریخ کا خیال نہ رکھا۔

میں نے فوری طور پر آنند لعل کی تحریر کا ایک نمونہ حاصل کیا اور اسے خط کے ساتھ ملا کر دیکھا۔ دونوں تحریریں بالکل ایک جیسی تھیں۔ یہ خط میں نے عدالت میں پیش کرنا تھا۔ آنند لعل کے بیان پر اس کے دستخط کرانے کے بعد میں نے اسے حوالات میں بند کر دیا۔ اب مجھے جوگندر پال کا انتظار تھا جسے گئے کافی دیر ہو گئی تھی۔

مزید آدھا گھنٹہ گزرا ہو گا جب جوگندر پال مدن لعل کو لے کر آ گیا۔ اس نے مدن لعل کو ہتھکڑی نہیں لگائی تھی۔ میں نے اسے آنند لعل کے بیان کے بارے میں بتایا اور اسے کہا کہ وہ

بھی بلاچوں وچرا بیان دے دے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ آنند لعل واقعی اقبالِ جرم کر چکا ہے۔ میں نے ایک کانسٹیبل سے کہا کہ اسے ساتھ لے جا کر حوالات میں بند اس کا بھائی دکھا دو اور ان کو آپس میں کوئی بات نہ کرنے دینا۔

کانسٹیبل نے میری ہدایات پر عمل کیا اور مدن لعل کو حوالات میں بند آنند لعل سے ملوا کر واپس لے آیا۔

''اب کیا کہتے ہو؟'' میں نے اس سے کہا۔ ''بیان دو گے یا نہیں؟''

''میں بیان دے دوں گا'' مدن لعل نے کہا۔ ''آپ آنند کو چھوڑ دیں۔ میں سارا الزام اپنے سر لینے کو تیار ہوں۔''

میں نے اسے کہا کہ وہ پہلے بیان دے اس کے بعد میں دیکھوں گا کہ کیا ہو سکتا ہے۔ اس نے بھی آنند لعل کی طرح بیان دے دیا۔ اس کے بیان سے آنند لعل کے بیان کی تصدیق ہوتی تھی۔ اب مجھے شانتا کے سر اور آلۂ قتل کی برآمدگی کرنا تھا۔ اس کے لیے دو معزز گواہوں کی ضرورت تھی۔ میں نے جوگندر پال سے کہا کہ وہ فوری طور پر بڈیالہ گاؤں کے نمبردار اور ایک اور معزز آدمی کو لے آئے۔

میں نے دونوں بھائیوں کو حوالات سے نکلوا کر ہتھکڑیاں لگوائیں اور جائے واردات پر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ ایک کانسٹیبل نے آ کر مجھے بتایا کہ آنند لعل میرے ساتھ کوئی بات کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے بلوالیا۔ کانسٹیبل اسے لے کر آیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ اس نے بھی وہی بات کہی جو اس سے پہلے مدن لعل کہہ چکا تھا۔ اس نے کہا کہ اس کا بڑا بھائی شادی شدہ ہے اور ایک بچی کا باپ بھی ہے۔ وہ قتل کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لے گا اور میں اس کے بھائی کو اس کیس سے نکال دوں۔

سچ پوچھیں تو مجھے ان دونوں بھائیوں سے ذرا بھی ہمدردی نہیں تھی۔ جس طرح انہوں نے اپنی معصوم بہن کو قتل کیا تھا، اس سے میرے دل میں ان کے خلاف نفرت بھر گئی تھی۔ میں نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں قانون کے تقاضے پورے کروں گا۔ تھوڑی دیر بعد جوگندر پال، نمبردار اور ایک معزز آدمی کو لے کر آ گیا۔ میں نے دونوں ملزموں کو ساتھ لیا اور ہم ان کی رہنمائی میں جائے واردات کی طرف چل دیئے۔ ہم نے دو تانگے منگوا لیے تھے۔

اب رات ہو رہی تھی لیکن میں ارادہ کیے ہوئے تھا کہ اس کیس کو آج ہی نمٹا کر چھوڑوں گا۔ اس کیس میں مجھے زیادہ تفتیش نہیں کرنی پڑی تھی۔ قدرت نے میری مدد کی تھی اور اتفاقاً

مجھے کچھ ایسی باتوں کا علم ہو گیا جن کی وجہ سے تفتیش آسان ہو گئی۔

جائے واردات کے پاس پہنچ کر آنند لعل اور مدن لعل وہ جگہ ڈھونڈنے لگے جہاں انہوں نے اپنی بہن شانتا کا سر دفن کیا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے مشکل پیش آ رہی تھی۔ میں نے تھانے سے سیلوں والی ٹارچیں ساتھ لے لی تھیں۔ ان کی روشنی میں انہوں نے وہ جگہ تلاش کر لی اور آنند لعل نے اس جگہ کی نشاندہی کی۔ میرے کہنے پر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور گواہوں کے سامنے گڑھے سے مٹی نکال کر ٹوکہ اور بہن کا ادھ گلا سر نکال کر باہر رکھا۔

میں نے دیکھا کہ آنند لعل کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس کا سارا جسم سردی لگے مریض کی طرح لرز رہا تھا۔ میں نے ضروری کاغذی کارروائی کر کے دونوں گواہوں سے اس پر انگوٹھے لگوائے اور ہم تھانے آ گئے۔

میں نے دوسرے گاؤں سے اکبر کا بیان بھی لیا۔ یہ ضروری تھا۔ سب سے زیادہ اہم بیان سعیدہ کا تھا۔ اس کے علاوہ کیس کے خالی خانے پُر کرنے کے لیے جو بھی ضرورت تھی، میں نے پوری کر لی۔ میں نے شانتا کی خالہ والے شہر اور گاؤں سے یہ سرکاری رپورٹ بھی منگوالی تھی کہ ان دنوں وہاں طاعون بالکل نہیں پھیلا تھا۔ شانتا کی خالہ سے بھی یہ بیان لے لیا تھا کہ شانتا کے بھائی اسے ریلوے اسٹیشن سے ہی واپس لے گئے تھے۔

غرض میں نے بڑا مضبوط کیس تیار کر کے عدالت میں پیش کر دیا۔ سیشن جج نے دونوں بھائیوں کو سزائے موت دی۔ انہوں نے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر دی جس کے نتیجے میں مدن لعل کی سزائے موت عمر قید میں بدل گئی اور آنند لعل کی سزائے موت برقرار رکھی گئی۔

☆=====☆=====☆

ناموں، گاموں اور بگھیاڑ

ناموں مرد کا بچہ تھا۔ اس نے گاؤں میں للکار کر اعلان کیا تھا کہ وہ اپنی ایک ٹانگ کے بدلے میں دشمنوں کی ایک لاش گرائے گا...... جذبۂ انتقام کے گرد گھومتی ہوئی ایک پیچ در پیچ تفتیشی کہانی۔

یہ اگست 1973ء کی بات ہے جب میری پہلی کہانی ''وہی سیڑھیاں، وہی زہر'' حکایت میں چھپی تھی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ آج تک چل رہا ہے اور جب تک میرے دم میں دم ہے، میں لکھتا رہوں گا۔

یہاں میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں کوئی رائٹر نہیں ہوں۔ مجھے رائٹر بنانے والے اور لوگ ہیں۔ میں تو اپنی تھانیداری زبان میں اُلٹی سیدھی کہانی لکھ کر دے دیا کرتا ہوں۔ آپ تک جو کہانی پہنچتی ہے، وہ عارف محمود کے جادوئی قلم کی کرامات ہوتی ہیں۔

میں آپ کو قتل کی ایک واردات کی تفتیش سنا رہا ہوں۔ غالباً یہ بات میں پہلے بھی کسی کہانی میں لکھ چکا ہوں کہ انسان کی نفسیات سمندر کی طرح ہے۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس کے اندر کیا کچھ چھپا ہوا ہے۔ سطح سے پُرسکون نظر آنے والے سمندر کے اندر کیسے کیسے طوفان موجیں مار رہے ہیں، کوئی کنارے پر کھڑا ہو کر نہیں بتا سکتا۔ ہر انسان اپنی اپنی نفسیات کا غلام ہے۔ اگر آپ کسی تھانے کی وارداتوں کا ریکارڈ دیکھیں تو حیرت کے سمندر میں ڈوب جائیں گے۔

یہ دوسری جنگِ عظیم کے فوراً بعد کا واقعہ ہے۔ اس علاقے کے تھانے میں تعینات ہوئے مجھے دواڑھائی ماہ گزر گئے تھے اور میں نے اردگرد کے دیہات اور اپنے مطلب کے لوگوں کے متعلق واقفیت حاصل کر لی تھی۔ ایک دن صبح سویرے میں اپنے کوارٹر میں ناشتہ کر رہا تھا کہ تھانے سے ایک کانسٹیبل آ گیا۔ میں اسے اتنی صبح دیکھ کر سمجھ گیا کہ وہ کوئی خیر کی خبر نہیں لایا ہوگا۔ ضرور ڈکیتی یا قتل کی کسی واردات کی اطلاع تھانے پہنچی ہے اور ہیڈ کانسٹیبل نے رپورٹ درج کرنے سے پہلے اسے میری طرف دوڑا دیا ہے۔ کانسٹیبل کے بات کرتے ہی میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ تھانے سے تقریباً دوڈھائی میل دور ایک گاؤں میں قتل کی واردات ہوگئی تھی۔

میں چاہتا تو اپنے وقت پر اپنی مرضی سے تھانے جاتا لیکن ان وقتوں میں ابھی تھانیداروں کو ایسی عادتیں نہیں پڑی تھیں اور دوسری طرف انگریزوں کی حکومت تھی جو اس قسم کے معاملات میں سُستی برداشت نہیں کرتے تھے۔ فوراً جانے کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ واردات والی جگہ پر شہادتیں اور نشانات وغیرہ ابھی ٹھیک حالت میں مل سکتے تھے۔ جتنی دیر ہوتی ان کے ضائع ہونے کا خطرہ اتنا ہی زیادہ بڑھتا جاتا۔

میں اسی وقت وردی پہن کر تیار ہوا اور کانسٹیبل کے ساتھ تھانے چلا گیا۔ وہاں تین افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کو میں جانتا تھا۔ وہ واردات والے گاؤں کا نمبردار تھا۔ باقی دو کے متعلق پتہ چلا کہ ایک مقتول کا بڑا بھائی ہے اور دوسرا مقتول کا بڑا بیٹا ہے۔ مقتول کے بڑے بھائی کی عمر پچاس پچپن سال ہوگی اور بیٹا چوبیس پچیس سال کے لگ بھگ ہوگا۔ مقتول کے بھائی نے میرے ساتھ بات کی۔ وہ رکھ رکھاؤ والا معزز شخص تھا اور بات کرنے کا سلیقہ جانتا تھا۔ اس نے اپنا نام مختار حسین بتایا۔ جو بھائی قتل ہو گیا تھا اس کا نام بختیار حسین بتایا گیا۔

واردات کی تفصیل کچھ اس طرح تھی کہ بختیار حسین رات کو اپنے کھلیانوں میں سویا تھا۔ یہ اس کا معمول تھا کہ وہ رات کو کھلیان میں سوتا تھا اور صبح گھر آ کر ناشتہ کرتا تھا۔ کھلیان میں سونے کی وجہ تھی کہ گندم کی فصل کٹ چکی تھی اور ڈھیروں کی صورت میں کھلیانوں میں پڑی ہوئی تھی۔ ان وقتوں میں اکثر دشمنی کی وجہ سے کھیتوں میں کھڑی یا کھلیانوں میں سوکھنے کے لیے پڑی فصل کو آگ لگا دی جاتی تھی۔ بختیار فصل کی حفاظت کے خیال سے کھیتوں میں سوتا تھا۔ بختیار کے متعلق بتایا گیا کہ وہ فوج میں حوالدار تھا اور جنگ ختم ہونے کے بعد ریٹائر ہو کر واپس آ گیا تھا۔ اس کے پاس ایک سنگل بیرل بندوق تھی جو وہ رات کو اپنے ساتھ رکھ کر سوتا تھا۔

اس صبح گاؤں کا ایک آدمی پَو پھٹے اس طرف سے گزرا تو اس کو بختیار حسین چارپائی سے نیچے گرا ہوا نظر آیا۔ اگر بختیار حسین نارمل حالت میں زمین پر گرا ہوتا تو وہ آدمی اس کی طرف توجہ نہ دیتا لیکن بختیار حسین کی پوزیشن یہ تھی کہ اس کا زیریں دھڑ چارپائی پر تھا اور بالائی دھڑ نیچے کو لڑھکا ہوا تھا۔ بختیار حسین کو اس پوزیشن میں دیکھ کر یہ آدمی آگے گیا تو اسے چارپائی کے نیچے خون جما ہوا نظر آیا۔ یہ آدمی وہیں سے واپس ہو گیا اور سیدھا مختار حسین کے پاس گیا۔ صورتِ حال کا علم ہونے کے بعد مختار حسین گاؤں کے نمبردار کے ساتھ کھلیان میں پہنچا۔ انہوں نے دیکھا کہ بختیار مر چکا تھا۔ وہ وہیں سے تھانے چلے آئے۔ بختیار کا بڑا بیٹا بھی ساتھ آ گیا تھا۔

میں نے رپورٹ درج کی اور اس کے بعد چند کانسٹیبل لے کر موقعہ واردات کی طرف

چل پڑا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو لاش والے کھیت کے اردگرد لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ اب سورج نکل آیا تھا اور گاؤں میں قتل کی خبر پھیل گئی تھی۔ میں پریشان ہو گیا کہ لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے قاتل کے کُھرے اور دیگر شہادتیں ضائع ہو گئی ہوں گی۔

ہمیں دیکھ کر لوگ راستہ چھوڑ کر اِدھر اُدھر ہو گئے۔ میں یہ دیکھ کر مطمئن ہو گیا کہ لوگ کھیت کے کنارے پر ہی کھڑے تھے کھیت کے اندر کوئی داخل نہیں ہوا تھا۔ گاؤں کے تین چار معززین نے لوگوں کو کھیت کے اندر آنے سے روک رکھا تھا۔ یہ لوگ کُھروں کی اہمیت سمجھتے ہوں گے۔ میں نے آگے بڑھ کر پہلے لاش کا نظری معائنہ کیا۔ لاش کی حالت بالکل وہی تھی جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ مقتول منہ کے بل آدھا چارپائی سے نیچے گرا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ آگے کو پھیلے ہوئے تھے جیسے کسی چیز کو پکڑنا چاہ رہا ہو۔ اس کا چہرہ مٹی سے لتھڑا ہوا تھا۔ چارپائی بان کی تھی اور اس پر بستر نہیں تھا۔ صرف ایک تکیہ رکھا نظر آ رہا تھا۔ لاش کے ہاتھوں سے کچھ دور ایک سنگل بیرل بندوق گری ہوئی تھی۔

مقتول کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ موت کی اذیت اس کے چہرے پر نقش ہو گئی تھی۔ مقتول صحت مند اور مضبوط تن و توش کا مالک تھا۔ چہرے کے خدوخال سے ظاہر ہوتا تھا کہ مقتول سخت اور کھردرا آدمی ہو گا۔ اس کے چہرے سے ایک عجیب طرح کی وحشت جھلکتی تھی جسے میں کوئی نام نہ دے سکا۔ موت بڑے بڑوں کو منہ کے بل گرا دیتی ہے۔ وہ چونکہ منہ کے بل گرا ہوا تھا اس لیے اس کی پشت اوپر کی طرف تھی اور سینہ اور پیٹ زمین کی طرف تھا۔ پشت پر کسی قسم کے زخم کا نشان نظر نہیں آ رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ مقتول کو سینے یا پیٹ پر زخم آئے تھے۔

میں نے دو کانسٹیبلوں سے کہا کہ وہ آگے آ کر لاش کو سیدھا کریں اور چارپائی پر لٹا دیں۔ دو کانسٹیبلوں نے مل کر بڑی احتیاط سے مقتول کو سیدھا کر کے چارپائی پر ڈال دیا۔ مقتول کا سینہ اور پیٹ جمے ہوئے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ چاقو یا خنجر کے دو زخم سینے پر اور ایک لمبا زخم پیٹ پر نظر آ رہا تھا۔ پیٹ چاک کر دیا گیا تھا۔ سینے کے زخم دل کے مقام پر تھے اور دونوں کے درمیان بمشکل ایک انچ کا فرق تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہی زخم فوری موت کا باعث بنے ہوں گے۔ یقیناً ان سے دل کٹ گیا تھا۔ ویسے پیٹ کا زخم بھی مہلک تھا۔

میں نے ساری تفصیل نوٹ کر لی اور اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ اکثر وارداتوں میں جائے واردات پر ملزم کوئی ایسا سراغ یا شہادت چھوڑ جاتے ہیں جو ان کی گرفتاری کا باعث بنتی ہے یا تفتیش میں مدد دیتی ہے۔ میں نے اسی اُمید پر بڑی توجہ اور باریک بینی سے زمین کا معائنہ کیا

مگر مجھے ایسی کوئی چیز نظر نہ آئی۔ اب میں نے کُھروں پر توجہ دی۔ ایک طرف سے کسی آدمی کے کُھرے چارپائی کی طرف آ رہے تھے۔ ان کُھروں کے صرف آنے کے نشان تھے واپس جانے والے کُھروں کا کوئی نشان نہیں تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ مقتول کے اپنے کُھرے ہوں گے۔ مزید تسلی کے لیے میں نے چارپائی کے ایک طرف پڑی ہوئی مقتول کی جوتی سے کچی زمین پر نشان بنا کر دیکھے جو بالکل ویسے ہی تھے۔

انوکھے کُھرے

میں نے چارپائی کے گرد گھوم کر دیکھا تو مجھے سرہانے کی طرف جوتے کا ایک نشان نظر آیا۔ یہ دائیں جوتے کا نشان تھا۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ قاتل مقتول کے سرہانے والی طرف سے کھیت میں داخل ہوا تھا۔ میں کُھرے کا نشان دیکھتا ہوا آگے بڑھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ صرف دائیں پاؤں کا کُھرا نظر آ رہا تھا، بائیں جوتے کا نشان کہیں بھی نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر میں چکرا گیا۔ میں نے اور غور سے زمین پر بیٹھ کر اندازے سے اس جگہ کو دیکھا جہاں میرے خیال میں بائیں جوتے کا نشان ہونا چاہئے تھا تو مجھے ایک عجیب سا نشان نظر آیا۔ یہ ایک گول سا نشان تھا جو دائیں پاؤں کے کُھرے کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ پہلے میں نے غور نہیں کیا تھا لیکن اب یہ نشان صاف نظر آ رہا تھا۔

یہ کسی لاٹھی یا بیساکھی کا نشان ہو سکتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ قاتل بائیں ٹانگ سے لنگڑا ہے اور لاٹھی یا بیساکھی کے سہارے چلتا ہے۔ میں یہ دیکھتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ آگے جا کر کھیت ختم ہو گیا اور پگڈنڈی آ گئی۔ وہاں لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے کُھروں کا ملنا ناممکن سی بات تھی۔ ایسے کُھرے میں نے اپنی سروس میں پہلی بار دیکھے تھے۔

میں نے چارپائی کے اردگرد کی زمین کو مزید غور سے دیکھا۔ مجھے اور کوئی کُھرا نظر نہ آیا۔ اس کا مطلب تھا کہ قاتل اکیلا ہی تھا یا اگر اس کے ساتھ کوئی اور تھا بھی تو وہ دور ہی کھڑا رہا ہو گا۔ میں نے موقعہ پر ضروری کارروائیاں کیں اور لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیا۔

ان کارروائیوں سے فارغ ہو کر میں نے مقتول کے بڑے بھائی مختار حسین کو نمبردار کی بیٹھک میں بلوایا۔ ماتم والے گھر میں بیٹھ کر پوچھ گچھ کرنا میں مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ سب سے پہلے قتل کی وجہ معلوم کرنا ضروری تھا۔ اگر وجہ معلوم ہو جائے تو پھر تفتیش کرنا آسان ہوتا ہے۔

مقتول کے متعلق نمبردار سے جو باتیں معلوم ہوئیں ان کے مطابق مقتول انگریزوں کی

فوج میں حوالدار تھا۔ جنگِ عظیم ختم ہونے کے تین ماہ بعد وہ ریٹائر ہو کر گاؤں آ گیا۔ نمبردار نے بتایا کہ مقتول بڑی دبنگ اور سخت طبیعت کا انسان تھا۔ گاؤں میں بھی رعب اور دبدبہ رکھتا تھا۔ یہ خوشحال لوگ تھے۔ مقتول روزگار کی غرض سے فوج میں بھرتی نہیں ہوا تھا بلکہ اسے فوج میں جانے کا شوق تھا۔

ابھی میں نمبردار کے ساتھ باتیں کر رہا تھا کہ مقتول کا بڑا بھائی مختار آ گیا۔ میں نے نمبردار کو وہاں سے بھیج کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ اظہارِ افسوس کے بعد میں مقتول کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔

''مقتول کی کسی کے ساتھ دشمنی تھی؟'' میں نے پوچھا۔ ''یا پچھلے دنوں کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا تو نہیں ہوا؟''

''ہم دشمن دار لوگ ہیں جی!'' مختار نے جواب دیا۔ ''ویسے تو اکثر چھوٹے موٹے لڑائی جھگڑے ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن اصل دشمنی نہر پار کے گاؤں کے ایک خاندان کے ساتھ ہے۔ ان کے ساتھ کئی بار ڈانگ سوٹا چل چکا ہے۔''

''کیا یہ دشمنی اس حد تک ہے کہ قتل کی نوبت آ جائے؟'' میں نے پوچھا۔ ''اور کیا ان لوگوں میں اتنی ہمت ہے کہ وہ تمہارے گاؤں میں آ کر قتل کر جائیں؟''

''دشمنی تو ایسی ہے کہ قتل کرنا یا ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔'' مختار نے جواب دیا۔ ''اور وہ لوگ قتل کرنے اور ہو جانے سے ڈرنے والے لوگ نہیں۔''

''دشمنی کی وجہ کیا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''غلطی دراصل ہمارے بندے کی تھی۔'' مختار نے کہا۔ ''ہم نے معافی بھی مانگی تھی لیکن ان لوگوں کا رویہ اتنا ہتک آمیز تھا کہ نہ چاہنے کے باوجود بات بڑھ گئی۔ بس پھر لاٹھیاں کلہاڑیاں چل گئیں۔ کچھ ان کے بندے زخمی ہوئے، کچھ ہمارے۔''

''تھانے تک بات پہنچی تھی؟'' میں نے اس خیال سے پوچھا کہ تھانے میں اس کا ریکارڈ ہوگا۔

''نہیں!'' مختار نے کہا۔ ''انہوں نے کہا تھا کہ تھانے بزدل جایا کرتے ہیں۔ اس لیے وہ تھانے نہیں جائیں گے۔ ہم بھی بزدل نہیں کہلانا چاہتے تھے، اس لیے دونوں پارٹیوں میں سے کوئی بھی تھانے نہ گیا۔''

''کیا ان لوگوں میں کوئی ایسا مرد ہے جس کی بائیں ٹانگ کٹی ہوئی ہو؟'' میں نے اس

سے پوچھا۔ ''یا بائیں ٹانگ سے معذور ہو؟''

''بالکل ہے ملک جی!'' اس نے ذرا جوش سے کہا۔ ''آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''قاتل کے کھروں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی بائیں ٹانگ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جائے واردات پر جو نشان پائے گئے ہیں ان میں صرف دائیں جوتے کا نشان ہے جبکہ بائیں جوتے والی جگہ پر لاٹھی یا بیساکھی کا نشان ہے۔''

''اس لنگڑے کا نام انعام اللہ ہے۔'' مختار نے کہا۔ ''وہ ناموں کے نام سے مشہور ہے۔ مجھے یقین ہے کہ قاتل وہی ہے۔''

''یہ بات تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔ ''صرف کھروں کی وجہ سے؟''

''یہ بات نہیں۔'' مختار نے کہا۔ ''دراصل ناموں کی ٹانگ ہمارے ساتھ لڑائی میں ہی ضائع ہوئی تھی۔ اس سے پہلے وہ بالکل ٹھیک تھا۔ بڑا زبردست لڑاکا اور جی دار آدمی ہے۔ لڑائی کے دوران ہمارے کسی آدمی کی کلہاڑی اس کی ٹانگ پر گھٹنے کے قریب اس طرح لگی کہ ٹانگ کے پٹھے کٹ گئے۔ پہلے تو گاؤں کے سیانے سے علاج کراتا رہا مگر دیسی علاج سے زخم ٹھیک ہونے کی بجائے بگڑ گیا۔ پھر اس کو شہر کے ہسپتال لے گئے۔ وہاں ڈاکٹروں نے بتایا کہ ٹانگ میں زہر پھیل چکا ہے۔ اگر ٹانگ کاٹی نہ گئی تو زہر سارے جسم میں پھیل جائے گا۔ اس طرح ناموں ایک ٹانگ سے محروم ہو کر شہر سے واپس آیا۔ ہم نے سنا تھا کہ ٹانگ کٹنے پر وہ غمگین یا مایوس نہیں ہوا تھا بلکہ اس نے گاؤں والوں کے سامنے للکار کر اعلان کیا تھا کہ اپنی ایک ٹانگ کے بدلے وہ دشمنوں کا ایک بندہ مارے گا۔ اس کی یہ دھمکی ہم تک پہنچ گئی تھی۔ اب آپ کی بات سن کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ناموں نے اپنی دھمکی پوری کر دی ہے۔''

اس کی یہ بات سن کر مجھے تجسس ہوا کہ ایسی کیا دشمنی تھی کہ دونوں خاندان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ میں نے مختار سے کہا وہ پوری بات تفصیل سے سنائے۔ اس کے جواب میں مختار نے مجھے جو بات سنائی وہ میں اپنے الفاظ میں مختصر کر کے سنا دیتا ہوں۔

گاموں کا قصہ

مختار، جبار اور بختیار تین بھائی تھے۔ یہ خوشحال زمیندار خاندان تھا اور گاؤں میں ان کا رعب داب تھا۔ مختار سب سے بڑا تھا اس کے بعد جبار تھا اور بختیار سب سے چھوٹا تھا۔ مختار کا

ایک بیٹا اور تین بیٹیاں تھیں۔ جبار کا صرف ایک بیٹا تھا۔ ابھی یہ بیٹا دس سال کا ہو گا کہ اس کا باپ بیٹھے میں چل بسا۔ اس کے بیٹے کو بعد میں مختار اور بختیار نے مل کر پالا۔ اس لڑکے کا نام غلام حسین تھا اور سب اسے گاموں کہتے تھے۔ گاموں شروع ہی سے بڑا صحت مند اور کھلے ہاتھ پیروں والا بچہ تھا۔ جوان ہوا تھا اُس زمانے کے معیار کے مطابق بڑا خوبصورت جوان نکلا۔

گاموں کو شروع سے ہی کسرت کا شوق تھا۔ وہ گاؤں کی کبڈی ٹیم کا سب سے اہم کھلاڑی تھا۔ اردگرد کے دیہات میں اس نے دھوم مچا رکھی تھی۔ قدرت نے اسے بڑے ہی خوبصورت جسم اور شکل سے نوازا تھا۔ ان کی کبڈی ٹیم اکثر دوسرے دیہات میں بھی کبڈی کھیلنے کے لیے جاتی رہتی تھی۔ نہر پار والوں سے ان کا کانٹے دار مقابلہ ہوتا تھا۔ گاموں کی وجہ سے اکثر اس کے گاؤں کی ٹیم کا پلہ بھاری رہتا تھا۔ کبڈی کے مقابلوں کے سلسلے میں دونوں ٹیموں کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اس طرح گاموں پار والے گاؤں میں بھی مشہور ہو گیا۔

ایک بار گاموں کی ٹیم پار والے گاؤں گئی ہوئی تھی۔ وہاں انہوں نے کبڈی کا ایک میچ کھیلا اور جیت لیا۔ گاموں اور اس کے ساتھیوں کی واپسی تک شام کا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ راستے میں مالٹوں کا ایک باغ پڑتا تھا۔ جب وہ باغ کے قریب سے گزر رہے تھے تو اچانک باغ کی طرف سے ایک ادھیڑ عمر عورت آتی دکھائی دی۔ جب وہ اس کے قریب پہنچے تو اس عورت نے گاموں کو روک لیا اور کہا کہ وہ اس سے علیحدگی میں ایک بات کرنا چاہتی ہے۔ گاموں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ چلتے رہیں وہ ان کے پیچھے آ رہا ہے۔

وہ عورت اسے مالٹوں کے باغ کے اندر لے گئی۔ باغ کے اندر اندھیرا زیادہ تھا۔ گاموں نے دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے کوئی کھڑا ہے۔ دور سے پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ عورت ہے یا مرد؟ جب وہ قریب پہنچا تو دیکھا کہ وہ تو بڑی خوبصورت اور نوجوان لڑکی تھی۔ گاموں نے پیچھے مڑ کر عورت سے اس بارے میں پوچھنا چاہا تو وہ غائب ہو چکی تھی۔

''تمہیں میں نے بلایا ہے۔'' لڑکی نے کہا۔ ''تمہیں برا تو نہیں لگا۔''

''برا تو نہیں لگا۔'' گاموں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ ''مگر کیوں بلایا ہے؟''

''دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے۔'' لڑکی نے نظریں جھکا کر کہا۔ ''میرا نام فاطمہ ہے...... میں تم سے ملنا چاہتی تھی۔''

''کیوں؟''

''تم مجھے اچھے لگتے ہو۔'' فاطمہ نے کہا۔ ''اور میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی ہوں۔''

گاموں نے فاطمہ کو سمجھایا کہ اس طرح اس کی بدنامی کا خدشہ ہے لہٰذا وہ اس کا خیال دل سے نکال دے اور واپس چلی جائے۔

''میں نے عورت ہو کر اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے۔'' فاطمہ نے کہا۔ ''تم مرد ہو کر ڈر رہے ہو۔ یا پھر صاف کہہ دو کہ میں تمہارے دل کو اچھی نہیں لگی۔ خدا پاک کی قسم، آئندہ کبھی تمہارے راستے میں نہیں آؤں گی۔''

''تم بہت خوبصورت ہو فاطمہ!'' گاموں نے کہا۔ ''اور میرے دل کو اچھی بھی لگی ہو لیکن پھر کہوں گا کہ اپنی عزت کا خیال کرو اور واپس چلی جاؤ۔''

''مجھے غلط نہ سمجھنا گاموں!'' فاطمہ نے کہا۔ ''میں تم سے پاک صاف محبت کرتی ہوں...... میرے دل میں شیطان نہیں ہے...... میں ایک شرط پر واپس جاؤں گی۔ اگر تم پھر ملنے کا وعدہ کرو تو۔ ورنہ تمہارے پیچھے پیچھے چلتی تمہارے گھر تک پہنچ جاؤں گی۔''

گاموں نے اس سے اگلے دن ملنے کا وعدہ کر لیا۔ پھر مالٹوں کے اس باغ میں ان کی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ گاموں شام کو اپنے گاؤں سے گھوڑی پر بیٹھ کر نہر پار جا کر فاطمہ سے ملنے جانے لگا۔

جو لوگ گاؤں کی زندگی کو سمجھتے ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ گاؤں میں کسی کا راز، راز نہیں رہتا۔ فاطمہ اور گاموں کے قصے لوگوں میں پھیلنے لگے۔ جب یہ قصے فاطمہ کے گھر والوں تک پہنچے تو وہ لوگ مرنے مارنے پر اُتر آئے۔ انہوں نے فاطمہ پر سختی کی اور اس کا گھر سے نکلنا بند کر دیا۔ اس کے باوجود فاطمہ کسی نہ کسی طرح گاموں سے ملنے چلی آتی تھی۔ فاطمہ کے باپ اور بھائیوں نے اسے مارنا پیٹنا شروع کر دیا لیکن وہ پھر بھی باز نہ آئی۔

فاطمہ کی برادری والوں نے اعلان کیا تھا کہ اگر گاموں ان کے گاؤں کے قریب بھی نظر آیا تو جان سے مارنے کی بجائے اس کی دونوں ٹانگیں اور بازو توڑ کر اسے ہمیشہ کے لیے اپاہج کر دیں گے۔ اس سارے معاملے کی اطلاع گاموں کے تایا مختار اور چچا بختیار کو ملی تو انہوں نے گاموں کو سمجھایا کہ وہ اس چکر کو چھوڑ دے اور آئندہ کبھی پار والے گاؤں میں نہ جائے اور نہ ہی فاطمہ سے ملنے کی کوشش کرے۔ گاموں نے کہا کہ وہ صرف ایک شرط پر ان کی یہ بات مانے گا کہ وہ اس کے لیے فاطمہ کا رشتہ مانگیں۔ یہ ایک ناممکن سی بات تھی۔ اگرچہ دونوں خاندان برابر کی ٹکر کے تھے لیکن ذات برادری کا فرق آڑے آ جاتا۔

فاطمہ کہاں گئی؟

انھی دنوں میں بختیار فوج میں چلا گیا۔ مختار نے کچھ معزز آدمیوں کو اس بات پر تیار کیا کہ وہ نہر پار والوں کے پاس جائیں اور گاموں کے لیے فاطمہ کے رشتے کی بات چلائیں۔ یہ لوگ فاطمہ کے گاؤں چلے گئے۔ وہاں ان کی بہت آؤ بھگت کی گئی۔ ان معززین نے سارے معاملے پر بات کی اور گاموں کے تایا مختار کی طرف سے معافی بھی مانگی لیکن جونہی ان معززین نے فاطمہ کے رشتے کی بات چھیڑی، وہ لوگ ہتھے سے اکھڑ گئے۔ فاطمہ کی برادری والوں نے ان معززین سے کہا وہ فاطمہ کا نام بھی نہ لیں۔ یہ معززین ناکام واپس آ گئے۔ گاموں کو اس بات کا علم ہوا تو وہ بڑا تلملایا۔ اس نے کہا کہ وہ فاطمہ کو حاصل کر کے رہے گا، چاہے اس کے لیے اس کچھ بھی کرنا پڑے۔

کچھ دنوں بعد گاموں گاؤں سے غائب ہو گیا۔ وہ کسی کو کچھ بتا کر نہیں گیا تھا۔ اسے ہر اس جگہ تلاش کیا گیا جہاں اس کے ملنے کا امکان تھا مگر اس کا کچھ پتہ نہ لگا۔ اسی طرح دو دن گزر گئے۔ گاموں کی برادری والوں کو شک گزرا کہ کہیں گاموں فاطمہ کے گاؤں والوں کے ہتھے نہ چڑھ گیا ہو۔ انہوں نے دو آدمیوں کو ڈھکے چھپے انداز میں پتہ چلانے کے لیے فاطمہ کے گاؤں بھیجا۔ ان دونوں نے واپس آ کر اطلاع دی کہ گاموں ان لوگوں کے ہاتھ نہیں لگا۔ اب معاملہ اُلجھ گیا کہ گاموں کہاں گیا!

اس سے اگلا دن چڑھا تو قیامت ہی آ گئی۔ صبح سویرے فاطمہ کی برادری کے بیس پچیس آدمی لاٹھیوں کلہاڑیوں سے مسلح ہو کر گاموں کے گاؤں آ گئے اور للکارنے لگے کہ گاموں کو ان کے حوالے کیا جائے۔ دوسری طرف سے چند منٹوں میں گاموں کی برادری والے بھی مسلح ہو کر نکل آئے۔ بات کھلی تو پتہ چلا کہ فاطمہ رات کو کسی وقت غائب ہو گئی ہے اور ان لوگوں کو پورا یقین تھا کہ وہ گاموں کے ساتھ نکل آئی ہے۔ مختار نے ان لوگوں کو بتایا کہ گاموں تین چار دنوں سے لاپتہ ہے اور وہ خود بڑے پریشان ہیں۔

فاطمہ کی برادری والے یہ بات ماننے پر تیار نہ تھے۔ ان کو پورا یقین تھا کہ گاموں گاؤں میں ہی کہیں چھپا ہوا ہے اور فاطمہ اس کے ساتھ ہے۔ بات تکرار کی حدود سے نکل کر ڈانگ سوٹے کی منزل تک جا پہنچی۔ دونوں طرف کے پانچ چھ بندے بری طرح زخمی ہوئے۔ معمولی زخم تو تقریباً سب کو لگے تھے۔ اسی لڑائی میں ناموں کو ٹانگ پر کلہاڑی لگی تھی جس کی وجہ سے

بعد میں اس کی ٹانگ کاٹنی پڑی تھی۔

یہاں سے ان دونوں برادریوں کے درمیان خونی دشمنی پیدا ہو گئی۔ گاموں اور فاطمہ کا کچھ پتہ نہ لگا کہ وہ کہاں چلے گئے ہیں۔ سب کو یقین تھا کہ گاموں فاطمہ کو بھگا کر لے گیا ہے اور وہ دونوں اب کبھی واپس نہیں آئیں گے۔

یہ تھی ان لوگوں کی دشمنی کی وجہ۔ میں نے اس پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ وجہ قتل کا باعث بن سکتی ہے۔ میں نے مختار سے کچھ اور باتیں بھی پوچھیں جو تفتیش کے لیے ضروری تھیں۔ مختار نے صاف طور پر فاطمہ کی برادری کے لوگوں پر نام لے لے کر قتل کا شک ظاہر کیا تھا۔ میں نے مختار کا سارا بیان لکھ لیا۔ اس کیس میں مجھے یہ سہولت مل گئی تھی کہ اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مارنے کی بجائے تفتیش صرف ایک ہی رخ پر کرنی تھی۔

کاغذی کارروائیاں کرتے اور بیان لیتے دوپہر کا وقت ہو گیا۔ نمبردار نے دوپہر کے کھانے کا انتظام کیا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں اپنے ساتھ آئے ہوئے کانسٹیبلوں کے ساتھ فاطمہ کے گاؤں چلا گیا۔ وہاں کے نمبردار کو میری آمد کا پتہ لگا تو وہ بھاگا آیا۔ میں نے اسے ساری صورتِ حال بتائی تو وہ مجھے ساتھ لے کر ناموں کے گھر کی طرف چل پڑا۔ ناموں کے گھر کے سامنے پہنچ کر نمبردار نے آگے بڑھ کر دستک دی۔ دس بارہ سال عمر کے ایک لڑکے نے دروازہ کھولا۔ نمبردار نے اسے کچھ کہا تو وہ اندر چلا گیا۔ ذرا سی دیر بعد اس نے بیٹھک کا دروازہ کھولا اور ہمیں اندر بٹھا کر چلا گیا۔

لنگڑا قاتل

ہمیں بیٹھے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک قد آور شخص بیساکھی کے سہارے چلتا ہوا اندر آ گیا۔ میں اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ یہ شخص انعام اللہ عرف ناموں ہے۔ وہ بڑا خوبصورت جوان تھا۔ لمبا قد، گٹھا ہوا جسم اور ہلکا سانولا رنگ۔ اس کے چہرے پر ایک وقار سا تھا جو سامنے والے کو متاثر کرتا تھا۔ سچ پوچھیں تو اتنے صحت مند جوان کو بیساکھی کے سہارے چلتا دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہوا۔ میں نے اسے بیٹھنے کو کہا تو وہ بیساکھی ایک طرف رکھ کر بیٹھ گیا۔

''تم واقعی جوانمرد ہو۔'' میں نے ناموں کی پیٹھ تھپک کر کہا۔ ''تم نے اپنا قول پورا کر دکھایا ہے۔''

''کون سا قول جی؟'' ناموں نے بڑی حیرت سے پوچھا۔ ''آپ کس قول کی بات کر

رہے ہیں؟''

''یاد کرو ناموں!'' میں نے کہا۔ ''جب تمہاری ٹانگ کٹ گئی تھی تو تم نے رونے دھونے کی بجائے مردوں کی طرح للکار کر کہا تھا کہ تم اپنی ایک ٹانگ کے بدلے میں دشمنوں کی ایک لاش گراؤ گے۔''

''اوہ، ہاں!'' ناموں نے ذرا سا سوچا اور پھر اپنی داہنی کنپٹی پر شہادت کی انگلی مارتے ہوئے کہا۔ ''وہ تو میں نے جوش اور غصے میں آ کر کہا تھا۔ لڑائی جھگڑوں میں زخم تو آتے ہی رہتے ہیں۔ میری ٹانگ اپنی غلطی کی وجہ سے ضائع ہوئی تھی۔ شہر کے ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ اگر گاؤں میں اناڑی جراح سے علاج کرانے کی بجائے فوراً شہر کے ہسپتال آ جاتا تو ٹانگ ٹھیک ہو سکتی تھی۔''

''آخر تم نے اپنی ٹانگ کا بدلہ لے ہی لیا۔'' میں نے کہا۔

''کیسا بدلہ جی؟'' ناموں نے پریشان ہو کر کہا۔ ''میں نے کس سے بدلہ لیا ہے؟''

''اتنے پریشان کیوں ہوتے ہو ناموں؟'' میں نے کہا۔ ''تم نے مردوں والا کام کیا ہے۔ ایک ٹانگ سے معذور ہونے کے باوجود دشمن کے گھر جا کر وار کیا ہے۔''

اب تو ناموں کی حالت دیکھنے والی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھ رہا تھا۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ اگر وہ ایک ٹانگ سے معذور نہ ہوتا تو تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ وہ بیٹھے بیٹھے بے چینی سے اِدھر اُدھر ہل رہا تھا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' اس نے سٹپٹا کر کہا۔ ''میں نے کسی پر وار نہیں کیا...... آپ کس دشمن کی بات کر رہے ہیں؟''

''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کس دشمن کی بات کر رہا ہوں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''گاموں کو بھول گئے ہو، رات کو گاموں کے چچا کو قتل کر دیا گیا ہے...... یہ بتاؤ کہ تم نے اکیلے یہ کام کیا ہے یا کوئی تمہارے ساتھ تھا؟''

مجھے توقع تھی کہ میری بات سن کر ناموں اچھل پڑے گا اور زور و شور سے انکار کرے گا لیکن اس نے کوئی خاص ردِ عمل ظاہر نہ کیا۔

''میں گاموں کے چچا کو قتل کیوں کرتا؟'' اس نے اعتماد سے کہا۔ ''ہاں، اگر کبھی بھی زندگی میں گاموں سامنے آ گیا تو اسے ضرور قتل کروں گا اور قتل کر کے چھپاؤں گا نہیں سیدھا

آپ کے پاس آ جاؤں گا۔''

''اگر تم مجھے صاف صاف بتا دو تو میں تمہارے بچاؤ کے لیے راستہ نکال لوں گا۔'' میں نے اس کی بات پر توجہ دیئے بغیر کہا۔ ''اگر نہیں مانو گے تو پھر میں خود ہی ثابت کر لوں گا کہ قتل تم نے کیا ہے۔ پھر مجھ سے کسی رعایت کی اُمید نہ رکھنا۔ بہتر ہے اقبالی بیان دے دو اور اس کا فائدہ مجھ سے حاصل کرو۔''

ابھی میں ناموں سے تفتیش کر ہی رہا تھا کہ ایک کانسٹیبل نے بتایا کہ ناموں کی برادری کے کچھ لوگ اندر آنا چاہتے ہیں۔ میں نے کانسٹیبل سے کہا کہ ابھی کسی کو اندر نہیں آنے دینا، میں خود ہی بلا لوں گا۔ میں تفتیش کے اس مرحلے پر ملزم کو ڈھیل نہیں دینا چاہتا تھا۔

''جائے واردات پر تمہارے کُھرے دیکھے گئے ہیں۔'' میں نے ناموں کے قدموں تلے سے زمین کھینچنے کے لیے کہا۔ ''اس قسم کے کُھرے کسی اور کے ہو ہی نہیں سکتے۔ دائیں جوتے کا نشان اور بائیں جوتے کی جگہ بیساکھی کا نشان...... اب بھی انکار کرو گے کہ قتل تم نے نہیں کیا؟''

میری بات کے جواب میں ناموں قسمیں کھا کھا کر مجھے یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا کہ قتل اس نے نہیں کیا لیکن میں اس کی کوئی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ پولیس والے اگر قسموں پر یقین کرنے لگیں اور رونے دھونے سے متاثر ہو جائیں تو مجرم جیل نہ جائیں اور عدالتوں کچہریوں کی ضرورت ہی نہ رہے۔ پولیس اور عدالت ثبوت دیکھتی ہے۔ حالات اور واقعاتی شہادت ناموں کے خلاف تھے۔

جائے واردات پر ملنے والے کُھرے کا میں نے مولڈ تیار کروا لیا تھا۔ وہاں زمین نرم تھی اور کُھروں کے نشان بڑے ہی واضح تھے۔ یہ دیسی جوتے کا کُھرا تھا جو دیہات میں عام استعمال ہوتا تھا۔ اب میں نے ناموں کے کُھرے سے جائے واردات پر ملنے والے کُھرے کا موازنہ کرنا تھا۔

''آلۂ قتل کہاں ہے؟'' میں نے ناموں سے پوچھا۔ ''اگر خود دے دو گے تو فائدے میں رہو گے ورنہ میں پورے گھر کی تلاشی لوں گا اور آلۂ قتل برآمد کروں گا۔''

''جب میں نے قتل ہی نہیں کیا تو آلۂ قتل کہاں سے دے دوں؟'' ناموں نے تقریباً رو دینے والی آواز میں کہا۔ ''آپ نے اگر تلاشی لینی ہے تو شوق سے لے لیں۔''

میں نے اندازہ لگایا کہ آلۂ قتل گھر کے اندر نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے آلۂ قتل نہر میں پھینک دیا ہو یا کہیں دفن کر دیا ہو۔ پھر بھی میں نے تلاشی لینا ضروری سمجھا۔ اس سے پہلے میں

نے کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ وہ ناموں کے رشتے داروں کو اندر بھیج دے۔ کانسٹیبل چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد تین معزز صورت آدمی اندر آ گئے۔ تعارف کرانے پر معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک فاطمہ کا باپ ہے، دوسرا عمر میں سب سے بڑا تھا، وہ ناموں کا باپ تھا اور تیسرا ناموں کا سسر تھا۔ میں نے ان کو ساری تفصیل بتا دی اور ناموں کے باپ سے کہا کہ وہ ناموں سے کہے کہ اقبال جرم کر لے اور آلہ قتل بھی برآمد کروا دے۔

''ناموں ٹھیک کہتا ہے۔'' ناموں کے باپ نے کہا۔ ''یہ قتل اس نے نہیں کیا۔ یہ پچھلی رات گھر میں سویا ہوا تھا۔ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ یہ ساری رات گھر میں ہی رہا ہے اور ایک لمحے کے لیے بھی باہر نہیں نکلا۔ پھر یہ بھی تو دیکھیں کہ میرا بیٹا معذور ہے۔ یہ کس طرح اتنی دور جا کر ایک آدمی کو قتل کر کے واپس آ سکتا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ کسی کو اس کا علم بھی نہ ہو۔''

میں نے بھی پہلے اس پہلو پر سوچا تھا کہ ایک ٹانگ سے معذور آدمی کس طرح ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں آ کر قتل کی کامیاب واردات کر سکتا ہے لیکن پھر نمبردار نے باتوں باتوں میں ناموں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ بڑا جی دار بندہ ہے۔ ایک ٹانگ سے معذور ہونے کے باوجود کسی کی مدد کے بغیر گھوڑے پر سوار ہو جاتا ہے اور بڑی مہارت سے گھوڑا دوڑاتا ہے۔

''بے شک آپ کا بیٹا معذور ہے۔'' میں نے ناموں کے باپ سے کہا۔ ''لیکن میں نے سنا ہے کہ معذور ہونے کے باوجود زبردست لڑاکا ہے اور گھڑ سواری کر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کے لیے کھیتوں میں سوئے ہوئے کسی آدمی کو قتل کر کے واپس آ جانا کوئی مشکل نہیں۔ پھر جائے واردات پر آپ کے بیٹے کے مخصوص کھرے ملے ہیں۔ دائیں جوتے اور ایک بیساکھی کے نشان والے کھرے اور کس کے ہو سکتے ہیں، آپ خود ہی بتا دیں۔''

''میں قرآن اٹھانے کو تیار ہوں۔'' ناموں کے باپ نے کہا۔ ''کہ ناموں پچھلی رات تھوڑی سی بھی دیر کے لیے بھی گھر سے غائب نہیں ہوا۔ جہاں تک جائے واردات پر ناموں کے کھروں کی موجودگی کا معاملہ ہے، میں خود حیران ہوں کہ ایسا کس طرح ممکن ہے۔ ضرور کسی نے میرے بیٹے کو پھنسانے کے لیے ایسا کیا ہے۔''

''پولیس والے قسموں کو نہیں مانتے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ ناموں کے باپ ہیں، اس وجہ سے آپ کی گواہی ویسے بھی ناقابلِ قبول ہے۔ ایک باپ اپنے بیٹے کو قتل کے الزام سے بچانے کے لیے جھوٹی قسمیں بھی کھا سکتا ہے اور قرآن بھی اٹھا سکتا ہے...... اور پھر یہ بھی تو سوچیں کہ کسی کو کیا ضرورت پڑی ہے آپ کے بیٹے کو پھنسانے کی۔ اگر ناموں کا کوئی دشمن ہے

تو اس کا نام بتائیں...... آپ کو کسی پر شک ہے تو مجھے بتائیں۔ میں پوری تفتیش کروں گا۔ پولیس والے بغیر ثبوت اور ٹھوس شک کے کسی پر ہاتھ نہیں ڈالتے...... بہتر ہو گا آپ ناموں سے کہیں کہ وہ اقبال جرم کر لے اور آلہ قتل بھی برآمد کروا دے۔''

ناموں نے اقبال جرم سے صاف انکار کر دیا۔ میں نے اس کے گھر کی تلاشی لینے کا فیصلہ کر لیا اور اس مقصد کے لیے اپنے کانسٹیبلوں کو بلا کر ہدایات دے دیں۔ ناموں اپنے والدین سے الگ رہتا تھا۔ ایک گلی چھوڑ کر دوسری گلی میں اس کے والدین کا گھر تھا۔ اس سے بھی میں نے اندازہ لگایا تھا کہ ناموں کا باپ جھوٹ بول رہا ہے کہ ناموں ساری رات گھر سے نہیں نکلا۔ دونوں گھروں کے درمیان اچھا خاصا فاصلہ تھا۔

میں نے ناموں کو باقاعدہ گرفتار کر لیا۔ اس کے گھر کی بڑی باریکی سے تلاشی لی۔ ایک ٹین کے صندوق سے ایک بڑا چاقو ملا جو کپڑوں کی تہہ میں چھپایا گیا تھا۔ یہ کمانی دار چاقو تھا جو اُن وقتوں میں زیادہ تر جرائم پیشہ لوگ رکھتے تھے۔ یہ چاقو رکھنا جرم قرار دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ برچھی کا ایک چُوڑی دار پھل ملا جسے بوقتِ ضرورت کسی بھی مخصوص چُوڑی دار بانس کے سرے پر پیچ دے کر کسا جا سکتا تھا۔ میں نے دونوں ہتھیار قبضے میں لے کر ضروری کاغذی کارروائی کی اور برآمدگی کو قانونی شکل دے دی۔

میں ناموں کو لے کر تھانے آ گیا۔ اب مجھے پوسٹ مارٹم رپورٹ کا انتظار تھا۔

ایک اور پریشانی

میں دن بھر کی کارروائی کی وجہ سے بہت تھک چکا تھا۔ اس لیے آرام کرنے کے لیے اپنے کوارٹر میں چلا آیا۔ لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی اور جب جاگا تو ساڑھے چار بج چکے تھے۔ گرمی بہت تھی۔ تازہ دم ہونے کے لیے میں نے غسل کیا۔ نہا کر جسم میں کچھ چستی آئی اور دماغ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو میں تھانے آ گیا۔

ناموں کو حوالات میں بند کر دیا گیا تھا۔ تھانے میں اور بھی کئی کیس تھے۔ میں ان میں اُلجھ گیا۔ کچھ دیر بعد مقتول بختیار کی پوسٹ مارٹم رپورٹ آ گئی۔ رپورٹ میں موت کا وقت رات ڈھائی اور تین بجے کے درمیان لکھا گیا تھا۔ موت کی وجہ وہی لکھی تھی جو میں پہلے بتا چکا ہوں۔ چاقو یا خنجر کے وار سے دل دو جگہ سے کٹ گیا تھا۔ پیٹ کا زخم تقریباً سات آٹھ انچ لمبا تھا۔ اس کی وجہ سے انتڑیاں بھی کٹ گئی تھیں۔ ڈاکٹر نے پوری تفصیل سے زخموں کی لمبائی چوڑائی اور گہرائی لکھی تھی جو اب مجھے پوری طرح یاد نہیں۔ بہرحال پوسٹ مارٹم رپورٹ میں کوئی نئی یا

چونکا دینے والی بات نہیں تھی۔

میں نے چاقو اور برچھی میڈیکل ایگزامینر کے پاس معائنہ کے لیے بھجوا دیئے تھے۔ یہ معلوم کرنا تھا کہ ان ہتھیاروں پر خون کا دھبہ تو نہیں ہے۔ ایگزامینر کے پاس ایسے طریقے ہوتے ہیں کہ وہ خون کے مدہم سے مدہم نشانات کا پتہ بھی چلا لیتے ہیں خواہ ہتھیار کو دھو دیا گیا ہو۔

شام تک ایگزامینر کی رپورٹ بھی آ گئی۔ رپورٹ دیکھ کر میں چکرا گیا۔ رپورٹ میری توقع کے بالکل اُلٹ تھی۔ لکھا تھا کہ دونوں ہتھیاروں پر خون کا کوئی نشان نہیں پایا گیا۔ جب میں نے ناموں کے گھر سے چاقو برآمد کیا تھا تو مجھے پورا یقین تھا کہ یہ چاقو آلہ قتل ہے۔ مقتول کی لاش پوسٹ مارٹم کے بعد آ گئی تھی جو قانونی کارروائی کے بعد مقتول کے وارثوں کے حوالے کر دی گئی۔

میں سمجھ گیا کہ ناموں نے قتل کر کے آلۂ قتل کہیں پھینک دیا ہوگا۔ اب یہ اس سے اُگلوانا تھا کہ آلۂ قتل کہاں پھینکا ہے۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ ناموں کو حوالات سے نکال کر میرے پاس لے آئے۔ مجھے اچانک جائے واردات پر ملنے والے کُھروں کا خیال آ گیا تھا۔ کانسٹیبل ناموں کو لے کر آ گیا۔ وہ بیساکھی کے سہارے چلتا ہوا میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ میں نے کانسٹیبل کو سمجھایا کہ وہ ناموں کو تھانے کے صحن میں لے جائے اور آٹھ دس قدم چلانے کے بعد حوالات میں بند کر دے۔ کانسٹیبل سمجھ گیا کہ میں ناموں کے کُھروں کے نشان لینا چاہتا ہوں۔

کانسٹیبل نے میری حسبِ منشا مطلوبہ نشان لے لئے اور آ کر مجھے بتایا۔ میں نے جائے واردات پر جوتے کا نشان دیکھا تھا وہ اچھی طرح ذہن میں محفوظ کر لیا تھا۔ یہ عام دیہاتی جوتے کا نشان تھا اس میں جو خاص بات میں نے نوٹ کی تھی وہ یہ تھی کہ جوتے کے تلے پر ایڑی والی جگہ پر ایسا نشان اُبھرا ہوا تھا جیسے جوتے کی ایڑی گھس گئی ہو اور وہاں چمڑے کا ٹکڑا لگوایا گیا ہو۔ اگر آپ دس آدمیوں کے جوتے کے تلے دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہر آدمی کے جوتے کا تلا مختلف جگہ سے گھسا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر آدمی کے چلنے کا انداز دوسرے سے الگ ہوتا ہے۔ کوئی پنجوں پر دباؤ ڈال کر چلتا ہے، کوئی دائیں جانب دباؤ ڈال کر چلتا ہے تو کوئی بائیں طرف۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایڑی رگڑتے ہوئے چلتے ہیں۔

میں نے تھانے کے صحن میں جا کر ناموں کے کُھروں کے نشان دیکھے۔ یہ نشان جائے واردات والے کُھروں سے بالکل نہیں ملتے تھے۔ میں نے کُھروں اور بیساکھی کے نشانات کو غور

سے دیکھا تو مجھے بیساکھی کے نشان میں بھی فرق محسوس ہونے لگا لیکن یہ میرا وہم بھی ہو سکتا تھا۔

اپنے کمرے میں جا کر میں نے کانسٹیبل کو بلایا اور اس سے کہا کہ وہ ناموں کو میرے پاس لے آئے۔ کانسٹیبل چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد ناموں کو ساتھ لے کر آ گیا۔ میں نے ناموں کو کرسی پر بیٹھنے کو کہا تو وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار صاف نظر آ رہے تھے لیکن وہ گھبرایا ہوا بالکل نہیں لگ رہا تھا۔

''میں تم پر تشدد نہیں کرنا چاہتا ناموں!'' میں نے کہا۔ ''اگر تم شرافت سے اقبالی بیان دے دو تو مجھ سے فائدہ حاصل کر سکتے ہو۔ ایک بات یاد رکھو، یہ آخری موقع ہے۔ اس کے بعد میں ذرا بھی رعایت نہیں کروں گا۔ جائے واردات پر تمہارے کُھرے موجود ہیں۔ تمہارے خلاف شہادت بھی مضبوط ہے۔ وجہ قتل بھی معقول ہے...... بولو، بیان دو گے؟''

''میرا بیان وہی ہے جو پہلے تھا۔'' ناموں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''قتل میں نے نہیں کیا تو اقبالی بیان کیوں دوں؟ اگر میں نے قتل کیا ہوتا تو خود تھانے پیش ہو جاتا۔ اللہ جانتا ہے کہ میں بے گناہ ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اللہ میری مدد کرے گا۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے پُراعتماد لہجے میں مجھے سچائی محسوس ہو رہی تھی۔ میرا اتنا تجربہ ہو گیا تھا کہ سچ اور جھوٹ میں فرق محسوس کر سکتا تھا۔ مجرم اور جھوٹے آدمی کے بات کرنے کا انداز اور ہوتا ہے اور جب ایک سچا آدمی بات کرتا ہے تو اس کا ایک خاص انداز ہوتا ہے جو کوئی تجربہ کار تھانیدار ہی پہچان سکتا ہے۔ ناموں کے بات کرنے کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے مگر بات جائے واردات پر پائے جانے والے کُھروں پر آ کر اٹک جاتی تھی۔ اگر ناموں سچ بول رہا تھا تو پھر جائے واردات پر موجود کُھرے کس کے تھے۔

میں اپنا شک پوری طرح رفع کئے بغیر ناموں کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے تھانے کے صحن میں ناموں کے کُھروں کے جو نشان لئے تھے وہ جائے واردات پر پائے جانے والے کُھروں سے نہیں مل رہے تھے لیکن ضروری نہیں تھا کہ ناموں نے واردات کے وقت وہی جوتا پہن رکھا ہو جو اب پہنے ہوئے تھا۔ ضروری تھا کہ میں ناموں کے زیر استعمال تمام جوتے چیک کرتا۔ میں نے کانسٹیبل کو بلایا اور اس سے کہا کہ وہ فوراً سائیکل پر ناموں کے گھر چلا جائے اور ناموں کی بیوی سے کہے کہ ناموں کے جتنے بھی جوتے ہیں، وہ دے دے۔ کانسٹیبل چلا گیا۔

میں نے ناموں کو حوالات میں بھجوا دیا اور خود دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا۔

ناموں بے گناہ تھا؟

گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کا وقت ہوگا جب ایک کانسٹیبل نے آکر اطلاع دی کہ ناموں کا باپ اور سسر مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ آگئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ کیوں آئے ہیں تو انہوں نے بتایا کہ وہ ناموں سے ملنے کے لیے آئے ہیں اور اس کے علاوہ میرے ساتھ ایک ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان کو بتایا کہ چونکہ ابھی تفتیش ہو رہی ہے اس لیے وہ ناموں سے نہیں مل سکتے۔ پھر میں نے ان سے پوچھا کہ وہ میرے ساتھ کیا ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔

''ناموں پر رحم کریں ملک جی!'' ناموں کے باپ نے میرے آگے ہاتھ باندھ کر کہا۔ ''آپ ہمیں حکم کریں، ہم آپ کی ہر خدمت کے لیے تیار ہیں۔ اللہ نے آپ کی دعا سے بہت دے رکھا ہے۔''

میں سمجھ گیا اس کا اشارہ کس قسم کی ''خدمت'' کی طرف ہے۔ وہ مجھے رشوت کی پیشکش کر رہا تھا۔

''خدمت میں ضرور بتاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''پہلے مجھے ساری صورتِ حال کا علم ہونا چاہئے۔ اس کے بعد ہی میں کوئی راستہ نکال سکوں گا...... آپ ناموں سے کہیں کہ وہ ساری بات مجھے سنا دے پھر میں کچھ سوچوں گا اور اپنی خدمت بھی بتاؤں گا۔''

میری یہ بات سن کر وہ دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ وہ کانسٹیبل آگیا جسے میں نے ناموں کے گھر بھیجا تھا۔ اس نے مجھے اشارے سے بتایا کہ وہ مطلوبہ کام کر آیا ہے۔ میں نے ناموں کے باپ اور سسر سے کہا کہ وہ اچھی طرح سوچ لیں اور پھر مجھے بتائیں۔ یہ کہہ کر میں نے انہیں بھیج دیا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے کانسٹیبل کو بلایا۔ کپڑے کا ایک تھیلا اس نے میرے سامنے پیش کر دیا۔ میرے کہنے پر اس نے تھیلا فرش پر اُلٹا تو اس میں پانچ جوڑے جوتوں کے نکلے۔ کانسٹیبل نے باری باری ہر جوتے کا تلوا مجھے دکھایا۔ زیادہ تر جوتے نئے اور اچھی حالت میں تھے۔ صرف ایک جوتے کی ایڑی پر کیلوں کے ذریعے چمڑے کا ٹکڑا لگا کر ایڑی کے والا حصہ ہموار کیا گیا تھا۔ میں نے یہ جوتا الگ کیا اور کانسٹیبل کو ساتھ لے کر باہر صحن میں اس کچی جگہ چلا گیا جہاں پہلے ناموں کے کُھروں کے نشان لئے تھے۔

میں نے کانسٹیبل سے کہا کہ وہ ناموں کے جوتے کا دایاں پاؤں پہن کر کچی زمین پر چلے۔ کانسٹیبل میری ضرورت سمجھتا تھا۔ اس نے آٹھ دس قدم چل کر کچی زمین پر دائیں جوتے کے نشان بنا دیئے۔ میں نے زمین پر بیٹھ کر ان نشانوں کو غور سے دیکھا۔ اس کُھرے میں بھی ایڑی پر چمڑے کے ٹکڑے کا نشان صاف نظر آ رہا تھا لیکن یہ اس نشان سے تھوڑا سا مختلف تھا جو جائے واردات والے کُھرے میں تھا۔ اب مجھے شک ہونے لگا تھا کہ ناموں واقعی بے گناہ ہو سکتا ہے اور اگر ناموں ملزم نہیں تھا تو میری اب تک کی ساری محنت ضائع گئی تھی۔ اب میں نے اس پہلو پر سوچنا شروع کر دیا کہ قاتل کوئی اور بھی ہو سکتا ہے اور وہ جو کوئی بھی ہے، ناموں کی طرح اس کی بھی بائیں ٹانگ کٹی ہوئی ہے یا وہ چلتے ہوئے زمین پر نہیں لگتی اور وہ بائیں طرف بیساکھی پکڑ کر چلتا ہوگا۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ ناموں کو چھوڑ دوں گا لیکن اپنے مخبر اس کے اردگرد پھیلائے رکھوں گا۔ وہ جو بھی حرکت کرے گا یا کسی سے بھی ملے گا، اس کی رپورٹ مجھے پہنچتی رہے گی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے تمام مخبروں کو طلب کر کے ان سے کہا کہ وہ اردگرد کے دیہات میں پھیل جائیں اور ایسے آدمی کا سراغ لگائیں جس کی بائیں ٹانگ کٹی ہوئی ہو یا اگر ٹانگ ہو لیکن چلنے میں مدد نہ دیتی ہو۔ وہ شخص بیساکھی یا لاٹھی کے سہارے چلتا ہوگا۔

ایک اور لنگڑا

اس ساری کارروائی کے بعد میں نے ناموں کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ وہ گاؤں میں موجود رہے اور جب بھی اسے تھانے میں طلب کیا جائے، فوراً حاضر ہو جائے۔ میں نے اسے یہ بھی کہا کہ وہ تھانے اطلاع کئے بغیر گاؤں سے باہر نہ جائے۔ ناموں نے آسمان کی طرف اس طرح شکر گزاری سے دیکھا جیسے اللہ کا شکر ادا کر رہا ہو پھر اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ میں نے کانسٹیبل کو اشارہ کیا کہ وہ ناموں کو اس کی بیساکھی لا دے۔ حوالات میں ناموں کو بیساکھی ساتھ رکھنے کی اجازت نہیں تھی اور جب اسے میرے پاس لایا جاتا تھا تو اس کے بیٹھنے کے بعد ایک کانسٹیبل اس کی بیساکھی قبضے میں لے لیتا تھا۔

ناموں بیساکھی ٹھک ٹھک کرتا ہوا میرے دفتر سے نکل گیا۔ میں جہاں سے چلا تھا پھر وہیں آ کھڑا ہوا تھا۔ میری تفتیش کی گاڑی بالکل ٹھپ ہو کر رہ گئی تھی۔ اب میں مکمل طور پر مخبروں کے رحم و کرم پر تھا۔ مجھے بڑی اُمید تھی کہ جلد ہی مجھے مطلوبہ شخص کے بارے میں اطلاع مل

جائے گی۔ اس قسم کے آدمی کو ڈھونڈنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں تھانے کے دوسرے کیسوں میں مصروف ہو گیا۔

روز صبح مخبر میرے پاس حاضری دیتے اور اپنی اپنی رپورٹ دیتے۔ ان رپورٹوں سے مجھے کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ اردگرد کے دیہات میں ایسے کسی آدمی کا سراغ نہ ملا جو میری شرائط پر پورا اُترتا ہو۔ ایک آدمی ایسا ملا لیکن وہ دائیں ٹانگ سے معذور تھا اور اتنا عمر رسیدہ تھا کہ قتل کرنا تو دور کی بات تھی، وہ اپنا آپ بڑی مشکل سے سنبھالتا تھا۔ اسی طرح پانچ دن گزر گئے اور میری تفتیش ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکی۔ میں اب مایوس ہو چلا تھا اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ناموں کو دوبارہ گرفتار کر کے اسے خوب چھینٹی لگواؤں گا۔ میں تشدد کا قائل نہ تھا لیکن خاص حالات میں اور ضرورت کے تحت کبھی کبھار ایسا کر لیتا تھا۔

قتل کی اس واردات کو پانچ دن گزر گئے تھے۔ وہ چھٹا دن تھا۔ میں تھانے میں بیٹھا تھا۔ میں نے اپنے اے ایس آئی کو بلایا جو ایک سکھ تھا۔ اس کا نام مہندر سنگھ تھا اور بڑا ہی کاہل انسان تھا۔ غالباً کسی بڑے آدمی کی سفارش سے پولیس میں بھرتی ہوا تھا۔ کھاتے پیتے خاندان کا لاڈلا بیٹا تھا۔ جنگ عظیم میں اس کے باپ نے انگریزوں کے وار فنڈ میں جی بھر کر چندہ دیا تھا اور فوج میں بھرتی کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ انگریزوں نے اپنے ایسے وفاداروں کو خوب نوازا تھا۔ مہندر کے باپ کی ہوشیاری دیکھیں کہ اس نے لوگوں کے جوان لڑکوں کو مرنے کے لیے انگریز کی فوج میں بھرتی کرا دیا اور اپنے بیٹے کو پولیس میں بھیج دیا۔

میں نے مہندر سنگھ سے کہا کہ وہ ناموں کو تھانے لے آئے اور اگر وہ شرافت سے آنے سے انکار کرے تو اسے باقاعدہ ہتھکڑی لگا کر لائے۔ مہندر چلا گیا۔ اسے گئے ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ میرا ایک مخبر آ گیا۔ اس نے جو بات سنائی اسے سن کر میں خوش ہو گیا۔ یہ مخبر اپنے ساتھ ایک آدمی کو لے کر آیا تھا۔ مخبر نے بتایا کہ یہ آدمی ساتھ والے گاؤں میں رہتا ہے۔ جس رات بختیار قتل ہوا اس کی صبح یہ ایک شادی کے سلسلے میں چلا گیا تھا۔ رات کو یہ واپس آیا تو اسے بختیار کے قتل کی خبر ملی اور یہ بھی پتہ چلا کہ پولیس کو ایک ایسے آدمی کو تلاش ہے جو بائیں ٹانگ سے معذور ہے۔ اس آدمی نے بتایا کہ اس نے اس طرح کا لنگڑا آدمی واردات سے ایک دن پہلے دیکھا تھا۔ یہ بات مخبر کے کان میں پڑی تو وہ اسے میرے پاس لے آیا۔

میرے کہنے پر مخبر نے اس آدمی کو میرے سامنے پیش کر دیا۔ وہ ادھیڑ عمر آدمی تھا اور شکل سے کافی ہوشیار دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ پوری بات تفصیل سے سنائے۔

اس آدمی نے بڑی تفصیل سے مجھے ساری بات سنائی۔ میں آپ کو مختصراً یہ بات سنا دیتا ہوں۔

یہ آدمی ہندو تھا اور اس کا نام روپ کمار تھا۔ روپ کمار واردات والے گاؤں کے ساتھ والے گاؤں میں رہتا تھا۔ واردات سے ایک دن پہلے روپ کمار گھر کے لیے کچھ دال دلیا لینے گاؤں کے ایک سرے پر واقع پرچون کی دکان پر گیا۔ یہ ایک ہندو کی دکان تھی جو ریٹائرڈ فوجی تھا اور جنگ عظیم میں برما کے محاذ پر زخمی ہو گیا تھا۔ اس کے زخم کچھ اس نوعیت کے تھے کہ اس کا دایاں بازو مفلوج ہو گیا تھا۔ روپ کمار اپنے ہندو بھائی کی مدد کی نیت سے اس سے سودا لینے جاتا تھا۔ اس ہندو فوجی نے اپنے گھر کے اندر سے جگہ نکال کر پرچون کی دکان کھول لی تھی۔ سب لوگ اسے فوجی دکاندار کہتے تھے۔

روپ کمار جب وہاں سے سودا لے کر نکلنے لگا تو اچانک فوجی دکاندار کے گھر کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی بیساکھی کے سہارے باہر نکلا اور پھر روپ کمار کو دیکھ کر فوراً ہی واپس اندر چلا گیا۔ روپ کمار نے اس پر کوئی زیادہ توجہ نہ دی۔ ایک لنگڑا آدمی نظر آ جانا کوئی ایسی اہم بات نہیں تھی۔ اس سے اگلے دن روپ کمار کسی رشتے دار کی شادی کے سلسلے میں شہر چلا گیا۔

روپ کمار شادی بھگتانے کے بعد واپس گاؤں آیا تو اس نے سنا کہ ساتھ والے گاؤں میں قتل کی واردات ہو گئی ہے۔ ان وقتوں میں جب کہیں قتل کی واردات ہو جاتی تھی تو دور دور تک دہشت پھیل جاتی تھی اور لوگ خوفزدہ ہو جاتے تھے۔ آج کل تو روزانہ تھوک کے حساب سے قتل ہوتے ہیں اور لوگ تو لوگ، حکومت کے کان پر بھی جوں تک نہیں رینگتی۔

بہرحال روپ کمار نے سنا کہ پولیس کو شک ہے کہ قاتل لنگڑا ہے اور پولیس اس شخص کی تلاش میں ہے۔ روپ کمار کو فوراً فوجی دکاندار کے گھر نظر آنے والا لنگڑا یاد آ گیا۔ اس نے لوگوں کو بتایا کہ اس نے ایسا ایک لنگڑا آدمی دیکھا تھا۔ ہوتے ہوتے یہ بات میرے مخبر تک پہنچی تو وہ روپ کمار کو میرے پاس لے آیا۔

”اگر وہ لنگڑا دوبارہ تمہارے سامنے آئے تو کیا تم اسے پہچان لو گے؟“ میں نے روپ کمار سے پوچھا۔

”اگرچہ میں نے صرف چند لمحوں کے لیے اسے دیکھا تھا۔“ روپ کمار نے کہا۔ ”لیکن میں اسے آسانی سے پہچان لوں گا۔ اس کی وجہ اس کے چہرے پر زخم کا ایک لمبا نشان تھا جو بڑا واضح نظر آ رہا تھا۔“

”کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ اس کی بائیں ٹانگ معذور تھی؟“ میں نے پوچھا۔

''نہیں جی!'' روپ کمار نے کہا۔ ''میں نے غور نہیں کیا تھا۔'' وہ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر بولا۔

''مجھے ایسا شک پڑتا ہے کہ وہ اپنی دائیں ٹانگ پر کھڑا تھا اور بیساکھی اس کے بائیں طرف تھی۔''

میں نے اے ایس آئی مہندر کو بلایا اور اس سے کہا کہ وہ روپ کمار کے ساتھ جائے اور فوجی دکاندار کو ساتھ لے آئے۔ میری یہ بات سن کر روپ کمار کچھ گھبرا گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ فوجی دکاندار کو یہ پتہ لگے کہ روپ کمار نے اس کی نشاندہی کی ہے۔ میں نے اسے تسلی دی کہ اس کا نام اس کیس میں بالکل نہیں آئے گا۔ وہ بس دور سے اے ایس آئی کو مکان دکھا دے۔ یہ سن کر اس ہندو کی جان میں جان آئی۔ میں نے مہندر کمار سے کہا کہ وہ دو کانسٹیبل ساتھ لے کر جائے۔ اس کے بعد میں نے روپ کمار کا شکریہ ادا کیا اور یہ کہہ کر اسے جانے دیا کہ اگر اس کی مدد کی ضرورت پڑی تو اسے بلوا لوں گا۔

مہندر سنگھ دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر روپ کمار کے ساتھ چلا گیا۔

پردہ اُٹھ گیا

مہندر سنگھ چلا گیا تو میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ فوجی دکاندار کے گھر دیکھا جانے والا لنگڑا کون ہے اور کیا وہ قاتل ہو سکتا ہے؟ اگر وہی لنگڑا قاتل ہے تو اس کی حوالدار بختیار کے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟ وہ لنگڑا کہاں سے آیا اور فوجی دکاندار سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ یہ اور اس قسم کے لاتعداد سوالات میرے ذہن میں کلبلانے لگے۔ ان سارے سوالات کا جواب صرف ایک شخص دے سکتا تھا اور وہ شخص تھا فوجی دکاندار۔ میں بڑی بے چینی سے اس کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ وقت گزاری کے لیے میں نے ایک دوسرے کیس کی فائل کھول لی۔

تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد اے ایس آئی مہندر سنگھ آ گیا۔ وہ فوجی دکاندار کو ساتھ لے آیا تھا۔ اس دکاندار کا نام تو پرکاش نارائن تھا لیکن گاؤں والے اسے فوجی کہتے تھے۔ میں نے مہندر سے کہا کہ وہ پرکاش کو میرے پاس بھیج دے اور کسی کو اندر نہ آنے دے۔ مہندر پرکاش کو میرے پاس چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے دیکھا، وہ ایک عام سا سانولے رنگ کا ہندو تھا۔ اس کے ڈیل ڈول میں کوئی جاذبیت نہیں تھی۔ شکل سے ہی نظر آ رہا تھا کہ غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ غربت کی مار ہی ایسی ہوتی ہے کہ انسان کے چہرے کی رونق اور تازگی چھین لیتی ہے۔ پرکاش کے چہرے سے یتیمی برس رہی تھی اور وہ کچھ خوفزدہ سا نظر آ رہا تھا۔

پرکاش نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کیا اور چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ

اس کا دایاں ہاتھ جنگ میں زخمی ہونے کے بعد مفلوج ہو گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا یہ ہاتھ بالکل مفلوج نہیں ہوا تھا۔ وہ اس ہاتھ کو معمولی حرکت دے سکتا تھا۔ اس نے پرنام کرنے کے لیے دونوں ہاتھ اٹھا کر جوڑے تھے تو بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ کو سہارا دے رکھا تھا۔ میں نے اس کو بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر اس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ باتوں باتوں میں، میں نے اس کے ہاتھ کے متعلق پوچھا کہ اسے کیا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ برما کے محاذ پر اگلے مورچوں میں تھا۔ شدید گولہ باری ہو رہی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک گولہ گرا۔ اس کے کچھ ٹکڑے اسے لگے جن سے وہ شدید زخمی ہو گیا۔ زخم تو ٹھیک ہو گیا لیکن اس کا دایاں ہاتھ بیکار ہو گیا۔

''وہ لنگڑا کہاں ہے؟'' میں نے اچانک پرکاش سے پوچھا۔

میرا یہ سوال سن کر پرکاش اس طرح بدکا جیسے کسی نے بے خبری میں اسے سوئی چبھو دی ہو۔ وہ حیرانی سے میرا منہ دیکھنے لگا۔ میں نے اپنے ذہن میں سوچ لیا تھا کہ اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دوں گا۔

''آپ کس لنگڑے کی بات کر رہے ہیں؟'' پرکاش نے کہا۔ ''میں سمجھا نہیں۔''

''میں اسی لنگڑے کی بات کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''جس کے ساتھ مل کر تم نے حوالدار بختیار کو قتل کیا ہے۔''

اب تو پرکاش یوں اچھلا جیسے میں نے اس پر بم پھینک دیا ہو۔ اس کی آنکھیں عجیب انداز میں پھیل گئیں جیسے ابھی باہر آ جائیں گی۔ اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن صرف اس کے ہونٹ ہلتے دکھائی دیئے، آواز نہ نکلی۔

''میرے سامنے جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کرنا پرکاش!'' میں نے اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی کہا۔ ''میرے پاس کئی گواہ موجود ہیں جنہوں نے اس لنگڑے کو تمہارے گھر آتے ہوئے دیکھا تھا۔ تم جھوٹ بولو، پھر دیکھو کہ میں تمہارا کیا حشر کرتا ہوں۔ تمہارا دایاں ہاتھ پہلے ہی مفلوج ہے، بایاں میں توڑ دوں گا۔ پھر بھیک مانگتے پھرو گے...... اس لیے جو بھی بولو، سوچ سمجھ کر بولنا۔''

''میں نے قتل نہیں کیا جناب!'' پرکاش نے ہکلا کر کہا۔

''پھر کس نے کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ جی...... گلو نے کیا ہے جی!'' پرکاش نے بڑی مشکل سے جواب دیا۔

''گلو کون؟'' میں نے سختی سے کہا۔ ''سیدھی طرح اس کا نام بتاؤ۔''

''اس کا نام گلزار ہے جناب!'' پرکاش نے کہا۔ ''وہی لنگڑا...... اسے گلو کہتے ہیں۔''

"قتل کے وقت تم اس کے ساتھ تھے؟" میں نے اس خیال سے پوچھا کہ وہ موقعے کا گواہ ہوسکتا ہے۔

"نہیں جناب!" پرکاش نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "جیسی چاہے قسم لے لیں، میں اس کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ اکیلا گیا تھا۔"

"گلو کی حوالدار بختیار سے کیا دشمنی تھی؟" میں نے پرکاش سے پوچھا۔

"پرانی بات ہے جناب!" پرکاش نے کہا۔ "گلو نے اس کا بدلہ لے لیا ہے۔ حوالدار کی وجہ سے اس کی ٹانگ کٹ گئی تھی۔"

میں نے پرکاش سے کہا کہ وہ مجھے ساری بات تفصیل سے بتائے۔ پرکاش نے مجھے جو بات سنائی وہ مختصراً اس طرح تھی کہ گلو بھی انگریزوں کی فوج میں تھا اور جنگِ عظیم میں اگلے مورچوں پر تھا۔ حوالدار بختیار اور گلو ایک ہی یونٹ میں تھے اور گلو حوالدار بختیار کے ماتحت تھا۔ اس زمانے میں حوالدار کے ماتحت غالباً پانچ سپاہی ہوا کرتے تھے۔ جنگ زوروں پر تھی۔ یہ پرکاش، گلو اور تین اور سپاہی بختیار کے ماتحت تھے۔ ایک دن جب جاپانیوں کا بڑا زبردست حملہ آ رہا تھا اور گولیاں اور بم بارش کی طرح برس رہے تھے، حوالدار بختیار نے گلو کو کوئی کام بتا کر کہا کہ وہ ابھی جا کر یہ کام کرے۔ گلو نے حوالدار سے کہا کہ حملے کا زور ٹوٹ جائے تو وہ کام کر آئے گا۔

حوالدار بختیار بڑا ہی سخت اور ڈسپلن کا پابند فوجی تھا اور اپنی بات منوانے کا عادی تھا۔ اس نے گلو کو کہا کہ وہ فوراً حکم کی تعمیل کرے ورنہ اس کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔ گلو نہ چاہتے ہوئے بھی مورچے سے باہر چلا گیا۔ ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ ایک گولہ گلو سے کچھ فاصلے پر گرا اور اس کا ایک چھوٹا ٹکڑا گلو کے منہ پر لگا اور ایک بڑا ٹکڑا گھٹنے پر لگا جس سے اس کی بائیں ٹانگ اس بری طرح مجروح ہوگئی کہ ڈاکٹروں کو کاٹنی پڑی۔

گلو کو معذوری کی وجہ سے فوج سے ریٹائر کر دیا گیا۔ اس کا گلو کو بڑا رنج تھا اور اس حادثے کا ذمہ دار وہ حوالدار بختیار کو سمجھتا تھا۔ اس نے عہد کر رکھا تھا کہ بختیار سے اپنی ٹانگ کٹنے کا بدلہ ضرور لے گا۔ ادھر کچھ دنوں بعد پرکاش بھی زخمی ہوگیا اور گاؤں آ گیا۔ گلو کو معلوم تھا کہ پرکاش حوالدار کے ساتھ والے گاؤں میں رہتا ہے۔ اس نے پرکاش کے ساتھ خط و کتابت کے ذریعے رابطہ رکھا ہوا تھا۔ اس نے پرکاش سے کہہ رکھا تھا کہ جب بھی حوالدار گاؤں میں نظر آئے، وہ اسے اطلاع کر دے۔

جن دنوں حوالدار بختیار گاؤں میں آیا ہوا تھا، پرکاش کسی کام سے اس گاؤں گیا تو اس کو

پتہ چل گیا کہ حوالدار گاؤں میں موجود ہے۔ اس نے خط لکھ کر گلو کو اطلاع دے دی۔ چند دنوں بعد گلو پرکاش کے پاس آ گیا اور اس کے گھر چھپا رہا۔ وہ اتنی دور سے گھوڑی پر آیا تھا۔ واردات والی رات اس نے پرکاش سے کہا کہ وہ حوالدار کا کام تمام کرنے جا رہا ہے اور وہیں سے واپس نکل جائے گا۔ پرکاش کے پاس نہیں آئے گا۔

گلو اپنی گھوڑی پر بیٹھ کر رات کے وقت پرکاش سے رخصت ہوگیا۔ اگلے دن پرکاش نے سنا کہ حوالدار بختیار کو قتل کر دیا گیا ہے۔

میں نے پرکاش سے پوچھا کہ گلو کہاں رہتا ہے۔ اس نے مجھے ایک گاؤں کا نام لے کر بتایا کہ گلو وہاں رہتا ہے۔ یہ گاؤں میرے تھانے سے چھ سات میل کے فاصلے پر تھا اور میرے علاقے میں نہیں آتا تھا۔ میں نے پرکاش کا پورا بیان لکھ لیا اور اسے گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا۔

گھیاڑ حوالدار

کسی دوسرے علاقے کے تھانے سے کوئی ملزم گرفتار کرنا ہو تو اس کا ایک قانونی طریقہ ہوتا ہے۔ میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور چند کانسٹیبل ساتھ لے کر گلو کو گرفتار کرنے کے لیے چل پڑا۔ اس علاقے کا تھانیدار ایک سکھ تھا۔ اس کا نام گجندر سنگھ تھا۔ میں اس کے پاس چلا گیا۔ وہ سکھوں کی روایتی زندہ دلی سے ملا اور میری خاطر تواضع کا انتظام کرنے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں کس مقصد کے لیے آیا ہوں۔

"تُسی جل پانی کرو ملک جی!" سردار گجندر سنگھ نے کہا۔ "تہاڈا ملزم تہانوں مل جائے گا۔"

یہ کہہ کر گجندر سنگھ نے اپنے ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبلوں کو گلو کے گاؤں بھیجا کہ وہ جہاں بھی ملے اسے پکڑ کر لے آئیں۔ سردار گجندر سنگھ نے کھانے کا بڑا ہی پُرتکلف بندوبست کیا تھا۔ کھانے کے بعد اس نے مجھ سے کسی اور خدمت کے لیے بھی پوچھا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ وہ دراصل مجھے شراب کے لیے پوچھ رہا تھا۔ سکھ سگریٹ بالکل نہیں پیتے لیکن شراب کھل کر پیتے ہیں۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد گجندر سنگھ کا ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبل ایک آدمی کو گرفتار کر کے لے آئے۔ اسے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ گلزار عرف گلو ہے۔ وہ دائیں ٹانگ پر بیساکھی کے سہارے چل رہا تھا۔ اسے تانگے پر بٹھا کر لائے تھے۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے پر زخم کا ایک بڑا لمبا نشان بڑا واضح نظر آ رہا تھا۔ یہی شخص میرا مطلوبہ ملزم تھا۔

گلو نے دیسی جوتی پہنی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی جوتی اُتروا کر تلا دیکھا۔ میری توقع کے مطابق جوتی کی ایڑی کے سرے پر چمڑے کا ایک ٹکڑا لگا ہوا تھا۔ میں نے کچی زمین پر اس کا نشان بنا کر دیکھا تو بالکل ویسا ہی تھا جیسا جائے واردات والے کُھرے میں نظر آیا تھا۔

سردار گجند رسنگھ نے قانونی کارروائی کے بعد ملزم باقاعدہ میرے حوالے کر دیا۔ میں نے سردار گجند رسنگھ کا شکریہ ادا کیا اور گلو کو لے کر اپنے تھانے آ گیا۔ جس وقت میں اپنے تھانے میں پہنچا، مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ میں تھک چکا تھا۔ میں نے باقی کارروائی سے پہلے تھوڑا آرام کرنا مناسب سمجھا تاکہ تازہ دم ہو کر تفتیش کر سکوں۔ میں نے اے ایس آئی مہندر سنگھ کو سمجھایا کہ میں رات کو ملزم سے پوچھ گوچھ کروں گا لہٰذا وہ ملزم کو تیار رکھے۔ ملزم کو تیار رکھنے کا مطلب مہندر سنگھ سمجھتا تھا کہ ملزم کو سونے نہیں دینا اور اسے ذہنی طور پر اس حالت میں لے آنا ہے کہ وہ اقبال جرم کرنے میں دیر نہ لگائے۔ مہندر سنگھ کو اچھی طرح سمجھا کر میں اپنے کوارٹر میں آ کر سو گیا۔

جب میں سو کر جاگا تو رات کے دس بج چکے تھے۔ میں نے بارہ بجے تک انتظار کیا اور پھر تھانے چلا گیا۔ تھانے کے عملے کو میری آمد کا پتہ تھا، اس لیے سارا عملہ الرٹ تھا اور تھانے میں دن چڑھا ہوا تھا۔ میں نے جاتے ہی گلزار عرف گلو کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ کچھ دیر بعد ایک ہیڈ کانسٹیبل گلو کو لے کر آ گیا۔ گلو کی حالت اچھی نہیں تھی۔ نیند کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور وہ جھوم رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے کھانے میں عمدہ اور مرغن غذا دی گئی تھی۔ ایسی خوراک کی وجہ سے نیند بہت زیادہ آتی ہے۔

ہیڈ کانسٹیبل نے گلو کو میرے سامنے کھڑا کر دیا۔ گلو کی آنکھیں بار بار نیند کی وجہ سے بند ہو رہی تھیں۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو اشارے سے سمجھایا کہ اسے سونے نہیں دینا۔ جونہی گلو کی آنکھیں بند ہوتیں ہیڈ کانسٹیبل اس کے بال پکڑ کر ایک زوردار جھٹکا دے دیتا۔ میں نے اسے کھڑا ہی رکھا، بیٹھنے کو نہ کہا۔

''تم اپنی گرفتاری کی وجہ سمجھ گئے ہو گے گلو!'' میں نے اس سے کہا۔ ''میں نے تمہیں یوں ہی گرفتار نہیں کر لیا۔ میرے پاس تمہارے خلاف مکمل ثبوت اور شہادت موجود ہے کہ تم نے حوالدار بختیار کو قتل کیا ہے۔ جائے واردات پر تمہارے مخصوص کُھرے پائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ تمہارے دوست پرکاش نے سب کچھ اگل دیا ہے اور قتل کی وجہ بھی بتا دی ہے۔ تمہارے لیے اب اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں کہ اقبال جرم کر لو...... بولو، اقبالی بیان دو گے؟''

''ہاں، اس بگھیاڑ کو میں نے مارا ہے۔'' گلو نے نیند سے پیچھا چھڑانے کے لیے اپنے سر

کو زور زور سے جھٹکتے ہوئے پھٹ کر کہا۔ ''میرا عہد پورا ہو گیا ہے۔ میں اب زندہ نہیں رہنا چاہتا...... پوچھو، کیا پوچھتے ہو؟''

بگھیاڑ کے نام پر میں چونکا۔ اس نے حوالدار بختیار کو بگھیاڑ کہا تھا۔ میں نے کہانی کے آغاز میں لکھا ہے کہ حوالدار بختیار کی لاش کا معائنہ کرتے ہوئے جب میں نے اس کا چہرہ دیکھا تھا تو اس کے خدوخال دیکھ کر مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا تھا جسے میں اس وقت کوئی نام نہیں دے سکا تھا۔ اب ملزم گلو نے اسے بگھیاڑ کہا تو ایک دم میری آنکھوں کے سامنے بختیار کا چہرہ آ گیا۔ اس چہرے کو دیکھ کر واقعی کسی بگھیاڑ کا تاثر ابھرتا تھا۔ آپ جانتے ہوں گے بگھیاڑ پنجابی زبان میں بھیڑیئے کو کہتے ہیں۔

گلو نے بیان دینے پر آمادگی ظاہر کر دی تو میں نے اسے کرسی پر اپنے سامنے بٹھا لیا۔ اس نے بڑی تفصیل سے ہر بات بتائی۔ درمیان میں جہاں ضرورت پڑی، میں اس سے سوال بھی کرتا گیا۔ اس کا طویل بیان میں آپ کو ذرا مختصر کر کے سنا دیتا ہوں۔

انتقام لے لیا

یہ ان دنوں کی بات ہے جب جنگِ عظیم زوروں پر تھی اور فوجی محاذِ جنگ پر مکھیوں اور مچھروں کی طرح مر رہے تھے۔ انگریزوں نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر فوج میں بھرتی کی مہم شروع کر رکھی تھی اور اس کے لیے پُرکشش مراعات کا لالچ دے رکھا تھا۔ فوج میں بھرتی کے لیے کوئی خاص معیار نہیں تھا، بس جو بھی صحت مند آدمی مل جاتا، اسے بھرتی کر لیتے۔

گلو نوجوان تھا۔ یہ غریب لوگ تھے۔ ان کی اپنی کوئی زمین نہیں تھی۔ گلو کا باپ دوسروں کی زمین بٹائی پر لے کر کھیتی باڑی کرتا تھا اور اس طرح گھر کا راشن پانی چلتا تھا۔ گلو بڑا ہوا تو باپ کا ہاتھ بٹانے لگا لیکن اسے یہ کام پسند نہ تھا۔ گلو کی ماں نے اس کی منگنی اس کی پھوپھی کی بیٹی سے کر رکھی تھی۔ یہ لڑکی بہت خوبصورت اور سگھڑ تھی اور گلو اسے پسند بھی کرتا تھا۔ اس پسند کو عشق بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس لڑکی کے رشتے کے اور بھی برادری میں کئی اُمیدوار تھے لیکن گلو کی پھوپھی اپنی بیٹی کو بھائی کے گھر میں دینا چاہتی تھی۔ لڑکی بھی اس رشتے سے بہت خوش تھی۔

انہی دنوں فوج میں بھرتی شروع ہو گئی تو گلو بھی فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ سال ڈیڑھ سال میں کچھ پیسے جمع کر کے شادی کر لے گا۔ گلو کے دو بڑے بھائی تھے وہ دونوں شادی شدہ تھے۔ یہ سب لوگ اکٹھے رہتے تھے۔ جب لڑائی نے زور پکڑا تو ایک دن گلو کی یونٹ کو اگلے مورچوں پر جانے کا حکم ملا۔ یہ برما کا محاذ تھا۔ جاپانی فوج بڑی تیزی سے بڑھتی ہوئی

برما تک آ پہنچی تھی۔

پرکاش بھی اسی یونٹ میں تھا۔گلو اور پرکاش میں بے تکلفی پیدا ہوگئی تھی۔بختیار اس یونٹ میں حوالدار تھا اور گلو اور پرکاش سپاہی تھے اور بختیار کے ماتحت تھے۔حوالدار بختیار بہت سخت گیر انسان تھا۔اس کی طبیعت کی سختی اس کے چہرے سے بھی ظاہر ہوتی تھی اور جب وہ غصے میں بات کرتا تو اس کی آواز میں کسی بھیڑیئے کی سی غراہٹ شامل ہو جاتی تھی۔اس کی شکل اور اس غراہٹ کی وجہ سے یونٹ کے لوگ اسے پیٹھ پیچھے حوالدار بختیار کی بجائے حوالدار بگھیاڑ کہنے لگے۔رفتہ رفتہ یونٹ کا ہر بندہ اسے بگھیاڑ ہی کہنے لگا۔بگھیاڑ کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

پرکاش اور گلو اس کے ماتحت ہونے کی وجہ سے خاص طور پر اس کی سخت گیری کا نشانہ بنتے تھے۔گلو تو اس حوالدار سے اس حد تک تنگ آ چکا تھا کہ ایک دن اس نے پرکاش سے کہا کہ کسی دن سخت گولہ باری اور فائرنگ کے دوران موقع پا کر وہ اس بگھیاڑ کو گولی مار دے گا لیکن اس کو ایسا موقع نہ ملا اور پھر وہ حادثہ ہو گیا جس کی وجہ سے گلو کی بائیں ٹانگ بیکار ہو گئی۔یہ واقعہ میں پرکاش کی زبانی پہلے بیان کر چکا ہوں۔

گلو بیکار ہو کر گھر آ گیا۔لنگڑا ہونے کے ساتھ ساتھ چہرے پر آنے والے زخم کی وجہ سے وہ بدصورت بھی ہو گیا تھا۔اس کی پھوپھی نے اس کی یہ حالت دیکھی تو رشتہ توڑنے کا اعلان کر دیا۔گلو کو اس کا بہت دکھ ہوا۔پھر اس نے سنا کہ اس کی منگیتر نے یہ کہہ کر اس کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ وہ ساری عمر ایک لنگڑے اور بدصورت خاوند کے ساتھ نہیں گزار سکتی۔

گلو اس سارے واقعے کا ذمہ دار حوالدار بختیار کو سمجھتا تھا۔اس کے دل میں بختیار کے خلاف اتنی زیادہ نفرت بھر گئی کہ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ محاذِ جنگ پر جا کر اسے گولی مار دیتا۔اس واقعے کے ایک ماہ بعد پرکاش بھی زخمی ہو کر اپنے گاؤں آ گیا تھا۔ان دونوں کے درمیان بڑی پکی دوستی ہو گئی تھی۔دونوں میں خط و کتابت کے ذریعے رابطہ رہنے لگا۔

گلو کو پتہ تھا کہ حوالدار بختیار پرکاش کے ساتھ والے گاؤں کا رہنے والا ہے۔اس نے پرکاش سے کہہ رکھا تھا کہ جب بھی کبھی حوالدار اپنے گاؤں میں آئے، وہ اسے یعنی گلو کو اس کی اطلاع کر دے۔پھر جنگ ختم ہو گئی۔جنگ ختم ہوئے دو تین ماہ ہوئے ہوں گے جب حوالدار بختیار ریٹائر ہو کر اپنے گاؤں میں آ گیا۔پرکاش کو پتہ لگا تو اس نے گلو کو خط لکھ کر اس کی اطلاع دے دی۔

ادھر گلو کی منگیتر کی شادی کسی اور جگہ ہو گئی تھی۔گلو نے قسم کھائی تھی کہ وہ حوالدار بختیار کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر کے اپنا بدلہ لے گا۔اطلاع ملتے ہی وہ ایک گھوڑی پر سوار ہو کر رات کے

وقت پرکاش کے پاس جا پہنچا اور پرکاش کے گھر میں رہا۔اس نے ایک لمبا چاقو اپنے کُرتے کی جیب میں گھر سے نکلتے وقت رکھ لیا تھا۔

دن کے وقت پرکاش اور گلو گھوڑیوں پر سوار ہو کر بختیار کے گاؤں چلے گئے۔وہ گاؤں کے اندر داخل نہ ہوئے بلکہ باہر ہی باہر سے چکر کاٹ کر کھیتوں کی طرف چلے گئے۔پرکاش نے چند دنوں میں یہ معلوم کر لیا تھا کہ بختیار رات کو کھیتوں میں سوتا ہے۔بختیار کے پاس بندوق تھی جو وہ رات کو ساتھ رکھتا تھا۔یہ دشمن دار لوگ تھے اور بختیار کا کہنا تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی دشمن میں اتنی جرأت نہیں کہ ان کی فصل کی طرف دیکھ بھی سکے۔

پرکاش نے دور سے گلو کو وہ کھیت دکھائے جہاں رات کو بختیار سوتا تھا۔گلو نے اچھی طرح سب کچھ ذہن نشین کر لیا اور وہ واپس آ گئے۔اب گلو بے چینی سے رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔آدھی رات کے قریب وہ پرکاش کے گھر سے نکلا۔ان کے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ گلو حوالدار کو قتل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو واپس پرکاش کے پاس نہیں آئے گا اور اگر کسی وجہ سے وہ یہ کام نہ کر سکا تو واپس پرکاش کے پاس آ جائے گا اور اگلی رات پھر کوشش کرے گا۔

آدھی رات کے بعد کا وقت ہو گا جب گلو بختیار کے گاؤں کے باہر سے ہوتا ہوا کھیتوں والی طرف پہنچ گیا۔اس نے دور سے دیکھا تو اسے حوالدار ایک چارپائی پر سویا نظر آیا۔گلو بڑی احتیاط سے گھوڑی کو آہستہ روی سے چلاتا ہوا اس کھیت کے کنارے تک پہنچ گیا جہاں حوالدار سو رہا تھا۔اس نے گھوڑی ایک درخت کے ساتھ باندھی اور گھوڑی کی کاٹھی کے ساتھ بندھی ہوئی بیساکھی اتاری اور بڑی مہارت کے ساتھ سوئے ہوئے حوالدار کی طرف بڑھنے لگا۔حوالدار اپنی موت سے بے خبر گہری نیند سو رہا تھا۔دو اڑھائی بجے رات کا وہ وقت ہوتا ہے جب نیند بڑی گہری ہو جاتی ہے۔

گلو کسی قسم کی آہٹ پیدا کئے بغیر سوئے حوالدار کے قریب جا پہنچا۔وہ حوالدار کے سر والی طرف سے گیا تھا تا کہ اگر سوئے ہوئے حوالدار کی آنکھ کسی وجہ سے کھل بھی جائے تو اسے گلو نظر نہ آئے۔اس نے بیساکھی زمین پر رکھ دی اور چاقو نکال کر بڑے اطمینان اور پورے قہر اور نفرت کے ساتھ سوئے ہوئے حوالدار کے دل کے مقام پر وار کیا۔چاقو کھا کر حوالدار ایک جھٹکے سے اٹھا اور اس کے حلق سے ایک اذیت ناک کراہ نکل گئی۔اس نے دائیں ہاتھ سے بندوق پکڑ لی۔اسی وقت گلو نے اس کے سینے پر دوسرا وار کیا۔بندوق حوالدار کے ہاتھ سے نکل کر چارپائی سے نیچے جا گری۔گلو اس وقت انتقام کے جوش میں باؤلا ہو چکا تھا۔اس نے تیسرا وار حوالدار کے پیٹ کیا اور چاقو پیٹ میں اتارنے کے بعد ایک جھٹکے سے کھینچ کر پیٹ پھاڑ دیا۔

حوالدار منہ کے بل آدھا چار پائی سے نیچے جا پڑا اور اس کا نچلا دھڑ چار پائی پر ہی رہا۔

خون فواروں کی طرح نکل رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں خون کے ساتھ ساتھ حوالدار کی جان بھی نکل گئی۔ گلو نے خون آلود چاقو حوالدار کے کپڑوں سے صاف کیا اور جیب میں ڈال کر اپنی بیساکھی اٹھائی اور گھوڑی کے پاس جا کر اس کی لگام درخت سے کھولی اور سوار ہو کر رات کے اندھیرے میں اپنے گاؤں کی طرف نکل گیا۔ راستے میں نے ایک نالے سے چاقو اچھی طرح دھویا اور اپنے کپڑوں کو غور سے دیکھ کر خون کی جو چھینٹیں پڑی تھیں وہ بھی صاف کر لیں۔

پو پھٹنے سے پہلے وہ اپنے گاؤں پہنچ گیا۔ کسی کو اس پر شک نہ ہوا کہ وہ کیا کر آیا ہے۔ گلو نے مجھے بڑی لمبی بات سنائی تھی جو میں نے مختصر کر کے آپ کو سنائی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ چاقو کہاں ہے جس سے اس نے حوالدار کو قتل کیا تھا تو اس نے بتایا کہ وہ چاقو اپنے گھر میں پر چھتی پر پھینک دیا تھا۔ اب بھی وہیں ہوگا۔

میں نے اس کا سارا بیان لکھ لیا تھا۔ بیان پر اس کے دستخط کروا لئے۔ صبح ہوئی تو میں اس کو ساتھ لے کر آلۂ قتل برآمد کرنے کے لیے اس کے گاؤں روانہ ہو گیا۔ اس کے گاؤں پہنچ کر میں نے نمبردار اور دو معزز آدمیوں کو ساتھ لیا اور ہم گلو کے گھر چلے گئے۔ نمبردار اور دونوں گواہوں کے سامنے گلو نے بڑی مشکل سے پر چھتی سے چاقو اتار کر دیا۔

میں نے گلو کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر کے زیر دفعہ 164 اس کا بیان قلمبند کرا دیا۔ گلو نے وہی بیان مجسٹریٹ کے سامنے بھی دے دیا۔ میں نے کیس تیار کر کے عدالت میں پیش کر دیا۔ پرکاش نے بھی بیان دے دیا تھا۔ گلو وہاں بھی اپنے بیان پر قائم رہا۔ موقعہ کا کوئی گواہ نہیں تھا۔ اگر گلو اپنے بیان سے منحرف ہو جاتا تو بچ سکتا تھا لیکن اسے اب زندہ رہنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے بیان دیتے ہوئے بتایا تھا کہ معذور ہونے کی وجہ سے اس کے بھائیوں اور بھابیوں کا رویہ اس کے ساتھ اچھا نہیں رہا تھا اور وہ اسے بوجھ سمجھنے لگے تھے۔

سیشن جج نے گلو کو موت کی سزا سنا دی اور پرکاش کو اعانتِ جرم میں پانچ سال قید سنائی گئی۔ گلو کے باپ نے ہائی کورٹ میں اپیل کی۔ ہائی کورٹ نے گلو کی موت کی سزا عمر قید میں تبدیل کر دی۔ گلو کا باپ اس کی جان بچ جانے پر خوش تھا لیکن گلو کو اس بات کی ذرا بھی خوشی نہ تھی۔

☆======☆======☆

بات غیرت کی تھی

قتل کو ایک لمحے کا پاگل پن کہا گیا ہے۔ یہ بات بالکل صحیح ہے۔ ایک ایسے شخص کے عبرت ناک انجام کی کہانی جو دوہرے کردار کا مالک تھا۔ وہ اپنی بیوی سے محبت بھی کرتا اور نفرت بھی لیکن اس کی محبت ہمیشہ نفرت پر غالب آ جاتی تھی لیکن پھر ایک دن......

انسان کی فطرت ایک عجوبہ ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ پرانے لوگ گزرتے جاتے ہیں اور نئے پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ نئے دور کے لوگ جدید سہولیات کو اپنا کر، جدید ملبوسات پہن کر اپنے آپ کو مہذب گردانتے ہیں مگر وہ یہ نہیں سوچتے کہ لباس بدل جانے سے انسان کی فطرت نہیں بدل جاتی۔ جو جرائم پہلے زمانے کے لوگ کرتے تھے، وہ آج بھی ہوتے ہیں بلکہ آج بے تحاشا ہو رہے ہیں۔ اگر پولیس کا ریکارڈ دیکھیں تو ایسی ایسی وارداتیں ملیں گی جن کو آپ ناقابلِ یقین تصور کریں گے اور کہیں گے کہ کوئی انسان ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔

روپے پیسے، جائیداد کا لالچ، محبت، رقابت، حسد اور حسین اور من چاہی عورت کے حصول کی خواہش بعض انسانوں پر کسی آسیب کی طرح سوار ہو جاتی ہے اور اس آسیب کے زیر اثر انسان ایسی ایسی حرکتیں کر گزرتا ہے جو ہوش والے انسان کے لیے ناقابلِ یقین ہوتی ہیں بلکہ جب ایسا کوئی مجرم پکڑا جاتا ہے اور شیطانی اثر سے آزاد ہوتا ہے تو خود بھی حیران رہ جاتا ہے کہ اس نے یہ واردات کی تھی۔ اسی لئے انسانی نفسیات کے ماہرین نے قتل کو ایک لمحے کا پاگل پن کہا ہے۔

واردات جو میں آپ کو سنانے لگا ہوں قیامِ پاکستان کے بعد کی ہے۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب وطنِ عزیز کو معرضِ وجود میں آئے گیارہ سال گزر چکے تھے۔ ان دنوں ایوب خان نے پاکستان کی حکومت سنبھال لی تھی۔ ایوب خان نے پاکستان کے پہلے صدر سکندر مرزا کو ہٹا کر مارشل لاء نافذ کر دیا تھا۔ یہ غالباً اکتوبر 1958ء کی بات ہے۔ ان دنوں میں وسطی پنجاب کے ایک دیہاتی علاقے میں تعینات تھا۔ یہ بڑا سرسبز و شاداب علاقہ تھا۔ میرے تھانے کے علاقے میں اردگرد کے پانچ گاؤں آتے تھے۔ یہ زیادہ بڑے گاؤں نہیں تھے۔ ویسے بھی ان وقتوں میں آبادی کا یہ عالم نہیں تھا جو آج ہے۔ آج تو دور دراز دیہات میں بھی بجلی پہنچ گئی

ہے اور سڑکوں کا جال بچھ گیا ہے۔ جن دنوں کی میں بات کر رہا ہوں، بجلی تو بڑی بات ہے، وہاں پکی سڑک کا بھی نام و نشان نہ تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ پسماندہ علاقہ تھا۔

گرمیوں کے ابتدائی دن تھے اور گرمی نے ابھی زور نہیں پکڑا تھا لیکن پھر بھی دوپہر کے وقت بہت گرمی لگتی تھی اور کمروں میں بیٹھ کر کام کرنا دشوار ہو جاتا تھا۔ میں تھانے کے صحن میں ایک درخت کے نیچے بیٹھا کام کر رہا تھا۔ کمرے کی نسبت درخت کی گھنی چھاؤں میں کچھ ٹھنڈک تھی کیونکہ ہوا چل رہی تھی۔ میرے تھانے کے محرر نے درخت کے نیچے ہی ایک میز اور کرسی رکھوا دی تھی۔ میں محرر کو کچھ ضروری نوٹس لکھوا رہا تھا کہ ایک معزز صورت شخص مجھ سے ملنے آ گیا۔ میں اسے جانتا تھا۔ وہ قریبی گاؤں کا نمبردار تھا۔ بڑا ہی خوشامدی قسم کا انسان تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر تھانے آ جاتا اور لوگوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے مجھے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ میرا مخبر تھا۔

مجھے ایسے لوگ سخت ناپسند تھے لیکن یہی لوگ میرے بڑے کام بھی آتے تھے۔ اس وجہ سے میں بظاہر اس شخص سے بڑے تپاک سے ملا، اسے بٹھایا اور آنے کی وجہ پوچھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ ایک حادثہ ہو گیا ہے اور وہ اس کی اطلاع مجھے دینے آیا ہے۔

اس نے جو بات مجھے سنائی وہ میں آپ کو سنا دیتا ہوں۔ اس کے گاؤں کا ایک عیسائی برکت مسیح اپنی گھر والی کو سائیکل کے پیچھے بٹھائے کہیں جا رہا تھا۔ جب وہ چھوٹی نہر کے پُل پر پہنچا تو اچانک مخالف سمت سے ایک بیل گاڑی بڑی تیزی رفتاری سے آئی۔ بیل کسی وجہ سے بھڑکے ہوئے تھے اور گاڑی بان کے کنٹرول سے نکل کر منہ زور ہو چکے تھے۔ اس نہر کے پُل کے دونوں طرف حفاظتی جنگلہ یا ریلنگ نہیں تھی جیسا کہ آج کل ہوتا ہے۔ بیل گاڑی بے قابو ہو کر برکت مسیح پر چڑھ دوڑی۔ اس نے بچنے کی کوشش کی تو وہ دونوں میاں بیوی سائیکل سمیت نہر میں جا پڑے۔ بلندی بہت زیادہ نہیں تھی مگر پھر بھی جب تک برکت مسیح سنبھلتا اور بیوی کو سنبھالتا، وہ کافی غوطے کھا چکی تھی۔ برکت مسیح جب تک بیوی کے پاس پہنچا وہ نیم مُردہ ہو چکی تھی۔ برکت مسیح اسے پکڑ کر پانی سے باہر لا رہا تھا کہ اس کی بیوی نے اس کے ہاتھوں میں دم توڑ دیا اور وہ مُردہ بیوی کو لے کر باہر نکلا۔

یہ ایک سیدھا سادہ حادثہ تھا اور اس میں بہ ظاہر پولیس کی دلچسپی والی کوئی بات نہ تھی۔ پھر بھی میں نے نمبردار سے کچھ سوال پوچھ کر اپنی تسلی کر لی۔ اس واقعے کے بارے میں کوئی رپورٹ درج کرنا ضروری نہ تھا۔ نمبردار اپنا فرض سمجھ کر اور میری خوشنودی حاصل کرنے کے

لیے تھانے اطلاع دینے آ گیا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ چلا گیا۔

اسے گئے مشکل سے آدھا گھنٹہ گزرا ہوگا کہ وہ دوبارہ تھانے میں آ گیا۔ اس کے ساتھ بارہ تیرہ برس عمر ایک لڑکا تھا۔ اس کے چہرے سے دبا دبا جوش ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی اہم خبر لے کر آیا ہے یا کوئی نیا انکشاف کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور اس سے پوچھا کہ ایسی کون سی نئی بات ہوگئی ہے کہ وہ دوبارہ آ گیا ہے۔

''ملک صاحب!'' اس نے بڑے جوش سے کہا۔ ''معاملہ گڑبڑ ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیران ہو کر کہا۔ ''کون سا معاملہ گڑبڑ ہے؟''

''وہ جی برکت مسیح اور اس کی گھر والی کا معاملہ گڑبڑ ہے۔'' اس نے کہا۔ ''آپ فوراً چلیں۔''

''صاف صاف بتاؤ بات کیا ہے۔'' میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ ''کیا گڑبڑ گڑبڑ لگا رکھی ہے۔ مجھے پوری بات بتاؤ۔''

''پوری بات آپ کو یہ لڑکا سنائے گا ملک صاحب!'' اس نے لڑکے کی طرف اشارہ کیا اور پھر اسے میرے سامنے کھڑا کرتے ہوئے کہا۔ ''اوئے کاکا، جو کچھ تم نے دیکھا ہے وہ ملک صاحب کو بتاؤ۔''

لڑکا پہلے تو جھجکتا رہا لیکن پھر میرے مشفقانہ رویے کی وجہ سے بولنے لگا۔ اس نے جو بات سنائی اسے سن کر میں حیران رہ گیا اور سیدھا سادہ حادثہ مجھے قتل کا کیس نظر آنے لگا۔ لڑکے نے جو بات سنائی وہ میں آپ کو سنا دیتا ہوں۔

حادثہ یا قتل؟

یہ لڑکا اسی نمبردار کے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ جس وقت یہ حادثہ ہوا، یہ لڑکا نہر کے پُل کے قریب ہی ایک جامن کے درخت پر چڑھا جامن اتار رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گرمیوں کے دن تھے، اس لیے اردگرد کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے دیکھا ایک طرف سے ایک سائیکل سوار آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ سائیکل والا جونہی نہر کے پل پر چڑھا، مخالف سمت سے ایک بیل گاڑی نہر کے پُل کی طرف آئی۔ اس کے بیل گاڑی بان کے قابو میں نہیں تھے۔ بے قابو بیل گاڑی سائیکل پر چڑھ دوڑی۔ سائیکل والے نے گھبرا کر سائیکل موڑی تو سائیکل سمیت نہر میں جا گرا۔ بیل رکے نہیں بلکہ وحشت زدہ انداز میں بھاگتے

چلے گئے۔

لڑکے نے درخت کے اوپر سے دیکھا کہ سائیکل کے پیچھے بیٹھی ہوئی عورت پانی میں ہاتھ مار رہی تھی۔ لڑکے نے بتایا کہ وہ ان میاں بیوی کی مدد کے لیے اس لیے درخت سے نہیں اُترا کہ اسے معلوم تھا کہ اس نہر میں پانی اتنا گہرا نہیں کہ کوئی ڈوب سکے۔ پھر اس عورت کا مرد ساتھ تھا۔ اس نے دیکھا کہ مرد پانی میں تیرتا ہوا عورت کے پاس پہنچا جو بری طرح گھبرا گئی تھی اور پانی میں اُلٹے سیدھے ہاتھ مار رہی تھی لیکن مرد کی حرکتیں مشکوک سی لگ رہی تھیں۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ اسے عورت کو بچانے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پھر مرد نے اس کے ہاتھ پکڑنے کے بجائے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور نیچے کو دبا دیا۔ عورت کے پھیپھڑوں میں خاصا پانی چلا گیا ہوگا جب وہ تڑپ کر اوپر اُبھری۔

لڑکے نے بتایا کہ وہ حیران و پریشان یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ عورت جب پانی سے اوپر اُبھری تو مرد نے اس کا گلا پکڑ کر دبانا شروع کر دیا اور عورت تڑپنے لگی۔ مرد نے اسی طرح گلا دبائے دبائے اسے پھر پانی میں ڈبو دیا اور کافی دیر پانی کے اندر ہی دبائے رکھا۔ پھر اس نے عورت کو باہر نکالا تو وہ ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ چکی تھی۔ مرد نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ نزدیک کوئی بندہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ دور کھیتوں میں کچھ کسان کام کر رہے تھے اور کچھ درختوں کے سائے میں بیٹھے تھے۔ اس نے پکار پکار کر ان کو بلانا شروع کر دیا۔ تھوڑی سی دیر میں سات آٹھ آدمی وہاں پہنچ گئے۔ یہ لڑکا بھی جامن کے درخت سے اُتر کر ان کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔

اس وقت تک مرد، عورت کو کنارے پر لے آیا تھا۔ قریب جا کر پتہ چلا کہ وہ عورت مر چکی ہے۔ اس کا مرد لوگوں کو بتا رہا تھا کہ کس طرح بھڑکے ہوئے بیلوں کے ڈر کی وجہ سے وہ میاں بیوی نہر میں گر پڑے تھے اور اس کی بیوی ڈوب کر مر گئی۔ لوگوں نے اس سے افسوس کا اظہار کیا۔ ایک شخص نے جو غوطہ خوری جانتا تھا، اس کی سائیکل ڈھونڈ کر نہر سے باہر نکالی۔ پھر ایک آدمی اپنا ریڑھا لے آیا اور عورت کی لاش اس میں رکھ کر گاؤں چلے گئے۔

لڑکے نے بتایا کہ اس نے کسی کے ساتھ یہ بات نہیں کی کیونکہ وہ بہت زیادہ خوفزدہ تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے ایک انسان کو دوسرے انسان کا قتل کرتے دیکھا تھا۔ وہ اتنا خوفزدہ ہوا کہ گاؤں جانے کے بجائے اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ جب نمبردار تھانے میں حادثے کی اطلاع مجھے دے کر جا رہا تھا تو راستے میں اس لڑکے کا اور نمبردار کا آمنا سامنا ہوگیا۔ لڑکے نے بہتر یہی سمجھا کہ ساری بات نمبردار کو بتا دے۔ نمبردار نے یہ بات سنی تو لڑکے کو لے کر انہی قدموں

لوٹ کر تھانے آ گیا۔

میں نے جب ساری بات سنی تو مجھے واقعی معاملہ گڑبڑ نظر آنے لگا۔ میں نے نمبردار سے کچھ ضروری باتیں پوچھیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ نہر اتنی گہری ہے کہ بندہ اس میں ڈوب جائے۔ نمبردار نے بتایا کہ یہ نہر عام نہروں سے ذرا چھوٹی ہے اور اس کی گہرائی بھی اتنی زیادہ نہیں کہ کوئی ڈوب کر مر جائے۔ نمبردار نے یہ بھی بتایا کہ پانی سے پُل کی بلندی بھی اتنی نہیں کہ گرنے کی وجہ سے کوئی چوٹ لگے۔

خطرناک حسن

اب یہ بات صاف تھی کہ برکت مسیح نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے۔ وجہ قتل معلوم کرنا ضروری تھا۔ میں نے نمبردار سے پوچھا کہ کیا اسے معلوم ہے کہ ان کے گھر لڑائی جھگڑا رہتا ہو یا کوئی اور وجہ ایسی ہوئی ہو کہ برکت مسیح نے تنگ آ کر اپنی بیوی کو قتل کر دیا ہو۔

''لڑائی جھگڑے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ملک جی!'' نمبردار نے کہا۔ ''وہ تو اپنی بیوی کا دیوانہ تھا۔ سارے گاؤں میں مشہور تھا کہ وہ بیوی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کچھ لوگ تو اسے رَن مرید بھی کہتے ہیں...... اس کی بیوی تھی بھی اتنی خوبصورت کہ کوئی بھی اس کا خاوند ہوتا، اس کا غلام بن کر رہتا۔''

نمبردار کا یہ جواب سن کر مجھے مایوسی ہوئی کہ برکت مسیح اور اس کی بیوی میں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں تھا اور یہ کہ برکت مسیح اس کو دیوانگی کی حد تک پیار کرتا تھا۔ یہ باتیں سن کر مجھے لڑکے کے بیان پر شک ہونے لگا تھا کہ ہو سکتا ہے وہ غلط سمجھا ہو اور برکت مسیح واقعی اپنی گھر والی کو بچانے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ جلد بازی میں کسی نتیجے پر پہنچنا بہتر نہ ہو گا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ پہلے مرنے والی کی لاش کا معائنہ کروں گا، اس کے بعد کوئی قدم اٹھاؤں گا۔

میں نے دو کانسٹیبل ساتھ لئے اور نمبردار کو ساتھ لے کر برکت مسیح کے گھر کی طرف چل پڑا۔ مجھے نمبردار نے بتایا کہ برکت مسیح کی گھر والی کا نام کامنی تھا۔ میں نے حساب لگایا کہ کامنی کو مرے کتنا وقت گزر چکا ہے۔ میرے حساب سے کامنی کو مرے ابھی صرف اڑھائی تین گھنٹے ہوئے تھے۔ میں وقت کا حساب اس لیے لگا رہا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ زیادہ وقت گزر جائے اور کامنی کو دفن کر دیا جائے۔ اگر کامنی کو دفن کر دیا جاتا تو پھر قبر کشائی کے لیے مختلف مراحل سے گزرنا

پڑتا۔ میں اس سے بچنا چاہتا تھا۔ میرے پاس کوئی واضح ثبوت بھی نہیں تھا کہ کامنی کو واقعی قتل کیا گیا ہے۔

بہرحال انہی سوچوں میں گم کامنی کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر پتہ لگا کہ ابھی تک کامنی کو دفن نہیں کیا گیا۔ کامنی کے ماں باپ اڑھائی تین میل دور کے ایک گاؤں میں رہتے تھے، وہ آ چکے تھے۔ اب کامنی کی ایک خالہ کا انتظار تھا جو ذرا دور رہتی تھی۔ وہاں رونا دھونا مچا ہوا تھا۔ کامنی کی ماں کے بَین برداشت نہیں ہو رہے تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ پولیس والے پتھر دل ہوتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ پولیس والے بھی گوشت پوست کے انسان ہوتے ہیں اور ان کے سینے میں بھی ہر انسان کی طرح گوشت پوست کا دل دھڑکتا ہے۔ یہ پولیس والوں کی مجبوری ہوتی ہے کہ ہر قسم کے حالات میں انہیں اپنا فرض پورا کرنا ہوتا ہے۔

ایک باوردی انسپکٹر اور دو کانسٹیبلوں کو دیکھ کر مرگ والے گھر ایک دم سکوت سا چھا گیا اور لوگ آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ برکت مسیح کے گھر کے باہر بھی لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ ذرا سی دیر میں ہی پورے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی تھی کہ برکت مسیح کے گھر پولیس آئی ہے۔ لوگ اسی طرف اُمڈے چلے آ رہے تھے۔

نمبردار میرے ساتھ تھا۔ میں نے نمبردار سے کہا کہ وہ برکت مسیح کو میرے پاس لائے اور اکٹھے ہو جانے والے لوگوں سے کہے کہ وہ سب منتشر ہو جائیں۔ ابھی میں یہ ہدایت دے ہی رہا تھا کہ ایک جوان آدمی ہمارے پاس آ گیا اور مجھے سلام کیا۔ نمبردار نے مجھے بتایا کہ یہی برکت مسیح ہے۔ میں نے بڑے غور سے پولیس والوں کی نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ گندمی رنگت کا صحت مند آدمی تھا اور چہرے کے نقوش بھی اچھے ہی تھے۔ میں نے اس کی آنکھوں کو دیکھا تو وہ سرخ تھیں اور اب بھی ان میں نمی نظر آ رہی تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ روتا رہا ہے۔ مجھے اس کی یہ حالت دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔

''مرد ہو کر عورتوں کی طرح آنسو بہا رہے ہو برکت!'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''مرد بنو۔''

اس نے میری طرف بڑی بے چارگی اور بے بسی سے دیکھا اور بولا کچھ نہیں۔ پھر وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں صاف کرنے لگا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا لگ رہا تھا اور میری آمد سے حیران اور پریشان نظر آ رہا تھا۔

''میں کامنی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے برکت سے کہا۔ ''اسے کیا ہوا ہے؟''

"وہ نہر میں ڈوب کر مرگئی ہے حضور!" برکت نے کہا اور پھر اس نے مجھے وہ تمام حادثہ سنا دیا جو میں پہلے سنا چکا ہوں۔

میں نے اس سے کہا کہ میں لاش دیکھوں گا پھر اس حادثے کی تصدیق کروں گا تاکہ کل کلاں کوئی نئی بات نہ نکل آئے۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ یہ محض قانونی کارروائی ہے، وہ پریشان نہ ہو۔ یہ سن کر اس کی کچھ تسلی ہوئی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ لاش والے کمرے سے تمام لوگوں کو باہر نکال دے تاکہ میں لاش کا معائنہ کرسکوں۔ وہ اندر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد مجھے اندر بلا لیا۔ لاش ایک بان کی چارپائی پر رکھی تھی۔ چارپائی پر روئی کا گدا بچھا ہوا تھا اور ایک چادر سے سر سے لے کر پاؤں تک لاش کو ڈھانپا گیا تھا۔

میں نے برکت کو بھی کمرے سے نکل جانے کو کہا تو وہ حیرانی سے میرا منہ دیکھنے لگا اور باہر جانے میں پس و پیش کرنے لگا۔ میں نے اپنے کانسٹیبلوں کو اندر بلایا اور ان سے کہا کہ وہ اسے پکڑ کر کمرے سے باہر لے جائیں اور جب تک میں نہ کہوں کسی کو اندر نہ آنے دیں۔ کانسٹیبل برکت کو کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔

برکت کے جانے کے بعد میں نے لاش کے اوپر پڑی چادر سر کی طرف سے پکڑی اور آہستگی سے کھینچ لی۔ جونہی چادر اُتری، مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ اتنی ہی حسین تھی۔ اس کی ادھ کھلی آنکھیں یوں کھلی تھیں جیسے میری ہی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ مری ہوئی بالکل نہیں لگ رہی تھی۔ اس کا بدن گورا چٹا تھا، نین نقش میں بڑی جاذبیت تھی اور جسم کی ساخت انتہائی موزوں تھی۔ کامنی کو دیکھ کر مجھے نمبردار کے الفاظ یاد آنے لگے۔ اس نے کہا تھا کہ کوئی بھی اس کا خاوند ہوتا، اس کا غلام بن کر رہتا۔ وہ بلاشبہ خطرناک حد تک حسین عورت تھی۔

میں نے بڑے غور سے اس کا نظری معائنہ کرنا شروع کر دیا۔ آخر مجھے وہ چیز نظر آ گئی جو میں تلاش کر رہا تھا۔ اس کی گردن پر ہلکا سا سرخی مائل نشان تھا جو صرف غور سے دیکھنے پر محسوس ہوتا تھا۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ گردن کے اس مقام پر دباؤ ڈالا گیا ہے یا کسی چیز سے ضرب لگی ہے۔ پھر میں نے کامنی کے سارے جسم کا جائزہ لیا مگر کوئی زخم یا چوٹ کا نشان نظر نہ آیا۔

میں نے دونوں کانسٹیبلوں کو اندر بلایا اور انہیں کہا کہ وہ برکت مسیح پر نظر رکھیں اور اسے اِدھر اُدھر نہ ہونے دیں۔ میں محض شک کی بنیاد پر کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ضروری سمجھا کہ لاش کا پوسٹ مارٹم ہو جانے کے بعد ہی کوئی کارروائی کی جائے۔ میں نے نمبردار کو بلا کر اس سے کہا کہ لاش کو لے جانے کے لیے انتظام کرے۔ نمبردار نے فوراً ایک

تانگے کا بندوبست کر دیا۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو ضروری کارروائی کے بعد کامنی کی لاش کے ساتھ شہر کے سرکاری ہسپتال بھیج دیا جہاں پوسٹ مارٹم کا بندوبست تھا۔

میں نے شک کی بنیاد پر برکت مسیح کو حراست میں لے لیا اور اسے ساتھ لے کر تھانے چل پڑا۔ میں نے برکت کو ہتھکڑی نہیں لگائی تھی۔ برکت خوفزدہ اور سہما ہوا ہمارے ساتھ چل رہا تھا۔

مقتولہ حاملہ تھی

تھانے پہنچ کر میں نے برکت کو حوالات میں بند کرا دیا اور خود اس واقعے پر غور کرنے لگا۔

یہاں میں پڑھنے والوں کو یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ پوسٹ مارٹم کیوں ضروری ہوتا ہے اور اس کی کیا اہمیت ہے؟ پوسٹ مارٹم وہ واحد طریقہ ہے جس سے موت کے اصل سبب کا تعین کیا جا سکتا ہے اور یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ مرنے والا کس وقت اور کن حالات میں مرا تھا۔ پوسٹ مارٹم میں لاش کا پیٹ اور سینہ چیر کر معائنہ کیا جاتا ہے۔ کھوپڑی بھی کھول لی جاتی ہے اور ڈاکٹر اگر ضروری سمجھے تو اندرونی اعضاء کیمیائی تجزیئے کے لیے نکال لیتا ہے۔ بعد میں لاش کا پیٹ اور کھوپڑی کو بند کر کے سی دیا جاتا ہے اور لاش وارثوں کے حوالے کر دی جاتی ہے۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کی عدالت میں خاص اہمیت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر استغاثہ یہ ثابت کرے کہ مقتول کو کلہاڑی کے وار کر کے مارا گیا ہے اور پوسٹ مارٹم رپورٹ میں یہ لکھا ہو کر مقتول کے جسم پر چاقو کے زخم کے نشانات پائے گئے ہیں تو ملزم کو شک کا فائدہ بھی مل سکتا ہے۔

ڈوب کر مرنے والے انسان کو آکسیجن نہیں ملتی اور اس کا سانس بند ہو جاتا ہے۔ پانی میں گرنے سے اچانک خوف سے بھی دل کی حرکت بند ہو جاتی ہے اور دماغ کی وریدیں پھٹ جاتی ہیں۔ ڈوب کر مرنے والوں کی آنکھیں ادھ کھلی اور پتلیاں پھیلی ہوتی ہیں۔ زبان پھول جاتی ہے۔ ناک اور منہ سے جھاگ آنے لگ جاتی ہے۔ ہاتھ اور پاؤں کی جلد سکڑ جاتی ہے۔ پھیپھڑوں، معدے اور آنتوں میں پانی بھرنے کی وجہ سے یہ اعضاء پھول جاتے ہیں۔ پانی کے علاوہ ریت اور مٹی کے ذرات بھی ملتے ہیں جو اس بات کی تصدیق کر دیتے ہیں کہ مرنے والا ڈوب کر مرا ہے۔

میں نے کامنی کی لاش کا معائنہ کیا تھا تو مجھے ڈوب کر مر جانے والی تمام علامتیں واضح طور پر نظر آئی تھیں جن سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ ڈوب جانے کی وجہ سے مری ہے لیکن اس لڑکے کا

بیان اور گردن پر دباؤ کا نشان مجھے شک میں ڈال رہے تھے اور اسی شک کو بنیاد بنا کر میں نے کامنی کا پوسٹ مارٹم ضروری سمجھا تھا۔ اب مجھے پوسٹ مارٹم رپورٹ کا انتظار تھا اور اس کے بعد ہی میں نے کوئی کارروائی کرنی تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ اگلے دن شام کو ملنی تھی۔ میں تھانے کے دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا۔

اگلے دن میں تھانے پہنچا تو ایک ہیڈ کانسٹیبل نے مجھے بتایا کہ حوالات میں بند برکت مسیح میرے ساتھ بات کرنا چاہتا ہے۔ میں برکت کو بالکل ہی بھول گیا تھا۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ اسے میرے پاس لے آؤ۔ تھوڑی دیر بعد ہیڈ کانسٹیبل برکت کو لے کر آ گیا۔ میں نے برکت کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے خراب حال میں تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ میرے خیال میں اسے حوالات میں نیند نہیں آئی ہو گی۔

میں نے اسے بیٹھنے کو کہا۔ وہ بیٹھ تو گیا لیکن اس کے انداز میں بڑی بے چینی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کرسی میں کیلیں لگی ہوئی ہیں جو اسے آرام سے بیٹھنے نہیں دے رہیں۔ میں نے اس سے حال چال پوچھا اور کہا کہ وہ میرے ساتھ کیا بات کرنا چاہتا ہے۔

''آپ نے مجھے یہاں کیوں بند کر رکھا ہے؟'' اس نے رو دینے والے انداز میں کہا۔ ''میرا کیا قصور ہے؟''

''مجھے ایک شک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور اسی شک کی وجہ سے تم یہاں نظر آ رہے ہو۔ میرا شک دور ہو جائے گا تو تمہیں چھوڑ دوں گا۔''

''میری گھر والی مر گئی ہے سرکار!'' اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''اور آپ نے مجھے یہاں بند کر دیا ہے۔ ہم غریبوں سے کیا خطا ہو گئی ہے حضور؟''

میں ابھی اس کے ساتھ اس قسم کی بات نہیں کرنا چاہتا تھا کہ مجھے شک ہے کہ اس نے اپنی گھر والی کو گلا گھونٹ کر مار ڈالا ہے۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ابھی تک مجھے صرف شک ہی تھا اور اس شک کی بنیاد میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ مجھے اب پوسٹ مارٹم رپورٹ کا انتظار تھا، اس لیے میں نے برکت سے کہا کہ ابھی اسے کچھ وقت اور حوالات میں رہنا ہو گا اور مناسب وقت پر میں اسے بلا لوں گا۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ اسے حوالات میں بند کر دو اور کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔

شام کے چار پانچ بجے کا وقت ہو گا جب ایک کانسٹیبل پوسٹ مارٹم رپورٹ لے کر آ گیا۔ میں نے بڑی بے چینی سے رپورٹ دیکھی۔ اس میں ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ کامنی کی موت کی وجہ

ڈوبنے اور سانس رک جانے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ مرنے والی کے پھیپھڑوں، آنتوں اور معدے میں اتنی مقدار میں پانی نہیں پایا گیا جتنا عام طور پر ڈوب جانے والے لوگوں کے پھیپھڑوں، آنتوں اور معدے میں پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ مرنے والی کے گلے پر دباؤ کے نشان پائے گئے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرنے والی کے گلے پر کوئی وزنی چیز لگی ہے یا اس کا گلا دبایا گیا ہے۔ ایک اور اہم بات جو ڈاکٹر نے لکھی تھی وہ یہ تھی کہ مرنے والی حاملہ تھی اور یہ حمل تیسرے ماہ میں تھا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھنے کے بعد میرا شک یقین میں بدل گیا کہ برکت مسیح نے اپنی گھر والی کو نہر میں گرنے کے بعد گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا۔ اب مجھے اس لڑکے کے بیان پر یقین ہو گیا تھا کہ اس نے بالکل ٹھیک دیکھا تھا۔ میں نے اب برکت مسیح کو تفتیش کی چکی میں ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔

رَن مرید

کامنی کی لاش پوسٹ مارٹم کے بعد آ گئی تھی۔ میں نے گاؤں میں اطلاع بھجوائی تو کامنی کا باپ اور اس کے دو بھائی لاش وصول کرنے کے لیے آ گئے۔ میں نے ضروری کاغذی کارروائی کے بعد لاش ان کے حوالے کر دی۔ کامنی کے باپ نے اپنے داماد برکت کے متعلق پوچھا کہ اسے کیوں تھانے میں رکھا گیا ہے تو میں نے اسے بتایا کہ مجھے شک ہے کہ کامنی کو اس کے خاوند نے قتل کیا ہے۔ یہ سن کر وہ بڑا حیران ہوا۔

''کیا آپ کی بیٹی اپنے گھر میں خوش تھی؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''کبھی کوئی شکایت نہیں آئی سرکار!'' کامنی کے باپ نے کہا۔ ''کامنی ہمیشہ برکت کی تعریف کرتی تھی اور وہ اپنے خاوند کے ساتھ خوش تھی۔''

''ان کے درمیان کبھی کوئی جھگڑا ہوا ہو گا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔ ''یاد کر کے بتاؤ، کبھی کامنی نے گھر آ کر بتایا ہو۔''

''نہیں سرکار!'' کامنی کے باپ نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''شادی کو دو سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ آج تک ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔''

میں نے کامنی کے باپ سے بہت سوال کئے اور مختلف طریقوں سے ایک ہی سوال گھما پھرا کر پوچھا مگر مجھے اس سے کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔

میں نے کامنی کے بھائیوں سے بھی کرید کرید کر پوچھا مگر وہ بھی میرے کام کی کوئی بات

نہ بتا سکے۔ کامنی کے بھائیوں نے کہا چونکہ برکت حوالات میں بند ہے اس لیے وہ اپنی بہن کی لاش اپنے گاؤں لے جانا چاہتے ہیں اور وہیں اس کی آخری رسوم پوری کریں گے۔ میں نے انہیں کہا کہ میری طرف سے ایسی کوئی پابندی نہیں ہے، وہ کامنی کی لاش جہاں لے جانا چاہیں، لے جائیں۔

کامنی کا باپ اور بھائی لاش لے کر چلے گئے تو میں نے برکت کو بلا لیا۔ میں نے برکت کو بتایا کہ کامنی کی لاش پوسٹ مارٹم کے بعد آ گئی ہے اور اس کے سالے اور سسر لاش کو یہاں سے لے گئے ہیں۔ میری بات سن کر اس کی حالت خراب ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"مجھے بھی جانے کی اجازت دے دیں مائی باپ!" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "میں اپنی کامنی کو اپنے ہاتھوں سے دفن کرنا چاہتا ہوں۔"

"انہی ہاتھوں سے۔" میں نے کہا۔ "جن سے اس کا گلا دبایا تھا؟"

وہ یوں اچھلا جیسے میں نے اس کے پیروں میں بم پھینک دیا ہو۔ اس کی آنکھیں ضرورت زیادہ سے کھل گئی تھیں اور رنگ ایسے پیلا پڑ گیا جیسے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ وہ اچھا بھلا صحت مند آدمی تھا لیکن اس وقت سردی لگے مریض کی طرح کانپ رہا تھا۔ اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن بول نہ سکا، صرف منہ کھول کر رہ گیا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں حضور؟" آخر اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کر کہا۔ "بھلا میں کامنی کو کیوں قتل کرتا۔ کامنی میں تو میری جان تھی اور اپنی جان کو کوئی قتل کرتا ہے!"

"وجہ بھی تم ہی بتاؤ گے۔" میں نے کہا۔ "نہیں بتاؤ گے تو میں خود معلوم کر لوں گا۔"

"آپ جس سے مرضی پوچھ لیں جی!" اس نے کہا۔ "ہم دونوں کا پیار سارے گاؤں میں مشہور ہے...... اور پھر۔" وہ کچھ سوچنے لگا اور پھر کہا۔ "اور پھر وہ میرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ میں اپنی گھر والی کو اور ہونے والے بچے کو کیسے قتل کر سکتا ہوں حضور!"

اب برکت بڑے اعتماد سے بول رہا تھا اور اس پر جو گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی، وہ ختم ہو گئی تھی۔ اس نے جو کچھ کہا تھا، وہ وزن رکھتا تھا لیکن میرے ذہن میں عینی شاہد لڑکے کا بیان اور پوسٹ مارٹم رپورٹ تھی، اس لیے میں اس کی کسی دلیل سے متاثر نہیں ہو سکتا تھا۔

"کامنی کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آ گئی ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "رپورٹ میں صاف طور پر لکھا ہے کہ مقتولہ کا گلا گھونٹا گیا ہے۔"

میری نظریں اس کے چہرے اور آنکھوں پر جمی ہوئی تھیں اور میں اپنی بات کے خفیف سے ردِعمل کو بھی بھانپ لینے کے لیے تیار تھا۔ میں نے دیکھا کہ برکت کے چہرے پر پریشانی کی ایک لہر سی آئی اور غائب ہو گئی۔ یوں جیسے گھور اندھیرے میں کوئی جگنو چمک کر بجھ جاتا ہے۔ وہ میری نظروں کی چبھن سے بچنے کے لیے آنکھیں تیزی سے جھپکنے لگا۔

"اس کی گردن پر گھونٹنے کا نشان موجود ہے۔" میں نے کہا۔ "صاف پتہ چلتا ہے کہ اس کا گلا گھونٹا گیا ہے۔"

"جب ہم نہر میں گرے تو سائیکل پر بیٹھے ہوئے تھے۔" اس نے کہا۔ "سائیکل بھی ہمارے ساتھ ہی گری تھی۔ ہو سکتا ہے سائیکل کا کوئی حصہ اس کی گردن پر لگ گیا ہو اور اس کا نشان بھی بن گیا ہو۔"

اس نے دلیل اچھی دی تھی لیکن میرے پاس ابھی ترپ کا پتا موجود تھا جس سے بازی پلٹ سکتی تھی۔ میں برکت کو جتنا سیدھا سادہ سمجھ رہا تھا، وہ اس کے برعکس تیز اور چلتا پرزہ ثابت ہو رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ آسانی سے نہیں ماننے لگا۔ میں اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنے تجربے کی وجہ سے میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اور بات کرتے وقت نظریں چرا لیتا ہے۔

"تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ اقبالی بیان دے دو۔" میں نے اس سے کہا۔ "اگر خود بیان دے دو گے تو میں تمہارے ساتھ رعایت کر دوں گا۔ اگر تم اقبالی بیان نہیں دینا چاہتے تو مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میرے پاس موقعہ کا گواہ موجود ہے جس نے تمہیں کامنی کا گلا گھونٹتے اور اسے پانی میں ڈبوتے دیکھا ہے۔" میں نے اسے سارا واقعہ تفصیل سے سنایا کہ کس طرح ایک لڑکے نے اتفاقاً اسے قتل کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ پھر میں نے اس سے پوچھا۔ "اب بولو، کیا کہتے ہو؟"

اب تو اس کی حالت خراب ہو گئی۔ وہ حیران اور پریشان سا میرے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ میں اسے زیادہ سوچنے اور سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

"جلدی بولو۔" میں نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔ "تم نے قتل کیا ہے؟...... بولو، ہاں یا ناں!"

"نہیں حضور!" اس نے جواب دیا۔ "میں نے قتل نہیں کیا۔ لوگ مجھے رن مرید کہتے ہیں

اور یہ بات سچ ہے...... میں اتنی حسین بیوی کو کیوں قتل کرتا؟''

اسی سوال کا جواب مجھے نہیں مل رہا تھا۔ یعنی وجہ قتل! میں نے اس سے بہت سے سوال کیے اور گھما پھرا کر اگلوانے کی کوشش کی لیکن وہ اسی بات پر اڑا رہا کہ یہ مان بھی لیا جائے کہ اس نے اپنی گھر والی کو قتل کیا ہے تو سوال پیدا ہوتا کہ اسے کیا ضرورت پڑی تھی اسے قتل کرنے کی۔ وہ شاید میری یہ کمزوری سمجھ گیا تھا اور اسی بات پر اڑ گیا تھا۔

میں نے اس کو حوالات میں بند کر دیا۔ اب میں نے اپنے پولیس کے خاص ذرائع استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ خاص ذرائع تھے مخبر۔ یہ مخبر پولیس کے باقاعدہ ملازم نہیں ہوتے بلکہ اپنے اپنے مفاد کی خاطر اور تھوڑے بہت پیسوں کے لالچ میں علاقہ تھانیدار کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مخبری کا کام کرتے ہیں۔ ان میں چھوٹے موٹے جرائم کرنے والے ہوتے ہیں جو تھانیدار سے رعایت حاصل کرتے ہیں۔ کبھی کبھار تھانیدار ان کے ہاتھ میں کچھ پیسے بھی تھما دیتے ہیں۔ مخبروں کی دوسری قسم معزز قسم کے لوگوں کی ہوتی ہے جو محض علاقہ تھانیدار کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اور لوگوں پر رعب داب رکھنے کے لیے مخبری کرتے ہیں اور علاقہ تھانیدار کو خوش رکھتے ہیں۔

میں نے نمبردار سمیت اپنے تمام مخبروں کو اس کام پر لگا دیا کہ وہ برکت مسیح اور مقتولہ کامنی کے بارے میں اندر کی تمام باتیں معلوم کر کے لائیں۔ دیہات میں کسی کی کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ شام تک مخبروں نے مجھے خبریں پہنچانی شروع کر دی تھیں لیکن ان میں میرے کام کی کوئی خبر نہیں تھی۔ یہ دن بھی یونہی گزر گیا اور مجھے کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

ایسا ہونا ہی تھا

میں نے عینی شاہد لڑکے کو تھانے بلا کر ایک بار پھر اس سے سارا واقعہ بیان کرنے کو کہا۔ اس نے سارا واقعہ مجھے دوبارہ سنا دیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اسے یقین ہے کہ برکت مسیح اپنی گھر والی کو پانی میں ڈبو رہا تھا اور اس کا گلا دبا رہا تھا۔

''وہ درخت بالکل نہر کے کنارے پر ہے۔'' لڑکے نے کہا۔ ''وہاں سے بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ آپ خود سوچیں مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''کیا وہ نہر اتنی گہری ہے کہ کوئی اس میں ڈوب جائے؟'' میں نے لڑکے سے پوچھا۔

''نہیں جی!'' اس لڑکے نے جواب دیا۔ ''اس نہر کو ہم چھوٹی نہر کہتے ہیں اور یہ اتنی گہری

نہیں ہے کہ کوئی اس میں ڈوب جائے۔ اس میں تو چھوٹے چھوٹے لڑکے بھی نہاتے رہتے ہیں۔ آج تک اس نہر میں کوئی نہیں ڈوبا۔''

''تم نے ان کو نہر میں گرتے دیکھا تھا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا وہ واقعی بیل گاڑی کی وجہ سے نہر میں جا گرے تھے یا مرد نے جان بوجھ کر سائیکل کو نہر میں گرایا تھا؟''

''میں ٹھیک سے نہیں بتا سکتا۔'' لڑکے نے کہا۔ ''بس اچانک بیل گاڑی اندھا دھند آئی اور گزر گئی۔ اس کے ساتھ ہی سائیکل نہر میں سواروں سمیت گرتی نظر آئی۔''

میں نے کچھ اور باتیں پوچھ کر لڑکے کو بھیج دیا۔

لڑکے کو گئے تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ نمبردار آ گیا۔ وہ برکت مسیح کے متعلق جو معلومات لے کر آیا تھا وہ میں آپ کو مختصراً سنا دیتا ہوں۔

برکت مسیح اور کامنی آپس میں رشتے دار تھے۔ ان کی دور کی رشتے داری تھی اور اسی وجہ سے ان کی شادی ہو گئی تھی۔ برکت مسیح ساتھ والے گاؤں کے ایک نامی گرامی حکیم کے دوا خانے پر صفائی اور دوائیاں وغیرہ کوٹنے کا کام کرتا تھا۔

برکت کامنی کو بہت چاہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کامنی بہت خوبصورت تھی۔ کامنی کی خوبصورتی کو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ وہ واقعی چاہے جانے کے قابل تھی۔ برکت کامنی کے سامنے دبا دبا رہتا تھا اور اس کی جائز ناجائز ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ کامنی اس کے ساتھ لڑائی جھگڑا بھی کر لیتی اور اس کی بے عزتی بھی کر دیتی تھی مگر وہ پھر بھی اس کی خوشامد میں لگا رہتا تھا۔ اسی وجہ سے لوگ اس کو رن مرید اور بیوی کا غلام کہنے لگے تھے۔

نمبردار نے یہ بھی بتایا کہ پچھلے دو تین مہینوں سے برکت کچھ پریشان اور گم صم رہنے لگا تھا۔ اس دوران اس کی کامنی کے ساتھ ہلکی پھلکی ناراضی بھی ہوئی تھی مگر پھر برکت نے فوراً ہی اسے منا لیا تھا۔

میں نے نمبردار سے کہا کہ یہ تو عام سی باتیں ہیں۔ میں برکت اور کامنی کے متعلق اندر کی باتیں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

''اندر کی باتیں آپ کو ایک عورت بتا سکتی ہے۔'' نمبردار نے کہا۔ ''اس کا نام سرداراں ہے اور دارو کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی اور کامنی کی آپس میں راز داری والی دوستی تھی اور دونوں ایک دوسری پر جان چھڑکتی تھیں۔''

میں نے اسی وقت ایک کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ وہ گاؤں جائے اور برکت کے ساتھ والے

گھر میں رہنے والی عورت دارو کو بلا لائے۔ دارو کے متعلق نمبردار نے بتایا کہ غریب سی عورت ہے اور بڑے گھروں میں کام کاج کرتی ہے۔ اس کا خاوند گاؤں میں موچی کا کام کرتا ہے۔ دارو کے متعلق یہ بھی پتہ لگا کہ وہ بڑی تیز طرار اور لڑاکا عورت ہے اور کسی سے دبنے والی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے لوگوں کے گھروں کی وہ باتیں بھی معلوم تھیں جو دوسروں سے چھپائی جاتی ہیں۔

کانسٹیبل کے جانے کے بعد میں نمبردار سے باتیں کرنے لگا۔ اسی دوران ایک اور مخبر آ گیا۔ میں نے نمبردار کو فارغ کر دیا اور مخبر کو بٹھا لیا۔ میں نے اس سے رپورٹ لی۔ اس رپورٹ میں زیادہ تر باتیں وہی تھیں جو مجھے نمبردار بتا چکا تھا۔ اس مخبر نے ایک نئی بات بتائی جو یہ تھی کہ برکت کو کوئی بیماری لگ گئی تھی اور وہ حکیم سے اس کی دوائی لے کر کھا رہا تھا۔ مخبر کو یہ بات حکیم کے پاس کام کرنے والے ایک دوسرے ملازم سے معلوم ہوئی تھی۔ اس ملازم نے یہ بھی بتایا کہ برکت اس بیماری کی وجہ سے بہت پریشان نظر آتا تھا۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اسے کیا بیماری تھی۔

میں نے اس مخبر کو شاباش دی اور اسے کہا کہ وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ برکت کس بیماری کی دوائی کھا رہا ہے۔ مخبر چلا گیا تو تھوڑی دیر بعد وہ کانسٹیبل آ گیا جسے میں نے دارو کو لانے کے لیے گاؤں بھیجا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ دارو کو لے آیا ہے لیکن اس کا خاوند بھی ساتھ ہی آ گیا ہے اور وہ بڑا پریشان ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ دونوں میاں بیوی کو میرے پاس بھیج دے۔ کانسٹیبل کمرے سے نکل گیا تو ایک عورت اور مرد اندر آ گئے۔

میں نے دونوں کو غور سے دیکھا۔ عورت کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ ہو گی اور وہ کھلتے ہوئے گندمی رنگ کی خوش شکل عورت تھی جبکہ مرد کی عمر چالیس سال کے لگ بھاگ ہو گی۔ وہ دبلے پتلے جسم اور سانولے رنگ کا مالک تھا۔ میں نے ایک بات نوٹ کی کہ مرد گھبرایا اور پریشان نظر آ رہا تھا جبکہ عورت پُرسکون اور پُراعتماد لگ رہی تھی۔

''ہم غریبوں سے کیا قصور ہو گیا ہے حضور!'' مرد نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میری گھر والی کو آپ نے کیوں بلایا ہے؟''

میں نے اسے تسلی دی کہ اس کی گھر والی سے چند باتیں پوچھنی ہیں اور اس پر کوئی الزام نہیں ہے۔ بڑی مشکلوں سے اسے سمجھا بجھا کر میں نے باہر بٹھا دیا۔ وہ باہر تو چلا گیا لیکن یوں جیسے جانا نہ چاہتا ہو۔ اس کے جانے کے بعد میں نے دارو کو بیٹھنے کو کہا تو وہ اطمینان سے میرے

سامنے بیٹھ گئی اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

''مجھے پتہ لگا ہے کہ کامنی کے ساتھ تمہاری بڑی دوستی تھی۔'' میں نے دارو سے کہا۔ ''مجھے اس کے مرنے کا بڑا افسوس ہے۔ میں تم سے کامنی کے بارے میں کچھ باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''بس جی اللہ کو ایسے ہی منظور تھا۔'' اس نے ایک آہ بھر کر کہا۔ ''بڑی پیار کرنے والی تھی...... آپ جو پوچھنا چاہیں، پوچھیں۔ جو میرے علم میں ہو گا، بتاؤں گی۔''

''مجھے شک ہے کہ کامنی کو قتل کیا گیا ہے۔'' میں نے انکشاف کرنے کے انداز میں کہا اور اس کے چہرے پر اپنی بات کا ردِعمل تلاش کرنے لگا۔ وہ ذرا سی چونکی پھر نارمل ہو کر کچھ سوچنے لگی۔ مجھے اس کے اس انداز پر حیرت ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ یہ بات سن کر اچھل پڑے گی۔

''آپ کا شک ٹھیک ہے۔'' اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ''مجھے بھی اس بات کا شک تھا مگر میں کسی سے کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔''

دارو نے مجھے حیران کر دیا تھا۔

''اس شک کی کوئی وجہ بھی ہو گی؟'' میں نے اس سے پوچھا۔ ''تمہیں ایسا شک کیوں ہے؟''

''ایسا ہونا ہی تھا۔'' دارو نے جواب دیا۔ ''یہ بڑی لمبی بات ہے۔''

میں نے دارو سے کہا کہ وہ وقت کی فکر نہ کرے اور پوری بات سنائے۔ دارو نے مجھے بڑی ہی لمبی بات سنا دی۔ اس نے ہر بات بڑی تفصیل سے سنائی تھی۔ میں آپ کو دارو کا بیان غیر ضروری تفصیلات حذف کر کے سنا دیتا ہوں۔

پاک محبت جب ناپاک ہوئی

کامنی دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اور دونوں بھائیوں سے چھوٹی بھی تھی۔ اس وجہ سے وہ والدین اور بھائیوں کی لاڈلی تھی۔ لاڈلی ہونے کی وجہ سے وہ چھوٹی عمر میں ہی کچھ خودسر ہو گئی تھی۔ وہ جوان ہوئی تو اس نے ایسا قد کاٹھ اور رنگ روپ نکالا کہ ہر ایک کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ عیسائی گھرانے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اس پر زیادہ پابندیاں بھی نہیں تھیں جس کی وجہ سے وہ آزادی سے گھوم پھر لیتی تھی۔

کامنی ہنسنے مسکرانے والی لاابالی طبیعت کی لڑکی تھی۔ اگر کبھی کوئی چھچھورا نوجوان اسے

مذاق کر بیٹھتا تو ایسا جواب دیتی کہ اسے کان دبا کر بھاگنا پڑتا۔ اس وجہ سے گاؤں کے نوجوان اس کو چھیڑنے سے پرہیز ہی کرتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر جوان کے دل میں وہ بستی تھی۔ کامنی کی اپنی برادری میں کئی لڑکے ایسے تھے جو اس کے رشتے کے اُمیدوار تھے لیکن کامنی کو ان میں سے کوئی بھی پسند نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خود گورے رنگ کی تھی اور صاف ستھری رہتی تھی اور اپنے لیے ایسا ہی لڑکا چاہتی تھی۔

انہی دنوں کامنی کی گاؤں کے ایک لڑکے کے ساتھ دوستی ہوگئی۔ یہ ایک غریب سے مزارعے کا بیٹا تھا جو بڑا ہی خوبصورت جوان تھا۔ یہاں میں دارو کے بیان سے ہٹ کر یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اُس زمانے میں مردانہ خوبصورتی کا مطلب یہ نہیں تھا کہ داڑھی مونچھ غائب، لڑکیوں کی طرح لمبے لمبے بال اور نازک سا بدن ہو، بلکہ اُس زمانے میں خوبصورتی کا معیار یہ ہوتا تھا کہ قد لمبا ہو، جسم بھرا ہوا صحت مند ہو۔

کامنی جس جوان کو پسند کرنے لگی تھی، وہ ایسا ہی جوان تھا۔ اس کا نام کمال تھا مگر سب اسے کمالا کہتے تھے۔ کامنی اور کمالے کی چوری چھپے ملاقاتیں بڑھتے بڑھتے دیوانگی کی حدوں میں داخل ہوگئیں۔ کہتے ہیں عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے، اس طرح ان کا عشق بھی چھپانہ رہ سکا اور ہوتے ہوتے یہ بات کامنی کے بھائیوں اور ماں باپ تک جا پہنچی۔ انہوں نے عقل مندی یہ کی کہ کامنی پر کوئی سختی کرنے کے بجائے فوری طور پر اس کی شادی کا بندوبست کیا اور تھوڑے دنوں کے اندر ہی اس کی شادی برکت سے کردی۔

کمال کو جب یہ علم ہوا تو اس نے کامنی کو گھر سے بھاگ نکلنے کے لیے کہا لیکن کامنی نے صاف انکار کردیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کامنی کے ماں باپ اور بھائیوں نے اس کے بڑے لاڈ دیکھے تھے اور ناز نخرے اٹھائے تھے۔ کامنی بھی ان کے ساتھ بہت محبت کرتی تھی اور اسے یہ کسی صورت گوارا نہیں تھا کہ اس کے ماں باپ اور بھائیوں کی بدنامی ہو اور وہ لوگوں سے منہ چھپاتے پھریں۔

کامنی نے دارو کو بتایا کہ اس نے اپنی خواہش اور محبت کا گلا گھونٹ دیا۔ اُس روز وہ کُمالے کے سینے سے لگ کر اتنا روئی کہ کمالا پریشان ہوگیا کہ اسے کچھ ہو نہ جائے۔ آخر کمالے نے بڑی مشکل سے اسے سنبھالا اور وعدہ کیا کہ وہ مہینے میں دو دن اس سے ملنے اس کے گاؤں آیا کرے گا۔ کامنی نے اس سے کہا کہ وہ اس سے ملے گی تو بدنامی ہوگی۔ کمالے نے کہا کہ وہ آپس میں بات چیت نہیں کیا کریں گے بلکہ دور دور سے ایک دوسرے کو دیکھ لیا کریں گے۔

کامنی برکت کے گاؤں آگئی اور کمالا ہر مہینے دو بار اس کے گاؤں کا چکر لگاتا اور وہ دونوں دور دور سے ایک دوسرے کو دیکھ کر اپنی آنکھوں کی پیاس بجھا لیتے۔ اس دوران کامنی نے دارو کو اپنی ہمراز بنالیا اور اسے کمالے کے متعلق بتادیا۔ دارو نے ان دونوں کے درمیان پیغام رسانی کرنا شروع کردی۔ اس طرح وہ ایک دوسرے تک اپنے دل کی بات پہنچانے لگے۔

پھر کبھی کبھار موقع دیکھ کر دارو ان کی ملاقات بھی کروادیتی۔ یوں یہ سلسلہ چلتا رہا۔ شادی کو ایک سال ہوگیا مگر کامنی میں کسی بچے کے آثار پیدا نہیں ہوئے۔ پھر دوسرا سال بھی گزرنے لگا اور کامنی کی کوکھ میں کوئی کونپل نہ پھوٹی۔ وہ بنجر زمین کی طرح بے شجر و بے ثمر رہی۔

وہ پرانا زمانہ تھا۔ اس وقت کسی قسم کے ٹیسٹوں وغیروں کا تصور بھی نہیں تھا۔ اگر کسی عورت کو بچہ نہ ہوتا تو اس کی ذمہ داری عورت پر ڈال دی جاتی تھی کہ اس میں کوئی نقص ہے۔ کوئی مرد ایسی بات سننا گوارا نہیں کرتا تھا کہ اس میں کوئی نقص ہوسکتا ہے۔ اس سے مردوں کی مردانگی کو ٹھیس پہنچتی تھی۔

ادھر کمالا باقاعدگی کے ساتھ کامنی کو ملنے کے لیے آتا رہا۔ اب وہ دارو کے ذریعے ملاقات کا وقت طے کرلیتے اور مقررہ جگہ پہنچ جاتے۔ انہوں نے ملنے کے لیے ایک محفوظ جگہ دیکھ لی تھی اور وہیں ملتے تھے۔ یہ جگہ گاؤں کے باہر جہاں کھیت ختم ہوجاتے تھے، اس سے ذرا آگے قبرستان کے پاس تھی۔ اس طرف رات کو کوئی بھی نہیں آتا تھا بلکہ دن میں بھی لوگ اس طرف سے گزرتے ہوئے گھبراتے تھے۔

اُس زمانے میں دیہات میں رفع حاجت کے لیے گھروں کے اندر لیٹرین بنانے کا رواج نہیں تھا بلکہ آج کل بھی کئی دیہات میں ابھی تک ایسا ہی ہے۔ گاؤں کے لوگ باہر کھیتوں میں یا ویران مقام پر رفع حاجت کے لیے جاتے تھے۔ زیادہ تر عورتیں رات کو اندھیرا ہونے پر ٹولیوں کی صورت میں رفع حاجت کے لیے جاتی تھیں۔ کھیتوں میں جا کر عورتیں اِدھر اُدھر پھیل جاتیں اور حوائجِ ضروریہ سے فارغ ہوکر اکٹھی واپس آجاتیں۔ گاؤں کے مرد عورتوں کی سہولت کی خاطر اس وقت کھیتوں کی طرف رخ نہیں کرتے تھے۔

کامنی دارو کے ساتھ رفع حاجت کے لیے جاتی تھی اور اسی کے ساتھ واپس آتی تھی۔

جس دن کمالے نے آنا ہوتا، اس دن دارو کامنی کو مخصوص جگہ پر چھوڑ کر اِدھر اُدھر ہوجاتی تھی تاکہ وہ دونوں آزادی سے مل سکیں۔ کامنی اور کمالا اکثر جذباتی ہوجاتے تھے مگر ایک حد کے اندر ہی رہتے تھے۔

کہتے ہیں جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ ایک دن اسی دیوانگی میں وہ نیکی اور بدی کی درمیانی حد کو پار کر گئے۔ جب کامنی ایک بار بہک گئی تو پھر اکثر بہکنے لگی۔ اس طرح کامنی اور کمالے کی پاک محبت میں گناہ کا زہر گھل گیا۔

پاپ کی پیداوار

وقت گزرتا گیا اور کامنی کی شادی کو دو سال گزر گئے۔ انہی دنوں کامنی کو اپنے اندر کچھ نئی تبدیلیاں محسوس ہونے لگیں تو اس نے دارو سے بات کی۔ دارو یہ سن کر بڑی خوش ہوئی اور کامنی کو سینے سے لگا کر مبارکباد دی کہ اس میں ماں بننے کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ خوشخبری سن کر کامنی بھی بہت خوش ہوئی۔

رات کو اس کا خاوند برکت گھر آیا تو کامنی نے اسے یہ خوش خبری سنائی کہ وہ باپ بننے والا ہے۔ یہ سن کر برکت نے پہلے تو بڑی خوشی کا اظہار کیا مگر پھر یکدم بجھ سا گیا اور سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔ کامنی نے کچھ زیادہ محسوس نہ کیا۔ اس بات کے معلوم ہونے کے بعد کہ وہ باپ بننے والا ہے، برکت گم صم رہنے لگا اور اس کی طبیعت میں چڑچڑا پن پیدا ہو گیا۔ کامنی اس کی اس کیفیت سے بڑی پریشان تھی کہ اسے کیا ہوتا جا رہا۔

آخر تنگ آ کر ایک دن کامنی نے اس سے اس طرح گم صم رہنے اور چڑچڑے پن کی وجہ پوچھ ہی لی۔ برکت نے اسے جو جواب دیا، اسے سن کر کامنی کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

''یہ بچہ میرا نہیں ہو سکتا۔'' برکت نے کامنی سے کہا۔ ''میں باپ بننے کے قابل نہیں ہوں۔''

''یہ بچہ تمہارا ہی ہے۔'' کامنی نے دکھ اور غصے سے کہا۔ ''تم سے کس نے کہا ہے کہ تم باپ نہیں بن سکتے؟''

برکت نے کامنی کو بتایا کہ جب سال ڈیڑھ سال تک ان کا کوئی بچہ نہ ہوا تو اس نے اس حکیم سے بات کی جس کے پاس وہ دوائیاں کوٹنے اور صفائی ستھرائی کا کام کرتا تھا۔ یہ بڑا سیانا حکیم تھا۔ اس نے برکت سے کچھ باتیں پوچھیں اور پھر اس کی گھر والی کامنی کے متعلق پوچھا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ کامنی بالکل ٹھیک ہے۔ جو بھی نقص ہے، برکت میں ہے۔ حکیم نے برکت سے کہا کہ اسے گھبرانے کی ضرورت نہیں، وہ اسے ایسی دوائی دے گا جس سے وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا لیکن شرط یہ ہے کہ اسے لگاتار چھ ماہ دوائی کھانا ہو گی۔

''میں نے ابھی صرف دو ماہ دوائی کھائی ہے۔'' برکت نے کامنی سے کہا۔ ''جبکہ حکیم نے

چھ ماہ کھانے کے لیے کہا ہے۔ اتنی جلدی میں اس قابل نہیں ہو سکتا کہ باپ بن جاؤں۔''

''ہو سکتا ہے تم دو ماہ میں ہی ٹھیک ہو گئے ہو۔'' کامنی نے کہا۔ ''دو ماہ کا عرصہ کم تو نہیں ہوتا۔''

یہ سن کر برکت کو کچھ تسلی ہوئی لیکن وہ پوری طرح مطمئن نہ ہوا۔ اب برکت کی یہ حالت ہو گئی کہ کبھی تو وہ بالکل نارمل رہتا اور کبھی کامنی کے ساتھ لڑنے مرنے پر آ جاتا مگر پھر جلدی ہی کامنی کی منت خوشامد کر کے اسے منانے لگتا۔

یہ تمام باتیں کامنی روزانہ دارو کو سناتی اور اس سے مشورہ لیتی تھی۔ کامنی نے دارو سے یہ بات نہ چھپائی کہ کمالے کے ساتھ اس کی ملاقاتیں صاف نہیں رہیں۔ دارو نے اسے محتاط رہنے کو کہا تھا۔

پھر ایک دن برکت کام سے واپس آیا تو اس کا موڈ بے حد خراب تھا۔ اس نے آتے ہی کامنی سے جھگڑا شروع کر دیا اور کہا کہ اس کے پیٹ میں حرام کا بچہ پرورش پا رہا ہے۔ اس وقت تک کامنی کو حاملہ ہوئے تین ماہ ہو چکے تھے۔ برکت کی زبانی معلوم ہوا کہ اس نے پھر حکیم سے بات کی تھی کہ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ دو ماہ دوائی استعمال کر کے بالکل ٹھیک ہو گیا ہو تو حکیم نے اس سے کہا کہ یہ ناممکن ہے۔ حکیم نے بتایا کہ ابھی تین ماہ یہ دوائی استعمال کرانے کے بعد اس نے ایک خاص دوائی دینی ہے جو اگلے تین ماہ استعمال کرنا ہو گی۔

اس دن دونوں میں اچھی خاصی لڑائی ہوئی۔ کامنی نے بھی برکت کو ڈٹ کر جواب دیئے اور دب کر نہ رہی۔ کامنی برکت کی بہت بڑی مجبوری بن چکی تھی اور برکت زیادہ دیر اس کے ساتھ ناراض نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ بات کامنی جانتی تھی، اس لیے وہ برکت کی زیادہ پروا نہیں کرتی تھی۔ اس دن بھی یہی ہوا اور حسبِ معمول برکت نے تھوڑی دیر بعد ہی کامنی کو منا لیا۔

اس واقعے کے دو تین دن بعد کی بات ہے۔ گاؤں کے باہر ایک مزار پر میلہ لگا ہوا تھا۔ یہ مزار نہر کے پار واقع قبرستان میں تھا۔ کامنی نے برکت سے کہا کہ وہ اسے میلہ دکھا لائے۔ اس دن برکت کو حکیم کی دکان سے چھٹی تھی۔ برکت اسے اپنی سائیکل پر پیچھے بٹھا کر میلہ دکھانے کے لیے لے گیا اور پھر یہ خبر آئی کہ کامنی اور برکت نہر میں گر گئے تھے اور کامنی ڈوب کر مر گئی۔

''اب آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا۔'' ساری بات سنانے کے بعد دارو نے کہا۔ ''کہ میں نے یہ کیوں کہا تھا کہ ایسا ہونا ہی تھا۔''

دارو نے میرا سارا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ میں نے اس سے کمالے کا پتہ اور کچھ اور ضروری باتیں پوچھیں اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے یہ کہہ کر اسے فارغ کر دیا کہ جب بھی اس کی ضرورت پڑی، اس کو بلالوں گا۔

وہ بے غیرت تھا

میں نے اسی وقت اپنے اے ایس آئی کو بلایا اور اسے کمالے کے متعلق پوری طرح سمجھا کر کہا کہ اس کو تھانے لے آؤ۔ میں نے اے ایس آئی سے یہ بھی کہا کہ وہ آنے میں بہانہ بازی یا پس وپیش کرے تو بے شک اس کی ٹھکائی کر دینا۔ میرا یہ اے ایس آئی پٹھان تھا اور ملزمان پر تشدد کرنے میں بڑا ماہر تھا۔

''آپ فکر نہ کریں سر!'' اس نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا۔ ''میں اسے گھسیٹتا ہوا لے آؤں گا۔''

اور مجھے پورا یقین تھا کہ وہ واقعی اسے گھسیٹتا ہوا ہی لائے گا۔ میں نے اسی لئے اسے بھیجا تھا۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے ایک کانسٹیبل کو بلایا اور اس سے کہا کہ حوالات سے برکت کو لے آئے۔ اب مجھے پکا یقین ہو گیا تھا کہ اس نے سوچ سمجھ کر کامنی کو قتل کیا ہے۔ میرے پاس موقعے کا گواہ بھی تھا اور دارو کے بیان کی روشنی میں قتل کی وجہ بھی معلوم ہو گئی تھی۔ دارو بھی ایک اہم گواہ تھی۔ اس کے علاوہ میں نے کمالے کا بیان بھی لینا تھا۔

میں نے ایک کام اور کرنا تھا اور وہ کام تھا برکت کا میڈیکل چیک اَپ۔ اس سے میں نے یہ ثابت کرنا تھا کہ وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں تھا جبکہ اس کی بیوی تین ماہ کی حاملہ تھی۔ اس نے بدکاری کی وجہ سے اسے قتل کر دیا۔

کانسٹیبل برکت کو لے آیا تو میں نے اسے باہر جانے کو کہا۔ کانسٹیبل باہر چلا گیا تو برکت کرسی پر بیٹھنے کے لیے آگے بڑھا۔ میں نے اس وقت ہاتھ میں بید کی چھڑی پکڑی ہوئی تھی۔ جونہی وہ کرسی پر بیٹھنے لگا، میں نے زور سے چھڑی میز پر ماری۔ ایک دھماکہ سا ہوا۔ وہ یوں اچھل کر پیچھے ہٹا جیسے کرسی میں کرنٹ آگیا ہو اور اسے کرنٹ کا جھٹکا لگا ہو۔

''وہیں کھڑے رہو۔'' میں نے سختی سے کہا۔ ''میں تمہاری عزت کرنا چاہتا تھا جو تمہیں راس نہیں آئی۔ اب جھوٹ بولو، تمہیں اُلٹا نہ لٹکاؤں تو پھر کہنا...... اگر شرافت سے اقبالی بیان دے دو گے تو فائدے میں رہو گے۔''

''میں کیوں اقبالی بیان دوں!'' برکت نے کہا۔ ''میں نے اپنی گھر والی کو قتل نہیں کیا اور نہ اسے قتل کرنے کی کوئی وجہ تھی۔''

وہ کافی ڈھیٹ ثابت ہو رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ سیدھی طرح نہیں مانے گا۔ اس لیے میں نے اس پر سیدھا حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''کامنی کے پیٹ میں کس کا گناہ پل رہا تھا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

وہ میرا یہ سوال سن کر غیر ارادی طور پر تین چار قدم پیچھے ہٹ گیا اور اس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ وہ اس طرح آنکھیں پھاڑ کر میری طرف دیکھنے لگا جیسے میں کوئی جن ہوں یا جادوگر ہوں۔

''وہ میری گھر والی تھی جناب!'' اس نے آخر مُردہ سی آواز میں کہا۔ ''اس کے پیٹ میں میرا بچہ تھا۔''

''بے غیرت ہو تم!'' میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''تم اس قابل نہیں ہو کہ باپ بن سکو...... اگر نہیں مانو گے تو میں اس حکیم کو بھی یہاں بلالوں گا جس کے پاس تم کام کرتے رہے ہو اور اس کی دوائی کھا رہے ہو۔''

یہ اس کی مردانگی پر بہت بڑی چوٹ تھی۔ اسے یہ احساس پہلے ہی اندر سے مار رہا تھا کہ وہ باپ بننے کے قابل نہیں ہے لیکن اس نے اپنے آپ کو یہ فریب دے رکھا تھا کہ شاید وہ دوائی کے استعمال سے ٹھیک ہو چکا ہے۔ وہ پہلے ہی اندرونی طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا، میں نے اسے بالکل ہی توڑ کر رکھ دیا۔

اس نے سر جھکا لیا تھا اور یوں بے حس وحرکت کھڑا تھا جیسے مر گیا ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس نے اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا تو اسے دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہوا اور مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے جنہیں وہ روکنے میں ناکام رہا تھا۔ اتنا تنومند اور قد آور نوجوان، بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ یہ آنسو اس کی بے بسی کو ظاہر کر رہے تھے۔

''میں بے غیرت نہیں ہوں حضور!'' اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہاں، میں نے کامنی کا گلا گھونٹ کر اسے مار دیا تھا...... آپ نے جو پوچھنا ہے، پوچھیں۔''

میں نے اس سے اقبالی بیان دینے کو کہا جو اس نے بڑی تفصیل سے لکھوا دیا۔ اس نے بڑا لمبا بیان دیا تھا۔ میں یہ بیان پیش کر رہا ہوں۔ دیکھیں کہ ایک بے غیرت اور بزدل آدمی کی غیرت کس طرح جاگتی ہے۔

بھید جو کھل گیا

برکت کی شادی کامنی کے ساتھ ہوگئی تو وہ کامنی کو پا کر بہت خوش ہوا۔ کامنی اس کی حیثیت اور توقع سے بڑھ کر حسین تھی۔ برکت کامنی کے سامنے احساسِ کمتری کا شکار ہوگیا۔ کامنی کو بھی اس بات کا احساس ہوگیا اور اس نے برکت کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھا کر اسے انگلیوں پر نچانا شروع کر دیا۔ برکت بڑی خوشی سے کامنی کے اشاروں پر ناچنے لگا اور بالکل بیوی کا غلام ہو کر رہ گیا۔ گاؤں والوں نے اسے زَن مرید کہنا شروع کر دیا مگر برکت کو کسی کی پرواہ نہیں تھی۔

اس طرح شادی کو ایک سال گزر گیا۔ سال گزر جانے کے بعد بھی کامنی میں اولاد کے آثار نظر نہ آئے تو عورتوں نے اپنی عادت کے مطابق باتیں بنانا شروع کر دیں کہ کیا وجہ ہے، ابھی تک اولاد نہیں ہوئی۔ اس کے جواب میں کامنی ہنس کر ٹال جاتی اور برکت کہتا، جلدی کیا ہے۔ جب اوپر والے کو منظور ہوگا اولاد بھی ہو جائے گی۔ لوگوں کے سامنے تو دونوں اس بات کو ہنسی مذاق میں ٹال دیتے لیکن تنہائی میں پریشان ہو جاتے۔ مرد چاہے اپنی عورت کا غلام ہی کیوں نہ ہو لیکن وہ یہ بات کبھی سننا پسند نہیں کرے گا کہ اس میں کوئی کمزوری یا کمی ہے جس کی وجہ سے اولاد نہیں ہو رہی۔

یہاں بھی یہی ہوا۔ برکت نے کامنی سے کہا کہ وہ کسی سیانی دائی سے اپنا معائنہ کرائے۔ یہاں میں یہ بتا دوں کہ اُن وقتوں میں لیڈی ڈاکٹروں، میٹرنٹی ہوم وغیرہ کا تصور بھی نہیں تھا۔ دائیاں ہی عورتوں کو زچگی کے مراحل سے گزارتی تھیں۔ یہ دائیاں اپنے کام میں اس قدر مہارت رکھتی تھیں کہ حاملہ عورت کا پیٹ دیکھ کر ہی بتا دیتی تھیں کہ لڑکا ہوگا یا لڑکی۔

بہرحال کامنی نے گاؤں کی دائی سے اپنا معائنہ کرایا تو اس نے کامنی کو بتایا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ کامنی نے برکت کو یہ بات بتائی اور اس سے کہا کہ وہ جس حکیم کے پاس کام کرتا ہے اس کے ساتھ بات کرے۔ برکت نے حکیم سے بات کی۔ حکیم نے اس سے بہت سے سوال پوچھے۔ پھر حکیم نے کامنی کے متعلق کچھ باتیں پوچھیں۔ پھر اس نے برکت کو بتایا کہ اس کی گھر والی میں کوئی نقص نہیں ہے، جو بھی کمی ہے وہ اس کے اپنے اندر ہے۔

یہ حکیم مجھے کافی سیانا لگا تھا۔ اس نے برکت کو سمجھایا تھا کہ بعض مردوں میں اولاد پیدا کرنے والے جراثیم تعداد میں کم ہوتے ہیں اور مناسب علاج سے ان کی تعداد کو بڑھایا جا سکتا

ہے۔ اس لیے علاج کرانے میں اپنی ہتک محسوس نہیں کرنی چاہیے۔ اس حکیم نے برکت کو کچھ دوائیاں دیں اور اس سے کہا کہ چھ ماہ مسلسل دوائی کے استعمال سے وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔

برکت نے دوائی استعمال کرنا شروع کر دی۔ اس وقت ان کی شادی کو دوسرا سال پورا ہونے والا تھا۔ برکت کو ابھی دوائی استعمال کرتے دو ماہ ہی ہوئے تھے کہ کامنی نے اسے بتایا کہ اس میں ماں بننے کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ سن کر برکت پہلے تو خوش ہوا مگر پھر اسے حکیم کی بات یاد آ گئی کہ ابھی وہ باپ بننے کے قابل نہیں ہے اور اسے چھ ماہ دوائی کھانا ہو گی۔ برکت کی ساری خوشی خاک میں مل گئی اور اس کی جگہ اسے شک اور وہم کے بچھو ڈنک مارنے لگے۔ وہ ایسی بات سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ کامنی اسے دھوکا دے رہی ہے اور اس کے لیے حرام کی اولاد پیدا کر رہی ہے لیکن حقیقت کسی خوفناک ناگ کی طرح پھن پھیلائے اس کے سامنے موجود تھی۔

اسے کامنی سے پاگل پن کی حد تک محبت تھی۔ اس نے اپنے آپ کو یہ فریب بھی دینے کی کوشش کی کہ ہو سکتا ہے، دو ماہ دوائی کے استعمال سے وہ ٹھیک ہو گیا ہو۔ یہی سوچ کر اس نے حکیم سے پوچھا کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ دو ماہ دوائی کھانے سے ہی وہ ٹھیک ہو گیا ہو۔ اس نے حکیم کو یہ نہ بتایا کہ اس کی گھر والی حاملہ ہو گئی ہے۔

''ناممکن!'' حکیم نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''ابھی میں نے پہلے مرحلے کی دوائی دی ہے۔ اصل دوائی اس کے بعد دوں گا جو اسے ٹھیک کرے گی۔''

حکیم کی یہ بات سن کر برکت کو یقین ہو گیا کہ کامنی کے کسی کے ساتھ غلط قسم کے تعلقات ہیں۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس بات کا سراغ لگائے گا کہ وہ کون ہے جس سے کامنی کے ناجائز تعلقات ہیں۔ اب وہ اس ٹوہ میں رہنے لگا۔ اکثر وہ کسی نہ کسی بہانے بے وقت گھر پہنچ جاتا مگر اس نے ہر بار کامنی کو گھر میں موجود پایا۔ ان دنوں وہ بے حد چڑچڑا ہو گیا تھا اور کئی بار اس کی کامنی کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائی بھی ہوئی۔

اس کی حالت یہ تھی کہ وہ بیک وقت کامنی سے محبت بھی کرتا تھا اور نفرت بھی لیکن اس کی منہ زور محبت کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ اکثر نفرت پر غالب آ جاتا تھا۔ یوں وہ محبت اور نفرت کے دو پاٹوں کے بیچ پسنے لگا۔ اس کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ ذہنی مریض بن گیا۔

برکت نے جب کئی مرتبہ دن کو گھر میں آ کر دیکھ لیا کہ کامنی گھر میں موجود ہوتی ہے تو اسے خیال آیا کہ وہ ضرور رات کو اس وقت اپنے آشنا سے ملنے جاتی ہوگی جب وہ حوائجِ ضروریہ

سے فارغ ہونے کے لیے کھیتوں میں جاتی ہے۔ یہ سوچ کر اس نے رات کو کامنی کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ دوراتوں کو اس کے پیچھے پیچھے گیا مگر کامنی نے کوئی مشکوک حرکت نہ کی۔ تیسرے دن اس نے سوچا کہ اگر آج بھی اسے کوئی سراغ نہ ملا تو وہ کامنی پر شک کرنا چھوڑ دے گا۔ اس دن وہ کافی فاصلہ رکھ کر کامنی اور دارو کے پیچھے جارہا تھا۔ رات کا وقت تھا، ہر طرف کھیت اور درخت تھے، اس لیے اسے تعاقب میں کوئی مشکل نہیں ہورہی تھی۔

اس نے محسوس کیا کہ گذشتہ دنوں کی نسبت اس دن کامنی اور دارو کافی دور نکل آئی تھیں۔ کافی آگے جا کر جہاں کھیت ختم ہوجاتے تھے، وہاں دارو ایک کھیت کے اندر چلی گئی اور اس نے کامنی سے کچھ کہا تو کامنی ہنستی ہوئی دوسری طرف چلی گئی۔ برکت اس کے تعاقب میں رہا۔ آگے جا کر کامنی کا رخ قبرستان کی طرف ہوگیا اور پھر ایک ٹیلے کے پیچھے جا کر وہ غائب ہوگئی۔ برکت بڑی احتیاط سے ٹیلے کے قریب چلا گیا اور ایک درخت کی اوٹ سے دیکھا۔

اسے جو کچھ نظر آیا وہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔ اس نے دیکھا کہ کامنی ایک خوبرو نوجوان کے ساتھ لپٹی ہوئی ہے اور دونوں کی دبی دبی ہنسی کی آواز آرہی تھی۔ پھر انہوں نے کچھ ایسی حرکتیں شروع کردیں جو میاں بیوی ہی کرسکتے ہیں۔ ہونا یہ چاہئے تھا کہ برکت اسی وقت ان دونوں کو قتل کردیتا یا خود قتل ہوجاتا لیکن وہ کچھ بھی نہ کرسکا اور وہاں سے ہٹ آیا۔

وہ واپس گاؤں کی طرف چل پڑا۔ وہ چلتا جارہا تھا اور روتا جارہا تھا۔ کامنی کو دیکھ کر پتہ نہیں اسے کیا ہوجاتا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ سب کچھ بھول جاتا تھا۔ اس کے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ فوراً کامنی کو طلاق دے دے مگر پھر جب اسے یہ خیال آیا کہ اتنی خوبصورت بیوی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا تو اس نے ارادہ بدل دیا۔ پھر اس نے سوچا کہ وہ اس طرف سے آنکھیں بند کرلے۔ اس کی مردانگی کا بھرم قائم رہے گا۔ دوسرے لفظوں میں اس نے بے غیرت بن جانے کا سوچا تھا۔

سیدھی سی بات ہے جب کسی انسان کی غیرت مرجاتی ہے تو وہ بزدل بھی ہوجاتا ہے۔

جب غیرت جاگی

پھر ایک دن ایک ایسا واقعہ ہونے برکت کے ذہن میں انقلاب پیدا کردیا۔ اس دن وہ گھر میں موجود تھا اور کامنی کسی کام سے دارو کے گھر گئی ہوئی تھی۔ برکت نے گھر میں ایک مرغا اور تین مرغیاں پال رکھی تھیں جو اس وقت صحن میں پھر رہی تھیں۔ اچانک کسی ہمسائے کا مرغا

کھلے دروازے سے ان کے صحن میں آگیا اور مرغیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ باہر سے آنے والا مرغا خاصا صحت مند تھا اور اس کے مقابلے میں برکت کا مرغا کمزور نظر آرہا تھا۔

برکت یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کا کمزور سا مرغا باہر سے آنے والے مرغے پر باز کی طرح جھپٹ پڑا اور دونوں میں خونریز جنگ چھڑ گئی۔ تھوڑی دیر بعد برکت نے محسوس کیا کہ اس کا مرغا کمزور پڑنے لگا تھا اور اس کی کلغی سے خون بہنے لگا تھا مگر اتنا زخمی ہونے کے باوجود بھی وہ کسی صورت پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ وہ مرجائے گا، بھاگے گا نہیں۔ برکت نے آگے بڑھ کر دوسرے مرغے کو باہر نکالا اور اپنے مرغے کو پکڑ کر اس کا خون صاف کیا پھر اسے پیار سے چوم کر چھوڑ دیا۔

مرغے نے پر پھڑ پھڑا کر ایک روزدار بانگ دی اور سینہ تان کر اپنی مرغیوں کے پاس چلا گیا۔ برکت کے دل میں خیال آیا کہ میں انسان ہوں لیکن اس مرغے سے بھی بدتر ہوں۔ ایک جانور ہو کر اس نے اپنی تین بیویوں کی کس طرح جان پر کھیل کر حفاظت کی ہے اور ایک میں ہوں کہ مجھ سے ایک بیوی بھی نہیں سنبھالی جاتی۔

اس واقعے کے چند دن بعد کامنی نے برکت سے کہا کہ وہ اسے میلہ دکھالائے۔ برکت اسے سائیکل پر بٹھا کر میلے کی طرف چل پڑا۔ وہ سائیکل چلا رہا تھا اور اس کے دماغ میں کشمکش جاری تھی کہ وہ کامنی کو چھوڑ دے یا بے غیرت بنا رہے۔ کبھی محبت نفرت پر غالب آجاتی مگر اس دن نفرت کا غلبہ دماغ کو چڑھ رہا تھا اور یک طرفہ محبت دم توڑ رہی تھی۔ پھر اس کے ذہن میں مرغے والا واقعہ آگیا اور نفرت کا زہر پوری طرح حاوی ہوگیا۔

یہ وہ لمحات تھے جب برکت نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ بے غیرت بن کر زندہ نہیں رہے گا اور کامنی کا گلا دبا دے گا۔ اس نے سوچا جب بھی موقع ملا وہ کامنی کا گلا گھونٹ دے گا اور اس کے بعد اس کے یار کو بھی قتل کرکے پھانسی چڑھ جائے گا۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھا اور سائیکل نہر کے پُل پر چڑھ چکی تھی کہ اچانک مخالف سمت سے ایک بیل گاڑی بڑی تیزی سے سائیکل پر چڑھ دوڑی۔ بیل خوفزدہ اور بھڑکے ہوئے نظر آرہے تھے۔ غالباً انہوں نے راستے میں کسی سانپ کو دیکھ لیا ہوگا۔

جانوروں کو، خصوصاً گھوڑے وغیرہ کو سانپ نظر آجائے تو وہ اپنی جگہ کھڑے کانپنے لگتے ہیں یا بے قابو ہو کر بھاگ نکلتے ہیں۔ یہ بیل بے قابو ہو کر بھاگ رہے تھے۔

آناً فاناً بیل گاڑی سر پر آن پہنچی۔ اس سے بچنے کی ایک ہی صورت تھی کہ سائیکل کو پُل

سے نہر میں گرادیا جاتا اور برکت نے غیر ارادی طور پر یہی حرکت کی۔ سائیکل سمیت وہ نہر میں جا گرے تو کامنی خوفزدہ ہو کر ہاتھ پاؤں مارنے لگی اور چیخنے لگی۔ اس دوران اسے دو چار غوطے بھی آ گئے تھے۔ برکت تڑپ کر کامنی کو بچانے کے لیے بڑی تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

''مجھے بچالو برکت!'' کامنی نے گھبرا کر اسے پکارا۔ ''میں مرجاؤں گی...... ہائے میرا بچہ......''

برکت نے سناتے ہوئے کہا کہ ''ہائے میرا بچہ۔'' کے الفاظ سن کر وہ پاگل ہو گیا اور اس پر ایسی دیوانگی طاری ہوئی کہ اسے کچھ ہوش نہ رہا۔ بس اسے یہ ہی محسوس ہو رہا تھا کہ ہر طرف پانی کے چھینٹے اُڑ رہے ہیں، کامنی تڑپ رہی ہے، ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔

جب اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ کامنی کی گردن اس کے ہاتھوں میں ہے اور کامنی مر چکی ہے۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، اسے کوئی انسان نظر نہ آیا۔ بہت دور دور لوگ کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ اس نے شور مچا کر ان سب کو اکٹھا کر لیا اور بتایا کہ وہ اور اس کی گھر والی کس طرح نہر میں گر پڑے تھے اور اس کی گھر والی ڈوب جانے کی وجہ سے مر گئی ہے۔ لوگوں نے افسوس کا اظہار کیا اور کامنی کی لاش اس کے گھر تک پہنچانے کا بندوبست کر دیا۔

اس دوران برکت روتا رہا اور یہ رونا بالکل اصلی تھا۔ وہ دوہرے کردار کا مالک بن گیا تھا۔ وہ کامنی سے محبت بھی کرتا تھا اور نفرت بھی۔ اس کی محبت ہمیشہ نفرت پر غالب آ جاتی تھی۔ بس وہی ایک لمحہ تھا جب نفرت کا جذبہ اتنی شدت سے ابھرا کہ محبت کے جذبے پر غالب آ گیا اور اس ایک لمحے میں برکت نے کامنی کا گلا گھونٹ دیا۔

قتل کو جو ایک لمحے کا پاگل پن کہا گیا ہے تو یہ بالکل ٹھیک ہے۔

میں برکت سے فارغ ہوا تو کچھ دیر آرام کرنے کے لیے آنکھیں بند کر کے سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ میرے پٹھان اے ایس آئی نے حاضر ہو کر مجھے بتایا کہ وہ کمالے کو لے آیا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ کمالے کو میرے پاس لے آئے۔ ذرا ہی دیر بعد اے ایس آئی ایک خوبرو جوان آدمی کو گردن سے دبوچے میرے پاس لے آیا۔ یہ کمالا تھا۔ اے ایس آئی نے اس کی گردن چھوڑ دی اور اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اسے معلوم ہے کہ کامنی نام کی ایک عورت پچھلے دنوں نہر میں ڈوب کر مر گئی تھی۔ اس نے جواب دیا کہ اسے معلوم ہے اور یہ خبر دور دور کے دیہات تک پہنچ گئی ہے۔

''تمہیں تو بہت افسوس ہوا ہوگا کامنی کے مرنے کا!'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''میرا اس سے کیا واسطہ جی!'' اس نے گھبرا کر کہا۔ ''میری وہ کیا لگتی تھی جو مجھے افسوس ہوتا۔''

''میں نے سنا ہے تم اتنی دور سے اس سے ملنے آتے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''تمہاری اس کی بڑی دوستی تھی۔''

''آپ نے غلط سنا ہے جی!'' اس نے کہا۔ ''میں تو اس کو جانتا بھی نہیں۔''

اے ایس آئی کمالے کے پیچھے کھڑا تھا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اشارہ کیا کہ اس کی طبیعت ذرا صاف کر دے۔ اے ایس آئی نے وہیں سے اس کے بال مٹھی میں جکڑے اور اتنے زور سے پیچھے کو جھٹکا دیا کہ وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے کو جا گرا۔ ابھی وہ اٹھ ہی رہا تھا کہ ایک زوردار تھپڑ اس کے بائیں گال پر پڑا اور وہ پھر گر پڑا۔ اس کے منہ کے اندر کی جلد پھٹ گئی اور وہ خون تھوکنے لگا۔ اے ایس آئی نے اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور میرے سامنے کھڑا کر دیا۔

''تمہارا باپ جو پوچھ رہا ہے، ٹھیک ٹھیک بتاؤ'' اس نے کمالے سے کہا۔ ''ورنہ کھال کھینچ لوں گا۔''

کمالا اچھا بھلا صحت مند جوان تھا لیکن اس کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ اس پر لرزہ طاری ہو گیا تھا اور منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ مجھے اس بدکار پر ذرا بھی رحم نہ آیا۔ اس کی وجہ سے ایک عورت قتل ہو گئی تھی۔

''اب بتاؤ، کامنی سے تمہارے ناجائز تعلقات تھے یا نہیں؟'' میں نے ذرا سختی سے کہا۔ ''اگر اب بھی جھوٹ بولو گے تو میں تمہاری اس ماں دارو کو بلالوں گا جو تمہاری ملاقاتیں کراتی تھی۔''

اس نے تسلیم کر لیا کہ اس کے کامنی کے ساتھ غلط قسم کے تعلقات تھے اور وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اس نے بھی وہی باتیں سنائیں جو مجھے دارو پہلے ہی سنا چکی تھی۔ اس لیے یہاں کمال کا بیان سنانا ضروری نہیں ہے۔ میں نے اس سے بیان لے کر دستخط کروا لئے۔

میں نے کیس مکمل کر کے عدالت میں پیش کر دیا۔ میں نے بڑا مضبوط کیس تیار کیا تھا۔ اس میں عینی شاہد لڑکے کا بیان، کمالے کا بیان، دارو کا بیان اور اس حکیم کا بیان بھی شامل تھا جس

کے پاس برکت کام کرتا تھا اور اس سے دوائی بھی کھا رہا تھا۔ اس کے علاوہ ملزم کا اقبال بیان بھی تھا۔

عدالت میں برکت اپنے بیان پر قائم رہا۔ دوسرے لوگوں کے بیان اور عینی شاہد لڑکے کی گواہی کی روشنی میں جج نے ملزم برکت کو سزائے موت کا حکم دیا۔ برکت کے وکیل نے ہائیکورٹ میں اپیل دائر کر دی اور زیادہ زور اس بات پر دیا کہ اس کا مؤکل مقتولہ کی بے راہ روی کی وجہ سے ذہنی اذیت کا شکار ہو گیا تھا اور آخر ایک روز اسی اذیت کے عالم میں اشتعال میں آ کر اس نے اپنی بدکار بیوی کا گلا گھونٹ دیا۔

جج نے اس کے مؤقف کو تسلیم کرتے ہوئے برکت کی سزائے موت معطل کر دی اور کم کر کے صرف سات سال سزائے قید کا حکم دے دیا۔

☆======☆======☆

پہلوان، پستول اور باندر سنگھ

وہ ایک حجام کا بیٹا تھا۔ لوگ اس کی عزت نہیں کرتے تھے۔ اسے اپنے باپ کے پیشے سے نفرت ہو گئی اور اس نے معاشرے کے خلاف بغاوت کر کے بدمعاشی میں قدم رکھ دیا...... اس کا انجام کیا ہوا؟

یہ ایک غیرت مند پہلوان کی کہانی ہے جو قتل ہوگیا تھا اور اس کی تفتیش میں نے کی تھی۔

میری کہانیاں پڑھنے والے جانتے ہیں کہ میں واردات والے شہروں، قصبوں، دیہات اور کرداروں کے اصلی نام نہیں لکھا کرتا۔ کہانی کی سہولت کے لیے فرضی نام استعمال کرتا ہوں۔ اب میں نے سوچ لیا ہے کہ میں کہانی سناتے وقت سن، مہینہ وغیرہ بھی نہیں لکھا کروں گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بڑھاپے نے عقل خبط کر کے رکھ دی ہے اور یادداشت بہت کمزور ہوگئی ہے۔ اس وجہ سے غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ ویسے بھی میرے خیال میں اس سے کہانی کی دلچسپی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

قتل کی جس واردات کی تفتیش سنانے لگا ہوں، اس کا تعلق موجودہ بھارتی پنجاب سے ہے۔ میں ان دنوں شہر کے ایک مضافاتی قصبے کے تھانے میں تعینات تھا۔ تھانے سے پندرہ بیس منٹ کے فاصلے پر مجھے سرکاری کوارٹر ملا ہوا تھا۔ فجر تقریباً چار بجے کا وقت ہوگا جب میرے کوارٹر کا دروازہ بجنے لگا۔ میں اتنی گہری نیند سونے کا عادی نہیں تھا کہ میری آنکھ نہ کھلتی بلکہ اس کے برعکس ذرا سی آواز پر میری آنکھ فوراً کھل جاتی تھی۔ اتنی سویرے دروازے پر دستک سن کر میں سمجھ گیا کہ کوئی واردات آگئی ہے یا کوئی اور ایمرجنسی ہے۔ میں نے تھانے میں اپنے عملے سے کہہ رکھا تھا کہ ایسی کوئی بات ہو تو مجھے جگا لیا کریں۔

میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو میرے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ سامنے میرے تھانے کا ایک کانسٹیبل کھڑا تھا۔ اس نے بتایا کہ قتل کی ایک واردات کی رپورٹ آئی ہے۔ میں نے کانسٹیبل سے کہا کہ وہ تھانے چلا جائے، میں آرہا ہوں۔ میں نے اسے ٹالنے کی کوشش نہیں کی کہ رپورٹ درج کر لو میں بعد میں دیکھوں گا۔ میں نے اسی وقت جائے واردات پر جانے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ ابھی وہاں لوگوں کی بھیڑ جمع نہیں ہوئی ہوگی اور ہوسکتا ہے وہاں سے

کھروں کے نشان یا کوئی ایسی چیز مل جائے جس سے تفتیش میں مدد مل سکے۔

میں فوراً نہا کر تیار ہوگیا اور تھانے جا پہنچا۔ رپورٹ درج کرانے ایک پختہ عمر کا آدمی آیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر 35 اور 40 سال کے درمیان ہوگی۔ اس کے ساتھ محلے کے دو آدمی آئے تھے۔ اس آدمی نے اپنا نام امجد بتایا۔ اس نے بتایا کہ اس کا چھوٹا بھائی قتل ہوگیا ہے۔ میں نے رپورٹ درج کر لی۔ قتل ہونے والے بھائی کا نام اسلم تھا اور وہ اچھو پہلوان کے نام سے مشہور تھا۔ پوچھنے پر اس کے بھائی نے بتایا کہ وہ صرف نام کا ہی پہلوان نہیں تھا بلکہ سچ مچ کا پہلوان تھا۔ اس کی عمر تیس بتیس سال کے لگ بھگ بتائی گئی۔

میں نے اس سے تھانے میں پوچھ گچھ کرنے کی بجائے راستے میں اپنے کام کی باتیں پوچھنے کا ارادہ کر لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تھانے میں وقت ضائع ہو۔ میں ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر جائے واردات کی طرف چل پڑا۔ میں نے راستے میں مقتول کے بڑے بھائی امجد سے اپنے کام کی باتیں پوچھنی شروع کر دیں۔ اس سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق امجد کا ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا جس میں غریب اور درمیانہ طبقے کے لوگ کھانا کھانے اور چائے پینے کے لیے آتے تھے۔ وہ رات ایک ڈیڑھ بجے ہوٹل بند کر کے گھر آتا تھا۔ یہ اس کی مجبوری تھی کہ ہوٹل بند کرتے کرتے روزانہ یہ وقت ہو جاتا تھا۔ واردات والی رات بھی امجد حسب معمول ہوٹل بند کر کے اور ملازموں کو دیہاڑی دے کر گھر واپس آیا۔ گھر آتے آتے اسے دو بج گئے۔ اس کی بیوی نے دروازہ کھولا اور وہ جاتے ہی بستر پر گر گیا۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ اس وجہ سے اس کی کئی بار بیوی سے لڑائی بھی ہوئی تھی۔ جلدی ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔ ابھی اسے سوئے ہوئے تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ ایک دھماکے کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ یہ کیا ہوا ہے کہ اسے کسی عورت کے چیخنے کی آواز سنائی دی اور اس کے بعد لوگوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اس نے غور کیا تو یہ آوازیں اس کے گھر کے پچھلی طرف والی گلی سے آرہی تھیں۔

اس کے چھوٹے بھائی پہلوان کا گھر بھی اسی گلی میں تھا جہاں سے شور شرابے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ بھاگم بھاگ اس گلی میں گیا تو اسے اپنے بھائی کے گھر کے سامنے لوگوں کی بھیڑ نظر آئی۔ وہ گھبرا کر پہلوان کے گھر کی طرف بھاگا۔ اندر جا کر دیکھا تو اس کی بھابی یعنی پہلوان کی بیوی رو رہی تھی۔ چارپائی جس پر پہلوان سو رہا تھا، اس کے نیچے خون ہی خون جما ہوا تھا۔

بستر پر بھی خون تھا۔

اس نے پہلوان کی بیوی سے پوچھا کہ اسے یعنی پہلوان کو کیا ہوا ہے۔ اس کی بھابی نے بتایا کہ دو ڈاکو آئے تھے جو پہلوان کو گولی مار کر بھاگ گئے ہیں۔ اس کے بعد امجد چند محلے داروں کو ساتھ لے کر تھانے آ گیا۔

امجد کا بیان سنتے سنتے ہم واردات والے محلے میں پہنچ گئے۔ ابھی صبح کے پانچ بجے تھے اور لوگ پوری طرح بیدار نہیں ہوئے تھے پھر بھی میں نے دیکھا کہ واردات والے گھر کے سامنے کافی لوگ کھڑے نظر آ رہے تھے۔ میں امجد کی راہنمائی میں آگے بڑھا۔ ایک تھانیدار اور کانسٹیبلوں کو دیکھ کر لوگ اِدھر اُدھر ہٹ گئے اور ہمارے لیے راستہ بنا دیا۔

گولی لاش کے اندر تھی

یہ پانچ چھ مرلے کا درمیانہ سا مکان تھا۔ باہر والا دروازہ لکڑی کا تھا اور بہت پرانے وقتوں کا لگ رہا تھا۔ اس کی لکڑی پر پھول بوٹے کھدے ہوئے تھے۔ ہم اس دروازے سے اندر داخل ہوئے تو اس وقت کے رواج کے مطابق آگے کھلا صحن نظر آیا جو کچا تھا۔ بائیں طرف ایک بھینس بندھی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی مٹی کی ایک کھرلی بنی تھی۔ ایسی کھرلیاں دیہاتی عورتیں خود ہی چکنی مٹی سے بنا لیتی ہیں۔ صحن کے دائیں طرف ایک ہینڈ پمپ نظر آ رہا تھا۔ اس کے اردگرد پکا فرش لگا کر ایک کھرا بنا ہوا تھا۔ اس کھرے سے ایک نالی نکل کر صحن سے ہوتی ہوئی باہر گلی کی بڑی نالی میں گر رہی تھی۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ ان دنوں گٹروں اور فلش سسٹم کا رواج نہیں تھا۔ یہ علاقہ ویسے بھی دیہاتی ماحول والا تھا۔

سامنے کی طرف ایک قطار میں تین کمرے بنے ہوئے تھے اور ان سے پہلے چار پانچ فٹ آگے کو بڑھا ہوا برآمدہ تھا۔ اسی برآمدے میں ایک چارپائی پر پہلوان کی لاش پڑی تھی۔ میں نے سب سے پہلے لاش کا نظری معائنہ کیا۔ لاش پیٹھ کے بل پڑی تھی۔

ہنسلی کی ہڈی کے پاس گولی کے زخم کا نشان صاف نظر آ رہا تھا اور اس طرف سے خون بہہ بہہ کر تکیے اور بستر پر جم گیا تھا۔ چارپائی کے نیچے بھی جما ہوا خون نظر آ رہا تھا۔ مقتول کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں اور چہرے پر اذیت کا تاثر بڑا صاف نظر آ رہا تھا۔

میں نے اس کے پورے جسم کا معائنہ کیا۔ گولی کے زخم کے علاوہ کہیں بھی کسی ضرب یا زخم کا نشان نہیں تھا نہ ہی گولی کے باہر نکلنے کا نشان نظر آ رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ گولی جسم کے اندر ہی کہیں رہ گئی ہے۔ پہلوان کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا اور اس کا جسم کسرتی تھا۔ وہ صحیح

معنوں میں ایک خوبصورت جوان تھا۔ سچ پوچھیں تو مجھے اتنے گبھرو جوان کی موت کا بہت افسوس ہوا تھا۔ پولیس کے محکمے میں رہ کر دل کو پتھر کرنا پڑتا ہے دوسری طرف مقتول کی بیوہ کے بَین دل ہلا دینے والے تھے۔ ابھی مقتول کے سسرال والے اور دوسرے عزیز رشتہ دار نہیں پہنچے تھے۔ امجد نے اطلاع کے لیے آدمی بھجوا دیئے تھے۔

میں نے موقع پر جو کاغذی کارروائی کرنی تھی، وہ کر لی اور لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیا۔ جب لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے لے جانے لگے تو غم کی شدت سے پہلوان کی بیوہ بے ہوش ہو گئی۔ عورتیں اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگیں مگر اس کی بے ہوشی طویل ہو گئی۔

اس گھر کے ساتھ والے ہمسائے نے میرے لیے ایک بیٹھک کھول دی۔ میں وہاں بیٹھ گیا۔ میں نے مقتول پہلوان کی بیوی سے بیان لینا تھا لیکن مجھے بتایا گیا کہ وہ ابھی تک بے ہوش ہے۔ میں نے امجد سے باقاعدہ بیان لینے کا فیصلہ کر لیا اور امجد کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ اس کے بیان کا کچھ حصہ جو میں نے جائے واردات پر آتے ہوئے راستے میں اس سے پوچھتا رہا تھا، پہلے سنا دیا ہے۔

''پہلوان کی کسی کے ساتھ کوئی دشمنی تھی؟'' میں نے امجد سے پوچھا۔

''کسی کے ساتھ دشمنی نہیں تھی۔'' امجد نے بتایا۔ ''وہ بہت ہی نرم دل اور شریف انسان تھا۔ وہ اکثر غریبوں اور ضرورت مندوں کے کام آتا رہتا تھا۔''

''پچھلے دنوں کسی کے ساتھ کوئی لڑائی جھگڑا ہوا ہوگا۔'' میں نے پوچھا۔

''توبہ کریں جی!'' امجد نے کہا۔ ''اس کے ساتھ جھگڑا کرنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ وہ اتنا صحت مند اور زور آور تھا کہ گندم کی بھری ہوئی بوری اٹھا کر دوڑ لگاتا تھا۔ آمنے سامنے کی لڑائی میں پانچ چھ جوان آدمیوں پر وہ اکیلا ہی بھاری تھا۔''

''تمہیں کسی پر شک ہے؟'' میں نے امجد سے پوچھا۔

''نہیں جی!'' امجد نے دو ٹوک جواب دیا اور کہا۔ ''میرا خیال ہے ڈاکو آئے اور پہلوان کی آنکھ کھل گئی۔ ڈاکوؤں نے گھبرا کر اسے گولی مار دی ہوگی۔''

''تمہارا خیال غلط ہے۔'' میں نے اسے کہا۔ ''وہ ڈاکو نہیں تھے۔ وہ صرف پہلوان کو قتل کرنے کے لیے آئے تھے اور انہوں نے سوئے ہوئے پہلوان کو گولی مار دی۔ اگر وہ ڈاکو ہوتے تو کچھ نہ کچھ لے کر جاتے جبکہ انہوں نے گھر کی کسی چیز کو نہیں چھیڑا۔ اس سے صاف

ظاہر ہے کہ یہ دشمنی کا معاملہ ہے۔''

امجد گہری سوچ میں کھو گیا اور کچھ نہ بولا۔

''پہلوان کیا کام کرتا تھا؟'' میں نے ایک خیال کے تحت پوچھا۔

''وہ چھوٹی موٹی ٹھیکیداری کرتا تھا۔'' امجد نے جواب دیا۔ ''کسی کا مکان بنوانا، کنواں کھدوانا اور ایسے ہی کاموں کے وہ ٹھیکے لے لیا کرتا تھا۔''

''کسی سے لین دین کا جھگڑا ہوا ہوگا؟'' میں نے کہا اور پوچھا۔ ''اس کے علم میں ایسا کوئی واقعہ ہے؟''

''ایسی کوئی بات میرے علم میں نہیں۔'' امجد نے کہا۔ ''اگر ایسا کوئی واقعہ ہوا ہوتو بھابی کو پتہ ہوگا۔''

میں نے اس کے والدین کے متعلق پوچھا تو امجد نے بتایا کہ ان کا باپ تین سال پہلے فوت ہو گیا تھا اور ماں ان کے بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھی۔ یہ لوگ پہلے کسی اور گاؤں میں رہتے تھے۔ ان کا باپ ان کو لے کر اس قصبے میں آ گیا۔ ان دنوں یہ قصبہ نیا بن رہا تھا اور لوگ آ آ کر یہاں آباد ہو رہے تھے۔ اسلم کو شروع سے ہی پہلوانی کا شوق تھا۔ اس قصبے میں آ کر اسے ایک پرانا استاد پہلوان مل گیا جس نے قصبے سے باہر کھلی جگہ پر اکھاڑہ بنا رکھا تھا۔ اس نے اسلم کو سارے استادی داؤ پیچ سکھا دیئے تھے۔ وہ استاد پہلوان فوت ہو گیا تو اسلم عرف اچھو پہلوان اکھاڑے کا استاد یا خلیفہ بن گیا۔

ابھی میں امجد کے ساتھ باتیں کر رہا تھا کہ میرے ایک کانسٹیبل نے آ کر بتایا کہ مقتول کی بیوہ کو ہوش آ گیا ہے۔ میں نے پتہ کیا کہ وہ بیان دینے کے قابل ہے یا نہیں تو مجھے بتایا گیا کہ ایسی حالت میں ہے کہ بیان دے سکتی ہے۔ میں نے اس کو اپنے پاس بلا لیا۔

قاتل دو تھے

وہ آ گئی۔ اس کے چہرے پر دنیا جہان کی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ان کی شادی کو ابھی صرف تین سال ہوئے تھے۔ وہ بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ اس کا شیر ببر جیسا شوہر قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کی دلی کیفیت اور غم کا اندازہ کون کر سکتا تھا۔

میں نے اسے بٹھایا اور اس کی جھجک دور کرنے کے لیے ہمدردی کی باتیں کیں اور پھر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دلاسہ دیا۔ میری ہمدردی پا کر وہ پھر سسکنے لگی۔ میں نے بڑی مشکل سے

اسے بیان دینے کے لیے تیار کیا۔

''مجھے اپنا بھائی سمجھو۔'' میں نے اس سے کہا۔ ''اگر تم میری باتوں کا اچھی طرح جواب دو گی تو میں تمہارے شوہر کے قاتلوں کو پکڑ کر پھانسی پر لٹکا سکوں گا۔''

میری یہ بات سن کر اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی مگر پھر فوراً ہی بجھ گئی۔ غالباً یہ چمک اس خیال سے پیدا ہوئی تھی کہ میں اس کے شوہر کے قاتل کو پھانسی پر لٹکا دوں گا پھر اسے خیال آیا ہوگا کہ اس کا شوہر واپس تو نہیں مل جائے گا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ چمک بجھ گئی۔

بہر حال میں نے بڑی مشکلوں سے باتوں باتوں میں اس سے اپنے کام کی باتیں معلوم کر لیں۔ اس کا بیان میں آپ کو اپنے الفاظ میں سنا دیتا ہوں۔ اس نے بتایا کہ واردات والی رات بادل چھائے ہوئے تھے اور بارش کا امکان تھا۔ وہ برسات کا مہینہ تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنی چارپائیاں صحن کی بجائے برآمدے میں بچھالیں تاکہ رات کو بارش آنے پر نیند خراب نہ ہو۔

اس نے بتایا کہ اندازاً رات کے ڈیڑھ دو بجے کا وقت ہوگا جب اسے اپنے قریب دھماکہ سنائی دیا اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، فوری طور پر اسے کچھ سمجھ نہ آئی کہ کیا ہوا ہے۔ پھر اس نے دیکھا کہ ایک آدمی برآمدے سے صحن کی طرف نکلا اور بھاگتا ہوا بیرونی دیوار کی طرف چلا گیا۔ وہ کوئی بزدل عورت نہیں تھی۔ وہ اٹھی اور اس آدمی کے پیچھے بھاگی جو دیوار کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ دیوار پر ایک اور آدمی بیٹھا ہوا تھا اور وہ نیچے والے آدمی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اوپر چڑھنے میں مدد دے رہا تھا۔ دونوں آدمیوں نے منہ پر ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔

''ٹھہر وائے بے غیرتو!'' پہلوان کی بیوی نے للکار کر کہا۔ ''کون ہو تم؟''

اتنی دیر میں نیچے والا آدمی بھی دیوار پر چڑھ گیا اور دونوں باہر کی طرف کود گئے۔ پہلوان کی بیوی نے اپنے سوئے ہوئے شوہر کی طرف دیکھا اور پھر اچانک اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اسے یہ خیال آ گیا تھا کہ جس دھماکے سے اس کی آنکھ کھل گئی ہے، اس کی آواز سے اس کا شوہر کیوں نہیں اٹھا۔ وہ ڈرتی ڈرتی پہلوان کے قریب گئی۔ برآمدے میں صحن کی نسبت زیادہ اندھیرا تھا اور صاف نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے پہلوان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے ہلانا چاہا تو اسے ہاتھ میں چپچپاہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے گھبرا کر لالٹین جلائی تو اسے شوہر کے تکیے اور بستر پر خون نظر آیا۔ خون بہہ بہہ کر چارپائی سے نیچے فرش پر بھی آ گیا تھا۔

اس نے لالٹین فرش پر رکھ کر پہلوان کو ہلایا جلایا لیکن اس میں زندگی کے آثار نہیں تھے۔ اس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ پھر محلے دار اکٹھے ہو گئے اور پہلوان کا بڑا بھائی امجد بھی آ گیا۔

''تمہارے شوہر کی کسی کے ساتھ دشمنی ہو گی۔'' میں نے کہا۔ ''وہ لوگ موقع ملنے پر وار کر گئے ہیں۔''

''ہماری کسی کے ساتھ دشمنی نہیں ہے۔'' پہلوان کی بیوی نے کہا۔ ''وہ اتنا پیارا آدمی تھا کہ کسی سے دشمنی کر ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ تو دوست بناتا تھا جی!''

''کسی کے ساتھ لین دین کا معاملہ ہو گا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں جی!'' اس نے کہا۔ پھر وہ کچھ سوچ کر بولی۔ ''پچھلے دنوں اس کا معمولی سا جھگڑا ہو گیا تھا۔ یہ آج سے آٹھ یا دس دن پہلے کی بات ہے۔ پہلوان گھر آیا تو اس کی چال میں ہلکی سی لنگڑاہٹ تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا ہوا ہے تو اس نے ٹالنے کی کوشش کی کہ معمولی خراش آ گئی ہے۔ میں نے زبردستی اس کی ٹانگ سے کپڑا اٹھا کر دیکھا تو وہاں ایک زخم تھا۔ جس پر کپڑا بندھا ہوا تھا۔ میرے بہت مجبور کرنے پر پہلوان نے بتایا کہ دو مزدور ہڈحرام قسم کے تھے اور کام نیت سے نہیں کر رہے تھے۔ پہلوان نے انہیں ڈانٹا تو تلخ کلامی ہو گئی۔ ایک مزدور نے کھدائی کرنے والا ایک اوزار پھینک مارا جو ٹانگ پر لگا۔ بعد میں پہلوان نے دونوں کو پکڑ کر مرمت کی اور انہیں وہاں سے بھگا دیا۔''

میں نے اس بات پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ کوئی ایسی وجہ نہیں تھی جو قتل کا باعث بن سکے۔ معمولی محنت مزدوری کرنے والے مزدوروں میں اتنی جرأت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اس دلیری سے قتل کر جاتے۔ ویسے بھی غریب سے مزدوروں کے پاس پستول کی موجودگی ناممکن سی بات تھی۔ بہرحال میں نے یہ بات اپنے ذہن میں رکھ لی کیونکہ تفتیش کے معاملے میں معمولی سے معمولی بات بھی نظرانداز کرنے کا قائل نہ تھا۔

میں نے پہلوان کی بیوی سے اپنے کام کی کچھ اور باتیں پوچھیں اور پھر اسے جانے کی اجازت دے دی۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد میں نے ضروری سمجھا کہ موقعۂ واردات کا باریک بینی سے معائنہ کر لوں۔ میں پھر گھر کے اندر چلا گیا اور پہلوان کی بیوی سے پوچھا کہ قاتل کس دیوار پر چڑھ کر بھاگا تھا۔ اس نے بائیں طرف والی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ صحن کچا تھا اور ابھی گھر میں لوگوں کی آمدورفت شروع نہیں ہوئی تھی، اس لیے یہ امکان تھا کہ کھُرے مل جائیں گے۔

ننگے پاؤں والا قاتل

میں نے بڑی باریک بینی سے کچی زمین کا معائنہ کرنا شروع کر دیا۔ بارش کا موسم تھا

اور گزشتہ روز بھی بارش ہوئی تھی جس کی وجہ سے کچی مٹی سخت ہو گئی تھی اور کھُروں کے نشان نظر نہیں آ رہے تھے۔ بہرحال میں اندازے سے دیوار کے اس مقام کی طرف زمین پر بیٹھے بیٹھے آگے کو کھسکنے لگا جہاں سے قاتل دیوار پر چڑھا تھا۔ دیوار سے پانچ چھ قدم پہلے صحن کی زمین عام سطح سے نیچی تھی اور وہاں غالباً پانی کھڑا رہا ہو گا جس کی وجہ سے اس جگہ پر مٹی ابھی تک بہت نرم تھی اور اس مٹی پر بڑے صاف اور واضح طور پر قدموں کے نشان نظر آ رہے تھے۔ یہ نشان ایسے تھے کہ میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ حیرانی کی وجہ یہ تھی کہ وہ ننگے پیروں کے نشان تھے۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ کوئی شخص واردات کرنے کے لیے ننگے پاؤں آیا تھا۔

میں کھُروں کے تعاقب میں آگے بڑھا اور دیوار تک پہنچ گیا۔ یہاں دیوار پر ایسے نشان بڑے صاف نظر آ رہے تھے جیسے یہاں سے کوئی اوپر چڑھا ہو۔ یہ نشان پیروں کی رگڑ کے تھے جو مٹی سے لتھڑے ہوئے تھے۔ دیوار کافی اونچی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق دیوار آٹھ فٹ یا اس سے تھوڑی کم اونچی ہو گی۔ اگر اوپر بیٹھا ہوا قاتل کا ساتھی اس کا ہاتھ پکڑ کر نہ کھینچتا تو اندر سے بغیر کسی مدد کے دیوار پر چڑھنا انتہائی مشکل تھا۔

میں نے پہلوان کی بیوی سے معلوم کیا کہ دیوار کی دوسری طرف کیا ہے۔ اس نے بتایا کہ اس طرف خالی جگہ ہے اور اس سے ذرا آگے جا کر ایک کچا راستہ ہے جو کچھ دور جا کر پکی سڑک سے مل جاتا ہے۔ میں نے پہلوان کی بیوی کو اور اس کے بڑے بھائی امجد کو سمجھایا کہ وہ کسی کو اس طرف نہ آنے دیں جہاں کھُروں کے نشان بنے ہوئے ہیں۔ وہ میری بات سمجھ گئے۔ امجد نے چند بڑی بڑی لکڑیاں لا کر کھُروں کے نشانات کے اردگرد رکھ دیں تاکہ کوئی اس طرف نہ آئے۔

اس کے بعد میں گھر سے باہر نکل آیا اور اس دیوار کی باہر والی طرف چل پڑا۔ میں نے منع کر دیا کہ کوئی میرے ساتھ نہ آئے۔ یہ میں نے اس لیے کیا تھا کہ دوسروں کی لاپرواہی سے کھُروں کے ضائع ہو جانے کا امکان تھا۔ میں بڑی احتیاط سے چلتا ہوا اس جگہ کے قریب چلا گیا جہاں سے دونوں ملزم باہر کودے تھے۔ وہاں پہنچ کر میں نے زمین کو دیکھا تو میری طبیعت خوش ہو گئی۔ زمین کیچڑ والی اور بارش زدہ تھی۔ اوپر سے کودنے کی وجہ سے دونوں ملزموں کے کھُروں کے نشان بڑے صاف اور گہرے بنے ہوئے تھے۔ اتنے گہرے اور صاف تھے کہ یوں لگتا تھا جیسے مولڈ تیار کیا گیا ہو۔ ایک کھُرا جوتے والا تھا اور دوسرا ننگے پیروں کا

تھا۔ میں نے ان کھُروں کے مولڈ تیار کروانے تھے۔

میں نے جوتے والے کھُرے کو غور سے دیکھا۔ یہ دیسی جوتے کا نشان تھا جو دیہات میں عام استعمال ہوتے تھے۔ ایسے جوتے گاؤں کے موچی تیار کرتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ کھُرے وہاں سے کچے راستے کی طرف چل پڑے تھے۔ دائیں طرف ننگے پیروں والا اور بائیں طرف جوتوں والا چل رہا تھا۔ دس بارہ قدم آگے چل کر کھُرے ایک دم تبدیل ہو گئے اور میں پریشان سا ہو گیا۔ آگے جا کر ننگے پیروں والے کھُرے اچانک غائب ہو گئے تھے اور صرف جوتوں کے نشان نظر آ رہے تھے۔ میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اب دائیں طرف بھی جوتوں کے نشان والے کھُرے نظر آ رہے تھے۔ میں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ جو شخص گھر کے اندر ننگے پاؤں گیا تھا اور پہلوان کو قتل کر کے آیا، یہاں پر آ کر اس نے بھی جوتے پہن لئے ہوں گے۔

میں نے ایک خیال کے تحت ذرا اِدھر اُدھر ہٹ کر زمین کو غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ جلد ہی مجھے وہ کچھ نظر آ گیا جو میں ڈھونڈ رہا تھا۔ اس جگہ سے تین چار گز ہٹ کر مجھے ملزموں کے جائے واردات پر آنے کے کھُرے نظر آ گئے۔ میں نے ان کھُروں کو دیکھا تو میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی کہ دونوں ملزموں نے جوتے پہنے ہوئے تھے لیکن جب دیوار پر چڑھنے کا مرحلہ آیا تو قاتل نے جوتے اُتار دیئے ہوں گے۔ واپسی پر اس نے باہر آ کر جوتے ہاتھ میں پکڑ لئے اور ذرا آگے جا کر پہن لیے۔

میں دوبارہ واپس جانے والے کھُروں کے پاس آ گیا۔ اب دائیں طرف بھی جوتوں کے کھُرے نظر آ رہے تھے لیکن یہ کھُرے بائیں طرف والے کھُروں سے ذرا مختلف تھے۔ اس کھُرے میں پنجے کے قریب گولائی میں اُبھرا ہوا نشان نظر آ رہا تھا جو اس بات کی نشانی تھی کہ یہاں سے جوتے کا تلا گھِس گیا ہو گا اور چمڑے کا ٹکڑا لگا کر مرمت کی گئی تھی۔

بہر حال میں ان کھُروں پر چلتا گیا۔ آگے جا کر یہ کھُرے کچے راستے پر آ گئے اور پھر وہاں سے پکی سڑک کی طرف چلنے لگے۔ پکی سڑک اس راستے سے ذرا بلند تھی۔ دونوں کھُرے آگے جا کر پکی سڑک پر چڑھ گئے۔ اس سے آگے کھُرے ملنا ناممکن تھا۔ جہاں سے کھُرے پکی سڑک پر چڑھے تھے۔ میں وہاں کھڑا ہو کر اندازہ لگانے لگا کہ ملزم کہیں باہر سے آئے اور واردات کر کے رات کے اندھیرے میں نکل گئے۔ اس واردات کا با قاعدہ منصوبہ بنایا گیا تھا جو کوئی جرائم پیشہ ہی بنا سکتا تھا۔

میری نظریں غیر ارادی طور پر کھُروں کا طواف کر رہی تھیں۔ یعنی میرا ذہن کچھ اور سوچ رہا تھا اور نظریں زمین پر لگی ہوئی تھیں۔ اچانک میری نظر مٹی میں دھنسی ہوئی کسی چیز پر پڑی جو چمک رہی تھی اور اس چیز کا صرف ایک کنارہ مٹی سے باہر نظر آ رہا تھا۔ میں نے کھڑے کھڑے اپنے بوٹ کی ٹو سے اس جگہ سے مٹی کو کریدا تو وہ چیز باہر نکل آئی۔ وہ پستول کی گولی کا خول یا کھوکھا تھا جو مٹی میں دب گیا تھا۔ میں نے یہ کھوکھا اُٹھا کر دیکھا۔ یہ اعشاریہ 32 کے پستول سے چلائی گئی گولی کا کھوکھا تھا۔ میں نے یہ کھوکھا جیب میں رکھ لیا۔

وجہ قتل نامعلوم

کھوکھا جیب میں ڈال کر میں واپس واردات والے گھر کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر میں نے کھُروں کے مولڈ تیار کرنے کے لیے کہا۔ ایسی ہی کارروائیوں میں دو تین گھنٹے گزر گئے۔ آہستہ آہستہ مقتول پہلوان کے عزیز رشتے دار وہاں پہنچنے لگے۔ عورتیں بَین کر رہی تھیں اور بعض اپنے سینے پر دوہتڑ مار مار کر رو رہی تھیں۔ وہاں قیامت کا سماں بنا ہوا تھا اور کیوں نہ ہوتا، اتنا خوبصورت اور گبھرو جوان قتل ہو گیا تھا۔

میں قتل کے اس کیس پر غور کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے ابھی تک قتل کی وجہ ہی معلوم نہیں ہوئی تھی۔ اگر قتل کی وجہ معلوم ہو جاتی تو میرے لیے قاتل تک پہنچنا مشکل نہ ہوتا۔ اس وقت تک یہ میرے لئے بالکل اندھا قتل تھا اور مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ تفتیش کو کس رخ پر لے جاؤں۔ میں نے بہتر سمجھا کہ تھانے چلا جاؤں اور وہاں بیٹھ کر اس کیس پر غور کروں۔ اس کے بعد میں تھانے آ گیا۔

ان دنوں تھانے میں کوئی خاص کام نہیں تھا۔ ایک دو کیس تھے جو ایسے تھے کہ میں نے اپنے اے ایس آئی کے سپرد کر رکھے تھے۔ اس وجہ سے میں نے اپنی توجہ قتل کے اس کیس پر لگا دی۔ میں نے اب تفتیش کے دائرے کو آہستہ آہستہ پھیلانا تھا۔ سب سے پہلے میں نے یہ معلوم کرنا تھا کہ مقتول کے قریبی دوست کون کون ہیں۔ مجھے اُمید تھی کہ ان سے کوئی نہ کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے گی جس سے تفتیش میں مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ میں نے اپنے مخبروں کو بھی استعمال کرنا تھا۔

میں نے اپنے مخبروں کو بلایا اور انہیں سمجھایا کہ انہوں نے کس قسم کی باتیں معلوم کرنی ہیں۔ وہ سب اپنے کام میں ماہر تھے اور خوب سمجھتے تھے کہ کون سی بات ان کے کام کی ہے اور کون سی نہیں۔ ان میں تھانے کے با قاعدہ مخبر بھی تھے اور پیشہ ور مجرم بھی۔ میرے مخبروں میں

علاقے کے معزز لوگ بھی شامل تھے۔ ایک غریب سی عورت بھی ان مخبروں میں شامل تھی۔ مخبر اپنی ڈیوٹی پر نکل گئے۔

صبح سے شام ہونے کو آئی تھی مگر ابھی تک پوسٹ مارٹم رپورٹ نہیں آئی تھی۔ سیدھا سا گولی لگنے کا کیس تھا اور لاش کے پوسٹ مارٹم میں ایسی کوئی پیچیدگی بھی نہیں تھی کہ اتنی دیر ہو جاتی۔ ایک گھنٹہ مزید گزر گیا تو لاش اور پوسٹ مارٹم رپورٹ آگئی۔ کانسٹیبل نے بتایا کہ پوسٹ مارٹم میں دیر اس وجہ سے ہوگئی کہ لاش کے اندر سے گولی نہیں مل رہی تھی۔ پوسٹ مارٹم کرنے والا ڈاکٹر اس میں ناکام ہوگیا تو ایک بڑے ہی قابل عیسائی ڈاکٹر نے گولی ڈھونڈ نکالی۔

رپورٹ میں موت کی وجہ گولی ہی بتائی گئی تھی۔ یہ گولی ہنسلی کی ہڈی کے قریب سے اندر داخل ہوئی اور دائیں پھیپھڑے کو پھاڑتی ہوئی آگے جا کر اسی طرف کے گردے میں سے گزر کر ریڑھ کی ہڈی کے آخر میں جا کر رک گئی تھی۔ موت کا وقت دو اور اڑھائی بجے کے درمیان لکھا تھا۔ مقتول کے جسم پر اس کے علاوہ اور کسی زخم یا ضرب کی موجودگی نہیں پائی گئی تھی۔ رپورٹ کے ساتھ اس عیسائی ڈاکٹر نے میرے لیے ایک پرسنل نوٹ میں لکھا تھا کہ گولی کا اس طرح جسم کے اندر داخل ہونا کم ہی دیکھا گیا ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ گولی کم فاصلے سے چلائی گئی ہے۔

اس رپورٹ کے ساتھ ایک سربمہر تھیلی میں مقتول کے جسم سے برآمد ہونے والی گولی بھی تھی۔ میں نے یہ گولی محفوظ کر لی۔ میں نے ضروری کارروائی کر کے لاش وارثوں کے حوالے کر دی۔ شام کا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ میں نے باقی کی کارروائی اگلے دن پر چھوڑ دی اور اپنے کوارٹر میں آگیا۔ میں صبح چار بجے کا اٹھا ہوا تھا اور اب شام کے آٹھ بج رہے تھے۔ میں نے سب سے پہلے بھاری بھرکم بوٹ اتارے اور پھر وردی سے نجات حاصل کی اور بنیان اور دھوتی پہن لی۔

ایک مشتبہ......شوقین مزاج

دوسری صبح میں معمول کے مطابق تھانے چلا گیا۔ گزرے ہوئے دن کی ساری تھکن دور ہو چکی تھی اور میں بالکل تازہ دم تھا۔ میں نے چند ضروری کام نمٹائے اور پھر پہلوان کے کیس پر غور کرنے لگا۔ مجھے خیال آیا کہ میں پہلوان کے اکھاڑے کو بھول گیا تھا۔ مجھے وہاں جا کر پوچھ گچھ کرنی چاہئے تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ سہ پہر کے وقت میں اکھاڑے جاؤں گا اور پہلوان کے شاگردوں سے کوئی کام کی بات معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔

اسی وقت میرا ایک مخبر آگیا۔ اس نے بتایا کہ پہلوان ویسے تو ہر ایک سے پیار محبت سے پیش آتا تھا اور سب لوگ اس کی دوستی کے دعویدار ہیں لیکن اس کی رازداری والی دوستی صرف ایک جوان کے ساتھ تھی۔ اس جوان کا نام تو مجھے یاد نہیں لیکن کہانی کی سہولت کے لیے میں اسے فیاض لکھوں گا۔ فیاض کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ اس قصبے کے نمبردار کا بیٹا ہے اور نمبردار کے گھر والے واردات والی رات والے دن کو صبح سویرے کسی دوسرے شہر میں شادی کے سلسلے میں چلے گئے تھے۔ انہوں نے پانچ دنوں بعد آنا تھا۔

میں نے اس مخبر کو بھیج دیا اور خود فیاض کے متعلق سوچنے لگا۔ مخبر نے بتایا تھا کہ اس کی اور پہلوان کی رازداری والی دوستی تھی۔ ایسے دوست سے بڑے کام کی باتیں معلوم ہو سکتی تھیں لیکن وہ موجود نہیں تھا۔ میں اس کی واپسی کے انتظار کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ ایک کانسٹیبل نے آ کر بتایا کہ ایک آدمی مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے کانسٹیبل سے اسے بھیجنے کو کہا۔ کانسٹیبل چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد ایک معزز صورت آدمی اندر آیا۔ لباس سے تو وہ درمیانے طبقے کا لگتا تھا لیکن اس کی شخصیت میں ایک وقار سا تھا اور اس کی آنکھوں سے ذہانت ٹپک رہی تھی۔

میں نے اسے عزت سے بٹھایا اور پوچھا کہ میں اس کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ اس نے اپنا تعارف کرایا۔ وہ ایک پرائمری سکول کا استاد تھا۔ اس نے مقتول پہلوان کے کردار کی تعریفیں کرنی شروع کر دیں اور پھر کہا کہ وہ اس قتل کے سلسلے میں ایک بات بتانا چاہتا ہے۔ اس نے جو بات بتائی اسے سن کر مجھے یوں لگا جیسے وہ قاتل کو میرے سامنے لے آیا ہے اور اب میرا کام آسان ہو گیا ہے۔ اس معزز استاد نے بتایا کہ ہفتہ دس دن پہلے کا واقعہ ہے کہ مقتول پہلوان کی ایک نوجوان کے ساتھ لڑائی ہو گئی تھی اور پہلوان نے کلہاڑی نکال لی تھی۔

جس نوجوان کے ساتھ پہلوان کی لڑائی ہوئی تھی وہ ایک حجام کا بیٹا تھا۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ غنڈہ گردی کرتا ہے اور لفنگا ٹائپ نوجوان ہے۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا بھی بدمعاش قسم کے لوگوں کے ساتھ تھا۔

جھگڑے کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہ تھا کہ کس وجہ سے ہوا۔ حجام کے بیٹے کا نام غالباً غلام محمد تھا لیکن وہ گاموکے نام سے مشہور تھا۔ گامو اور پہلوان کی زبانی لڑائی ہوئی پھر کسی بات پر مشتعل ہو کر پہلوان گھر گیا اور کلہاڑی نکال لایا۔ کلہاڑی اور پہلوان کے تیور دیکھ کر گامو

بھاگ کھڑا ہوا۔ پہلوان اس کے پیچھے بھاگا مگر گامو نکل گیا۔

اس کے بعد پہلوان بڑے غصے کے عالم میں گامو کے باپ کے پاس چلا گیا۔ کلہاڑی اس کے ہاتھ میں تھی۔ پہلوان نے گامو کے باپ سے کہا کہ وہ اپنے بیٹے کو باندھ کر رکھے۔ اگر آج کے بعد وہ میرے محلے میں آیا تو کاٹ کر رکھ دوں گا۔ حجام نے اپنے بیٹے کی طرف سے پہلوان سے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ وہ اپنے بیٹے کو سمجھائے گا۔

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ جھگڑا کس وجہ سے ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ نہیں معلوم ہو سکا۔" اس نے کہا۔ "لوگوں نے پوچھا بھی لیکن پہلوان نے کچھ نہیں بتایا۔ گامو کے متعلق مشہور ہے کہ وہ عورتوں سے دوستیاں لگانے کا شوقین ہے اور کبھی کبھی طوائفوں کے پاس بھی جاتا ہے اس نے ضرور کسی کی بہن بیٹی کو چھیڑا ہو گا۔ پہلوان کو اس کا علم ہو گیا ہو گا۔ پہلوان بڑا غیرت مند انسان تھا اور محلے کی تمام عورتوں کو اپنی بہن بیٹی سمجھتا تھا۔ غیرت کے معاملے پر وہ لڑنے مرنے پر اُتر آتا تھا۔"

ساری بات سنا کر اس معزز استاد نے کہا کہ کسی کو یہ معلوم نہ ہو کہ یہ بات میں نے آپ کو بتائی ہے۔ اس نے بتایا کہ گامو کے لفنگے پن اور اوچھی عادتوں کی وجہ سے کوئی بھی اس سے اُلجھنا پسند نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی نے تھانے میں یہ بات نہیں بتائی۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کے جانے کے بعد گامو کے متعلق غور کرنے لگا۔ میں نے اسی وقت ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا اور اسے گامو کے متعلق بتایا اور کہا کہ اس کو تھانے لے آئے۔ میں نے کانسٹیبل سے یہ بھی کہا کہ اگر وہ آنے میں بہانہ بازی کرے تو اس کی مرمت کر دے۔ ہیڈ کانسٹیبل چلا گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہیڈ کانسٹیبل گامو کو لے کر آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ ایک حجام کا بیٹا معمولی سے کپڑوں میں ہو گا اور شکل سے ہی غریبی برس رہی ہو گی لیکن وہ میری توقع کے خلاف بڑے اچھے اور مہنگے کپڑے پہنے ہوئے تھا اور اس کے چہرے پر بھی جوانی کی رونق تھی۔ وہ کافی گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کو کہا تو وہ جھجکتے ہوئے بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھنے کا انداز ایسا تھا جیسے ابھی اٹھ کھڑا ہو گا۔

"سنا ہے تمہارا بڑا دبدبہ ہے لوگوں پر!" میں نے اس سے کہا۔ "اور لوگ تم سے ڈرتے ہیں۔"

وہ میرا منہ دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میری اس بات کا کیا جواب دے۔

میں نے اس کا خوف کم کرنے کے لیے اس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ وہ میری باتوں کے مختصر جواب دینے لگا۔

رفتہ رفتہ وہ کھل گیا اور بے تکلفی سے بولنے لگا۔ اس نے بتایا کہ اسے اپنے باپ کے پیشے سے سخت نفرت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ عزت نہیں کرتے۔ اس لیے اس نے ایک کاٹن مل میں نوکری کر لی جہاں سے اسے اچھے پیسے مل جاتے ہیں۔ وہ اپنے ماں باپ کو کوئی پیسہ نہیں دیتا تھا اور خود اچھا کھاتا اور اچھا پہنتا تھا۔

"سنا ہے تم غنڈہ گردی بھی کرتے ہو!" میں نے کہا۔

"لوگوں کے رویے نے مجھے ایسا بنا دیا ہے۔" گامو نے کہا۔ "لوگ مجھے گھٹیا ذات کا سمجھ کر اچھا سلوک نہیں کرتے حالانکہ میرا باپ محنت مزدوری کرتا ہے۔ اسی وجہ سے باغی ہو کر میں نے غنڈے بدمعاشوں سے یاری لگا لی۔ اب لوگ پیٹھ پیچھے جو مرضی کہتے ہوں لیکن میرے سامنے اونچی آواز سے بولنے کی جرأت نہیں کرتے۔"

"جو تمہارے سامنے اونچی آواز میں بولے اسے تم سبق سکھا دیتے ہو۔" میں نے اس سے کہا۔

"ہاں جی!" اس نے کہا۔ "ایسے آدمی کو خاموش کرانا میں جانتا ہوں۔"

"اسی طرح جس طرح پہلوان کو خاموش کرایا ہے۔" میں نے کہا۔

میری یہ بات سن کر وہ ایک دم گھبرا گیا۔

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟" اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میری پہلوان سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔"

"وہ دن یاد کرو۔" میں نے کہا۔ "جب پہلوان کلہاڑی لے کر تمہارے پیچھے بھاگا تھا...... کیا وہ تمہیں قتل کرنا چاہتا تھا؟"

"اس دن والی بات!" اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ "بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا تھا۔ پہلوان خواہ مخواہ غصے میں آ گیا تھا۔"

"تمہیں اس سے جان کا خطرہ تھا۔" میں نے کہا۔ "اس لیے تم نے بہتر سمجھا کہ اسے ہی ختم کر دو۔"

گامو میری یہ بات سن کر اچھل اچھل کر قسمیں کھانے لگا کہ پہلوان کے قتل سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

"پہلوان سے جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟" میں نے گامو سے پوچھا۔

"وہ جی...... وہ۔" گامو نے اٹکتے ہوئے کہا۔ "پہلوان کو غلط فہمی ہوگئی تھی۔"

"کیسی غلط فہمی؟" میں نے پوچھا۔

"بس جی کیا کہوں۔" گامو نے کہا۔ "پہلوان کا خیال تھا کہ میں کسی لڑکی کے چکر میں اس کے محلے میں آیا ہوں۔"

"کیا یہ سچ ہے؟" میں نے پوچھا۔ "کیا تم واقعی کسی لڑکی کے چکر میں اُدھر گئے تھے؟"

"میں آپ کو سچی بات بتاتا ہوں ملک صاحب!" گامو نے کہا۔ "میں اس معاملے میں بدنام ہوگیا ہوں اور میں ایسی حرکتیں کرتا بھی رہا ہوں لیکن اس دن میں وہاں سے گزر رہا تھا کہ پہلوان سے تکرار ہوگئی۔ میں نے بھی پہلوان سے دب کر بات نہ کی جس سے پہلوان کو غصہ آگیا۔"

میں نے اپنے تجربے کی بنیاد پر اندازہ لگایا کہ وہ سچ بول رہا ہے اور قتل جیسا جرم کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ بہرحال وہ میری نظروں میں مشتبہ تھا اور میں اسے بالکل ہی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اسے دھمکی دی کہ وہ قصبے میں شرافت سے رہے اور اگر اس نے کسی کے ساتھ دھونس دھاندلی کی یا اس کی کوئی شکایت آئی تو میں اس کی ہڈیاں توڑ دوں گا۔

پھر میں نے اس سے کہا وہ قصبے میں ہی رہے اور بغیر بتائے کہیں نہ جائے۔ جب اسے تھانے بلایا جائے وہ حاضر ہو جائے۔ یہ کہہ کر میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

وہ چلا گیا تو میں نے اپنے ایک مخبر سے کہا کہ وہ اس پر نظر رکھے۔

پہلوانوں کے اکھاڑے میں

میں نے کچھ دیر آرام کیا اس کے بعد میرا ارادہ تھا کہ پچھلے پہر پہلوان کے اکھاڑے میں جاؤں گا اور اس کے ساتھی پہلوانوں اور شاگردوں سے پوچھ گچھ کروں گا۔ مجھے بتایا گیا کہ پہلوان کے قتل ہونے کی وجہ سے اکھاڑے میں زور نہیں ہو رہا۔ یہ بھی بتایا گیا کہ پہلوان کے تمام ساتھی اور شاگرد پہلوان کے گھر تعزیت کے لیے پہنچے ہوئے ہیں۔ میں نے اپنے اے ایس آئی سے کہا کہ وہ پہلوان کے گھر چلا جائے اور وہاں جو بھی پہلوانوں کا انچارج ہے، اس سے کہے کہ آج سہ پہر چار بجے تمام پہلوانوں کو لے کر اکھاڑے پہنچ جائے۔ اے ایس آئی نے

ایسا ہی کیا اور میرا پیغام پہنچا دیا۔

چار بجے کے قریب میں قصبے سے باہر کھیتوں والی طرف چلا گیا۔ وہاں امرودوں کا ایک باغ تھا جو ایک پہلوان کا تھا۔ اس باغ کے ساتھ ہی درختوں میں گھرا ہوا زمین کا ایک ٹکڑا تھا۔ اس ٹکڑے پر اکھاڑہ کھدا ہوا تھا۔ اکھاڑے سے ذرا ہٹ کر ایک کنواں تھا۔ زور آزمائی سے فارغ ہونے کے بعد سارے پہلوان تھوڑی دیر آرام کر کے اس کنوئیں سے نہاتے تھے۔ اسی کنوئیں سے باغ کو پانی جاتا تھا۔

اکھاڑے میں تمام پہلوان موجود تھے۔ ان میں بڑے بھی تھے اور چھوٹی عمر کے بھی۔ ان میں ایک پہلوان سب سے سینئر تھا اور مقتول اچھو پہلوان کا خاص شاگرد اور اس کا نائب تھا۔ اس نے سب شاگردوں کو ایک قطار میں بٹھا دیا تھا۔ میں نے مختصر سی بات کی اور کہا کہ تمہارا استاد خلیفہ قتل ہوگیا ہے اور میں اس کے قتل کی تفتیش کر رہا ہوں۔ میرے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ میں قاتل تک پہنچ سکوں نہ ہی پولیس والوں کے پاس کوئی جادو ہوتا ہے کہ وہ مجرموں کو پکڑ لیں۔ اس سلسلے میں آپ لوگوں کا تعاون ضروری ہے۔ کسی کو ایسی کوئی بات معلوم ہو جو اس کیس کی تفتیش کے سلسلے میں مدد کر سکتی ہو تو ضرور مجھے بتائیں۔ مثلاً پہلوان کا کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا یا دشمنی ہوگی یا کوئی ایسی وجہ جو قتل کا باعث بن سکتی ہو۔

سارے خاموش رہے اور ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ سب نے پہلوان کی تعریف کی کہ استاد جی نہایت نرم مزاج اور شریف انسان تھے۔ جب بھی کسی پہلوان کو شکست دیتے تو تشکر بھری نظروں سے آسمان کی طرف دیکھتے اور پھر شکست خوردہ پہلوان کو گلے لگا کر اس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ پہلوان نے کبھی دوسرے کو ہرانے کے بعد نعرہ نہیں لگایا تھا اور نہ ہی بھنگڑا ڈالا تھا۔ اس کے برعکس اگر کوئی اپنا پٹھہ ہار جاتا تو نہ غصہ کرتے نہ گالیاں دیتے بلکہ اسے سمجھاتے کہ اس سے کیا غلطی ہوئی ہے اور اسے کیا کرنا چاہئے تھا۔ اکثر ہارنے والے شاگرد سے کہتے۔ "جوان، کوئی بات نہیں، ڈھے گئے ہو، مرتو نہیں گئے۔ اگلی بار سہی۔"

مجھے ان شاگردوں سے کام کی کوئی بات معلوم نہیں ہو رہی تھی اور میں مایوس ہو چلا تھا۔

"استاد جی!" ایک پٹھے نے کھڑے ہو کر نائب سے کہا۔ "تھانیدار جی کو وہ بات بتائیں نا، باندر سنگھ والی۔"

میں نے پہلوان کے نائب کی طرف دیکھا وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔

"یہ باندر سنگھ والی کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔ "اور باندر سنگھ کون ہے؟"

"باندر سنگھ ایک سکھ پہلوان ہے۔" نائب نے کہا۔ "اس کا اصل نام تو بہادر سنگھ ہے لیکن اس کی شکل دیکھ کر لگتا ہے جیسے کسی بندر کو دیکھ لیا ہو۔ اسی وجہ سے وہ باندر سنگھ کے نام سے مشہور ہو گیا ہے اور سب اسے باندر ہی کہتے ہیں۔"

"مجھے باندر سنگھ والی بات سناؤ۔" میں نے اصل بات کی طرف آتے ہوئے کہا۔ "کیا ہوا تھا؟"

اچھو پہلوان کے نائب نے جس کا نام ظہور تھا اور جھورا پہلوان کہلاتا تھا، تمام پٹھوں کو جانے کا اشارہ کیا اور مجھے اکھاڑے سے ذرا ہٹ کر دوسری طرف لے گیا۔ وہاں بان کی دو چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے مجھے ایک چارپائی پر بیٹھنے کو کہا اور دوسری چارپائی پر خود بیٹھ گیا۔

"پہلے میرا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا۔" جھورے نے کہا۔ "اس لڑکے نے باندر سنگھ کا نام لیا ہے تو اب مجھے خیال آ رہا ہے کہ یہ بات قتل کا باعث بن سکتی ہے۔"

"کوئی لڑائی جھگڑا ہو گیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میں آپ کو پوری بات سنا دیتا ہوں۔" جھورے نے کہا۔ "آگے آپ خود اندازہ لگا لیں کہ اس واقعے کا قتل سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے یا نہیں۔"

جھورے نے بڑی دلچسپ بات سنائی جو میں آپ کو اپنے الفاظ میں سنا دیتا ہوں۔ اس نے بتایا کہ اس قصبے سے دس بارہ میل دور ایک گاؤں ہے جہاں باندر سنگھ رہتا ہے۔ اس گاؤں میں زیادہ تعداد سکھوں کی ہے۔ اس کے بعد ہندو ہیں۔ مسلمان کوئی بھی نہیں ہے۔ باندر سنگھ بڑا زور آور پہلوان ہے۔ کسی بھینسے کی طرح طاقتور ہے۔ دور و نزدیک اس کی بڑی شہرت ہے۔ باندر سنگھ داؤ پیچ لڑانے میں اتنا ماہر نہیں، زیادہ تر کشتیاں وہ اپنی اندھی طاقت کے بل پر جیت لیتا ہے۔

باندر سنگھ والے گاؤں میں ہر سال ایک میلہ لگتا تھا۔ غالباً سکھوں یا ہندوؤں کا کوئی مذہبی تہوار ہوتا تھا۔ اس موقع پر دور و نزدیک سے پہلوان وہاں جاتے تھے اور کشتیوں کے مقابلے ہوتے تھے۔ جیتنے والے پہلوانوں کو انعام و اکرام سے نوازا جاتا تھا۔ تین چار مہینے پہلے اس گاؤں میں میلہ لگا تھا۔ اس بار اچھو پہلوان بھی اپنے نائب جھورے اور چند منتخب شاگردوں کو ساتھ لے کر اس میلے پر چلا گیا۔ وہاں کشتیوں کے مقابلے ہو رہے

تھے۔

باندر سنگھ کا ایک پہلوان کے ساتھ جوڑ پڑا۔ مخالف پہلوان اچھا خاصا تگڑا تھا لیکن باندر سنگھ نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا اور سامنے آتے ہی اٹھا کر پٹخ دیا۔ باندر سنگھ کو اکھاڑے کی مٹی بھی نہ لگی تھی اور اس نے کشتی جیت لی۔ اس کے حامیوں نے بھنگڑے ڈالے اور نعرے لگا لگا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ان میں ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔ اس کے متعلق معلوم ہوا کہ باندر سنگھ کی منگیتر ہے اور باندر سنگھ کی ہر کشتی کے موقع پر اکھاڑے کے باہر موجود ہوتی ہے۔ اس لڑکی کا نام ریشم کور بتایا گیا۔

اس کے بعد باندر سنگھ نے پورے اکھاڑے کا چکر لگایا اور چیلنج کیا کہ کوئی ہے جو اس کے مقابلے پر آئے۔ یہ اس وقت کا رواج تھا کہ کوئی بھی پہلوان اکھاڑے کا چکر لگاتے ہوئے اپنا جوڑ طلب کر سکتا تھا۔ تماشائیوں میں موجود پہلوان چیلنج قبول کر کے میدان میں آ جاتے تھے۔ باندر سنگھ کا چیلنج کسی نے قبول نہ کیا تو اچھو پہلوان یعنی مقتول نے اکھاڑے میں اُتر کر اس کا چیلنج قبول کر لیا۔

دونوں میں بڑی زوردار کشتی ہوئی۔ اگر باندر سنگھ زور آور تھا تو مقتول پہلوان بھی کم نہ تھا بلکہ اس کو داؤ پیچ میں مہارت کی وجہ سے برتری حاصل تھی۔ مختصراً مقتول نے ایک ایسا داؤ کھیلا جسے باندر سنگھ نہ سمجھ سکا اور چت ہو گیا۔ منصف نے مقتول اچھو پہلوان کو فاتح قرار دے دیا لیکن باندر سنگھ اس فیصلے سے مطمئن نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ پوری طرح چت نہیں ہوا۔ منصف بھی سکھ تھا۔ اس نے کہا کہ کشتی دوبارہ ہو گی۔ یہ صاف بے ایمانی ہو رہی تھی چنانچہ مقتول نے دوبارہ کشتی لڑنے سے انکار کر دیا۔

باندر سنگھ کی اپنے ہی گاؤں میں گاؤں والوں کے سامنے اور اپنی منگیتر کے سامنے بے عزتی ہو گئی تھی۔ اس نے اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ وہ اپنے گاؤں میں کبھی کشتی نہیں ہارا تھا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ اچھو پہلوان کو اس سے کشتی لڑنی پڑے گی ورنہ وہ اسے یہاں سے زندہ نہیں جانے دے گا۔ بات بڑھ گئی۔ اچھو پہلوان اور اس کے ساتھی بزدل نہیں تھے جو ڈر جاتے۔ انہوں نے بھی لاٹھیاں سنبھال لیں۔

قریب تھا کہ خون خرابہ ہو جاتا، اس گاؤں کے بزرگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا اور اپنے لوگوں کو شرم دلائی کہ مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک کر رہے ہو۔ اس طرح خون خرابہ ہوتے ہوتے رہ گیا اور مقتول پہلوان اور اس کے ساتھی وہاں سے آ گئے جب وہ وہاں سے آنے لگے تو

باندر سنگھ نے دھمکی دی کہ وہ اچھو کو اکھاڑے میں گرا کر رہے گا اور اگر وہ اکھاڑے میں سامنے نہ آیا تو اس کی لاش گرا دے گا۔

جھورے نے بتایا کہ بعد میں دو تین مرتبہ باندر سنگھ نے اپنا آدمی بھیجا لیکن مقتول نے صاف جواب دے دیا کہ وہ اس بدتمیز اور بے ایمان سے کشتی نہیں لڑے گا۔ اگر وہ بدمعاشی کرے گا تو اس کا جواب بدمعاشی سے ملے گا۔

''اب آپ خود ہی سوچ لیں۔'' جھورے نے ساری بات سنا کر کہا۔ ''اس بات کا پہلوان کے قتل سے کوئی تعلق بنتا ہے یا نہیں۔''

میں نے غور کیا تو مجھے یہی نظر آیا کہ یہ بات قتل کا باعث بن سکتی ہے۔ میں نے باندر سنگھ سے پوچھ گچھ کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا گاؤں میرے تھانے کی حدود میں نہیں آتا تھا۔ اس کے لیے مجھے اس علاقے کے تھانیدار سے قانونی طریقے سے مدد لینی تھی۔ وہاں ایک ہندو رام دیال تھانیدار تھا۔ وہ راجپوت برادری سے تعلق رکھتا تھا اور عام ہندوؤں سے مختلف تھا۔ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ میری اس کے ساتھ خاصی بے تکلفی تھی۔ وہ تجربے اور سروس کے لحاظ سے مجھ سے جونیئر تھا۔ تفتیش کے دوران کھل کر تشدد کرنے کا قائل تھا۔

باندر سنگھ

اگلے دن میں رام دیال کے پاس جا پہنچا۔ مجھے دیکھ کر وہ پہلے تو حیران ہوا پھر اٹھ کر گلے ملا۔ میں نے اسے بتانا چاہا کہ میں کس مقصد کے لیے آیا ہوں لیکن اس نے مجھے بولنے ہی نہیں دیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اس نے ایک کانسٹیبل کو بلا کر ٹھنڈا دودھ لانے کو کہا اور ایک دوسرے کانسٹیبل سے کہا کہ دوپہر کے کھانے کے لیے بندوبست کرے۔

''اب بتاؤ ملک جی!'' اس نے کہا۔ ''کیا حکم ہے؟''

میں نے اسے ساری بات سنائی اور اپنے آنے کا مقصد بتایا۔

''آپ آرام سے بھوجن کریں۔'' میری بات سن کر رام دیال نے کہا۔ ''اس باندر کی اولاد کو ابھی حاضر کر دوں گا۔''

اس نے میرے لئے بڑے پُرتکلف کھانے کا انتظام کیا تھا۔ وہ گوشت سے عام ہندوؤں کی طرح پرہیز نہیں کرتا تھا بلکہ اسے گوشت کھانے کا ایسا چسکا پڑ گیا تھا کہ اکثر کہا کرتا تھا یہ ہندوؤں کی بیوقوفی ہے جو اتنی مزیدار شے کو نہیں کھاتے۔ اس نے میرے ساتھ ڈٹ کر

گوشت کھایا۔

کھانے کے بعد اس نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بھیجا کہ وہ باندر سنگھ کو تھانے لے آئے۔ ہیڈ کانسٹیبل چلا گیا اور رام دیال میرے ساتھ اس کیس کے متعلق باتیں کرنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ پہلوان کو باندر سنگھ نے قتل نہیں کیا۔ اگر قتل کرنا ہوتا تو اتنے مہینے انتظار نہ کرتا۔ اس نے بتایا کہ سکھ ایسی قوم ہے جو وقتی جوش میں قتل تک کر گزرتی ہے۔ وقت گزر جائے تو پھر پچھتاتے ہیں۔

میں نے اس کی اس رائے سے اتفاق کیا لیکن یہ بھی بتایا کہ میں اپنی تسلی کرنا ضرور سمجھتا ہوں۔

تھوڑی دیر اور گزری ہو گی جب ہیڈ کانسٹیبل واپس آ گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ باندر سنگھ کو ساتھ لے آیا ہے۔ رام دیال نے اس سے کہا کہ وہ باندر سنگھ کو اندر لے آئے۔ تھوڑی دیر بعد ہیڈ کانسٹیبل کے پیچھے جو شخص اندر آیا، اسے دیکھتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے کوئی بن مانس اندر آ گیا ہو۔ لوگوں نے اس کا نام اگر باندر سنگھ رکھا تھا تو ٹھیک ہی تھا۔ اس کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ وہ واقعی بن مانس لگتا تھا۔

اس نے ہم دونوں کو ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اور بولا۔ ''حکم سرکار!''

''تمہارا نام بہادر سنگھ ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''جی سرکار!'' اس نے کہا۔

''اچھو پہلوان کو جانتے ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''کون اچھو؟'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''وہی جس نے میلے میں تمہیں گرایا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اور تم نے اسے گرانے کی قسم کھائی تھی۔''

''اوہ، وہ پہلوان!'' باندر سنگھ نے چونک کر کہا۔ ''اسے تو میں کبھی نہیں بھولوں گا۔''

''تم نے ہارنے کے بعد اسے قتل کرنے کی دھمکی دی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''قتل کی دھمکی!'' اس نے چونک کر کہا پھر بولا۔ ''وہ تو بس غصے میں کہہ دیا تھا۔ میں دل ہی دل میں اس کی بڑی عزت کرتا ہوں۔ وہ صحیح معنوں میں فنکار پہلوان ہے۔''

''ہے نہیں، تھا کہو۔'' میں نے کہا۔ ''وہ آج سے دو دن پہلے قتل ہو گیا ہے۔''

"اور آپ کے خیال میں اسے میں نے قتل کیا ہے!" اس نے میرا مطلب سمجھ کر کہا۔

"ہاں!" میں نے کہا۔ "مجھے یہی شک ہے۔"

"آپ نے قتل کا کون سا دن بتایا تھا؟" اس نے پوچھا۔

میں نے اسے قتل والا دن بلکہ رات بتائی تو اس کے چہرے پر ایک اطمینان سا ظاہر ہونے لگا۔

"اس دن میری بہن کی شادی تھی۔" اس نے کہا۔ "آپ پورے گاؤں سے پوچھ لیں کہ میں وہ پورا دن اور رات گاؤں سے باہر نہیں نکلا۔"

اس کی زبانی یہ سن کر مجھے مایوسی ہونے لگی۔ میرے کہنے پر رام دیال نے ایک کانسٹیبل کو باندر سنگھ کے گاؤں میں بھیجا کہ وہ اس بات کی تصدیق کر کے آئے کہ واقعی اس دن اس کی بہن کی شادی تھی اور یہ گاؤں کے اندر ہی موجود رہا تھا۔ کانسٹیبل چلا گیا۔

"اگر میں نے اسے قتل کرنا ہوتا تو اسی دن زندہ نہ جانے دیتا۔" بہادر سنگھ نے کہا۔ "اتنا عرصہ انتظار نہ کرتا۔"

مجھے اچانک جائے واردات پر موجود کُھروں کا خیال آ گیا۔ میں نے اس کے پیروں کی طرف دیکھا اور پھر میری مایوسی میں اضافہ ہو گیا۔ اس کے پیر بہت بڑے اور موٹے موٹے تھے جبکہ جائے واردات پر پائے جانے والے دونوں کُھروں کے نشان عام انسانوں جیسے تھے۔ اب مجھے یقین ہونے لگا کہ باندر سنگھ کا اس قتل میں کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ کچھ دیر بعد کانسٹیبل نے آ کر تصدیق کر دی کہ باندر سنگھ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔

ہم دونوں انسپکٹروں نے اس سے بہت سے سوال کیے تھے لیکن اس نے ہر بات کا معقول جواب دیا تھا۔ سورج ڈھلنے لگا تو میں رام دیال کا شکریہ ادا کر کے واپس آ گیا۔

تعویذ اور قاتل

اپنے تھانے واپس پہنچا تو اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ میرے اے ایس آئی نے بتایا کہ مقتول پہلوان کا سسر ملنے آیا تھا۔ اب وہ کل آئے گا۔ میں سفر کی وجہ سے تھکا ہوا تھا، اس لیے اپنے کوارٹر میں آ کر لیٹ گیا۔

اگلے دن میں صبح جلدی تھانے چلا گیا۔ واردات کو تین دن گزر گئے تھے اور میں ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ میں اسی ادھیڑ بُن میں بیٹھا تھا کہ مجھے بتایا گیا مقتول پہلوان کا سسر آیا ہے۔ میں نے اسے بلا لیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ادھیڑ عمر معزز شخص اندر آیا۔ اس کی

چمکدار آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ خاصا جہاں دیدہ اور ذہین شخص ہے۔

میں نے اسے عزت کے ساتھ بٹھایا۔ اس نے بتایا کہ وہ مقتول پہلوان کا سسر ہے اور اس کا ماموں بھی لگتا ہے۔ وہ اپنے بھانجے کے قتل کے متعلق پوچھنے آیا تھا کہ تفتیش کہاں تک پہنچی ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے اب تک کیا کیا کارروائی کی ہے۔ اس کے بعد میں نے اسے تسلی دی کہ میں قاتل کو پکڑنے میں جلد ہی کامیاب ہو جاؤں گا۔

اس نے بتایا کہ تقریباً ایک ماہ پہلے مقتول اس کے پاس آیا تھا۔ وہ اپنے ٹھیکیداری کے کام کے متعلق کافی مایوس نظر آ رہا تھا اور کہتا تھا کہ اس قصبے میں اس کا دل نہیں لگتا اور وہ قصبہ چھوڑنا چاہتا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ قصبے کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ اگر وہ وہاں رہا تو اس کے ہاتھ سے کوئی قتل ہو جائے گا۔

"میں نے امجد سے کہا تھا کہ کُھرا اٹھایا جائے۔" مقتول کے ماموں نے کہا۔ "لیکن وہ اس پر راضی نہیں ہو رہا۔ میں نے اسے یہ بھی کہا تھا کہ ماہر کھوجی بلا کر اسے کُھرے دکھائے جائیں لیکن وہ نہیں مانتا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ سب ڈھکوسلہ ہے۔ کھوجی لوگوں کو بیوقوف بناتے ہیں۔"

یہاں میں قارئین کو یہ بتا دوں کہ کُھرا اٹھانا سے کیا مراد ہے۔ ایک ہموار جگہ پر ریت یا راکھ بچھا دی جاتی تھی۔ پھر اس ریت یا راکھ پر سے مشکوک اشخاص کو گزارا جاتا تھا۔ ریت یا راکھ پر ان کے قدموں کے نشان بن جاتے۔ پھر کھوجی جائے واردات پر پائے جانے والے کُھروں سے ان کُھروں کا موازنہ کرتا۔ اگر کسی کے کُھرے واردات والے کُھروں سے مل جاتے تو اسے مجرم سمجھ لیا جاتا تھا۔

یہ طریقہ سو فیصد کامیاب نہیں تھا ویسے بھی یہ اس وقت کارآمد ہوتا تھا جب کچھ مشکوک یا مشتبہ لوگ سامنے ہوں۔

میں نے مقتول کے ماموں سے پوچھا کہ اسے کسی پر شک ہے یا وہ ویسے ہی کُھرا اٹھانا چاہتا ہے۔ اس نے بتایا کہ اسے مقتول کے بڑے بھائی کی حرکتیں مشکوک لگتی ہیں اور اسے اس پر شک ہے۔ میں نے شک کی وجہ پوچھی تو اس نے ایک نئی بات سنا دی۔

اس نے بتایا کہ جب مقتول اس کے پاس آیا تھا تو باتوں باتوں میں اس نے بتایا تھا کہ اس کے بڑے بھائی کی بیوی کا چال چلن ٹھیک نہیں ہے اور اسے شک ہے کہ حجام کے لڑکے گامو کے ساتھ اس کے غلط قسم کے تعلقات ہیں اور اس مسئلے پر اس کا امجد کے ساتھ کئی بار جھگڑا بھی

ہوا تھا۔ پہلوان کہتا تھا کہ امجد بے غیرت بنا ہوا ہے اور اسے سب کچھ معلوم ہے۔

یہ بات سن کر میں چونک گیا اور میرے ذہن میں فوراً وہ منظر فلم کی طرح چلنے لگا کہ پہلوان گامو کے پیچھے کلہاڑی لیے اسے مارنے کے لیے بھاگ رہا تھا اور گامو گلیوں میں غائب ہو گیا تھا۔ اب میں نے مقتول کے ماموں کے بیان کی روشنی میں واردات کی کڑیاں ملانی شروع کیں تو مجھے امجد کا کردار مشکوک نظر آنے لگا۔

''مجھے امجد پر ایک اور بھی شک ہے۔'' مقتول کے ماموں نے کہا۔ ''امجد کو میری باتوں سے یہ احساس ہو گیا ہے کہ میں اس پر شک کرنے لگا ہوں۔ اب وہ مجھے راستے سے ہٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔''

''آپ کو ایسا شک کیوں ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''کہ وہ آپ کو قتل کرنا چاہتا ہے؟''

''کل رات ڈیڑھ بجے وہ میرے پاس آیا تھا۔'' ماموں نے کہا۔ ''اور کہنے لگا کہ اسی وقت اس کے ساتھ ایک دوسرے شہر چلوں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کہاں جانا ہے تو اس نے بتایا کہ وہاں ایک پیر بابا جی ہیں۔ وہ ایک تعویذ دیں گے جس سے قاتل پکڑا جائے گا۔ میں محتاط ہو گیا اور اسے ٹال دیا۔''

''اس نے یہ نہیں بتایا۔'' میں نے پوچھا۔ ''کہ تعویذ سے قاتل کیسے پکڑا جا سکتا ہے۔''

''اس نے بتایا تھا۔'' مقتول کے ماموں نے کہا۔ ''وہ کہہ رہا تھا کہ تعویذ لا کر مقتول کی قبر پر رکھیں گے۔ اس کے ایک دن بعد قاتل جہاں بھی ہو گا، اس کے جسم پر خارش اور پھوڑے پھنسیاں نکل آئیں گی یا اسے کوڑھ ہو جائے گا۔''

پڑھے لکھے لوگ اس بات پر یقین نہیں کریں گے لیکن اُس زمانے میں لوگوں کی ضعیف الاعتقادی اس سے بھی زیادہ تھی۔ دیہات میں رہنے والے لوگ پسماندہ تھے۔ اس علاقے کے لوگوں میں ایک اور روایت مشہور تھی جو بڑی دلچسپ اور عجیب تھی۔ اگر قتل کی کوئی واردات ہو جاتی تو ان کا پیر چمڑے کی مشک یا مشکیزے پر کچھ پڑھ کر دیتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ مشک مقتول کی قبر کے اوپر ہوا بھر کر لٹکا دو۔ آہستہ آہستہ اس مشک کی ہوا کم ہوتی جائے گی۔ اور یہ ہوا قاتل کے پیٹ میں بھرتی جائے گی۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچے گی کہ قاتل کا پیٹ پھٹنے والا ہو جائے گا تو قاتل بھاگتا ہوا آ جائے گا اور کہے گا کہ میں قاتل ہوں، مجھے گرفتار کر لو یا مار دو مگر اللہ کے واسطے یہ مشک اتار لو۔

میں نے مقتول کے ماموں کا شکریہ ادا کیا اور بڑی عزت سے رخصت کیا۔

عورت کی کمائی

اب میں نے نئے سرے سے تفتیش شروع کرنی تھی اور اس کا رخ امجد اور گامو کی طرف موڑنا تھا۔ میں نے امجد کا بیان نکال کر دوبارہ غور سے دیکھا اور اس میں مجھے کوئی ایسی بات محسوس ہوئی جو غلط تھی لیکن مجھے اس کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ پھر میں نے گامو کے بیان کو دیکھا۔ اس کے بعد مجھے پوسٹ مارٹم رپورٹ کا خیال آیا۔ میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کو بھی غور سے دیکھا اور پھر مجھے وہ وجہ معلوم ہو گئی جو امجد کے بیان میں کھٹک رہی تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں مقتول کی موت کا وقت دو اور اڑھائی بجے کے درمیان کا لکھا گیا تھا جبکہ امجد کے بیان کے مطابق وہ اس رات ڈیڑھ بجے ہوٹل بند کر کے چلا تھا اور دو بجے گھر پہنچا اور پھر سو گیا۔ اندازاً وہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ سویا ہو گا کہ اس کی آنکھ کھلی۔ یعنی اس کے بیان کے مطابق اس وقت رات کے تین یا ساڑھے تین بجے کا وقت ہو گا۔

یہ بات امجد کے خلاف جا رہی تھی۔ اس کے علاوہ مقتول پہلوان کی بیوی کے بیان کے مطابق قتل کا وقت ڈیڑھ دو بجے تھا۔ مجھے امجد کی یہ بات بھی یاد آئی کہ اس نے مجھے کہا تھا کہ یہ ڈاکوؤں کا کام لگتا ہے جو ڈاکہ مارنے آئے تھے۔ اس وقت میں نے اسے امجد کی کم عقلی سمجھا تھا لیکن اب میں سمجھا کہ وہ مجھے غلط راستے پر لگا رہا تھا۔ میں نے امجد کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے علاوہ میں نے گامو کو بھی گرفتار کر کے دوبارہ پوچھ گچھ کرنی تھی۔

سہ پہر کے چار بجے ہوں گے جب مجھے ایک کانسٹیبل نے آ کر بتایا کہ نمبردار کا بیٹا مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں اس کی آمد پر حیران ہوا کیونکہ مجھے بتایا گیا تھا کہ چار پانچ دنوں بعد اس کی واپسی ہو گی اور اس حساب سے اسے ابھی دو دن بعد آنا تھا۔ بہر حال میں نے کانسٹیبل سے کہا کہ اس کو بھیج دو۔

تھوڑی دیر بعد ایک خوبصورت اور صحت مند جوان اندر آ گیا۔ اس کے چہرے سے دکھ اور غم صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ نظر آ رہی تھیں جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ رویا بھی ہو گا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ پہلوان کے ساتھ اگر کسی کی یاری ہے تو وہ نمبردار کا بیٹا ہے۔ میں اس کی جذباتی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ میں نے اسے بٹھایا اور اس کے دوست کی موت پر افسوس کا اظہار کیا۔ وہ اور زیادہ جذباتی ہو گیا۔ اس کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ وہ بولنا چاہتا تو

اس کی آواز رندھ جاتی تھی۔

''تمہیں تو دو دن بعد آنا تھا۔'' میں نے اس سے پوچھا۔ ''پھر اتنی جلدی کیسے آ گئے؟''

''مجھے ایک آدمی نے خبر کر دی تھی۔'' اس نے اپنے آپ پر قابو پا کر کہا۔ ''میں فوراً واپس آ گیا...... انہوں نے میرے یار کو مار دیا ہے...... یہ کیا ہو گیا ہے؟''

''کس نے مار دیا ہے تمہارے یار کو؟'' میں نے پوچھا۔ ''تم کن لوگوں کی بات کر رہے ہو؟''

''انہی بے غیرتوں نے۔'' اس نے غصے سے بائیں ہتھیلی پر دائیں ہاتھ کا مکہ مارتے ہوئے کہا۔ ''خون سفید ہو گیا ہے......''

''تمہیں کس پر شک ہے؟'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''اس کا نام بتاؤ، میں اُلٹا لٹکا دوں گا۔''

''شک نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ پہلوان کو اس کے بھائی امجد اور گامو نے مل کر مارا ہے۔''

''اس یقین کی کوئی وجہ ہو گی۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، پہلوان بڑا غیرت مند تھا۔'' اس نے کہا۔ ''امجد کی بیوی اور گامو میں یاری تھی۔ اس بات کا امجد کو علم تھا لیکن وہ جان بوجھ کر بے غیرت بنا ہوا تھا۔ امجد کا گھر پہلوان کے گھر کی پچھلی گلی میں تھا۔ پہلوان کو ان ناجائز تعلقات کا علم ہو گیا تھا۔''

نمبردار کا بیٹا جس نے اپنا نام فیاض بتایا، اس نے بڑی تفصیل سے ہر بات سنائی تھی پہلوان اس کے ساتھ ہر راز داری والی بات کر لیتا تھا۔ میں طوالت سے بچنے کے لیے آپ کو مختصراً سنا دیتا ہوں۔ امجد اور گامو کی آپس میں بڑی یاری تھی اور اکثر گامو اس کے گھر بھی آتا جاتا تھا۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ گامو امجد کی غیر موجودگی میں بھی ان کے گھر آنے لگا۔ پہلوان کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے امجد کو سمجھایا کہ گامو جیسے لوفر آدمی کا یوں گھر میں آنا جانا ٹھیک نہیں ہے اور وہ اس کو بند کرے مگر امجد نے اسے اُلٹا ڈانٹ دیا کہ وہ اس سے بڑا بننے کی کوشش نہ کرے اور اپنے کام سے کام رکھے۔

انہی دنوں امجد نے گھر میں ایک نیا کمرہ بنوایا۔ اس کے پاس اتنی رقم نہیں تھی۔ پتہ لگا کہ گامو نے اس کو کمرے کی تعمیر کے لیے خاصی رقم دی تھی۔ اس کے بعد گامو کا امجد کے گھر میں آنا

جانا بہت زیادہ ہو گیا۔ امجد کی بیوی عمر میں امجد سے خاصی چھوٹی تھی اور شکل وصورت کی بھی اچھی تھی۔ امجد سارا دن ہوٹل پر ہوتا اور رات دیر سے گھر آتا تھا۔ ایسے میں اس کی بیوی نے گامو سے دوستی گانٹھ لی۔

ایک دن پہلوان نے گامو کو امجد کے گھر سے نکلتے دیکھ لیا تو اس کو پکڑ لیا اور کہا کہ اب ادھر نظر آیا تو جان سے جائے گا۔ گامو کا اٹھنا بیٹھنا غنڈے بدمعاشوں کے ساتھ تھا، اس نے ڈرنے کی بجائے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اس پر پہلوان کو غصہ آ گیا اور وہ گھر سے کلہاڑی لے آیا۔ کلہاڑی دیکھ کر گامو بھاگ گیا۔

اسی رات کو امجد ہوٹل بند کر کے آیا تو پہلوان اس کے گھر چلا گیا اور اسے سمجھایا کہ اگر اس نے گامو کا اس گھر میں آنا جانا بند نہ کیا تو وہ گامو کو بھی مار دے گا اور امجد کی بیوی کو بھی۔ اس کی یہ بات سن کر امجد بگڑ گیا اور اس نے پہلوان سے کہا کہ وہ اس کی بیوی پر الزام نہ لگائے ورنہ اس کا بھی ہاتھ اٹھ جائے گا۔ اس پر بات بڑھ گئی اور پہلوان نے بڑے بھائی کو بے غیرت اور عورت کی کمائی کھانے والا کہہ دیا۔

پہلوان نے یہ ساری باتیں اپنے دوست فیاض کو بتائیں۔ فیاض نے ایک روز گامو کو پکڑ لیا اور اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن گامو نے اُلٹا دھمکیاں دینی شروع کر دیں کہ اپنے یار کو سنبھال کر رکھ ورنہ اسے پار کر دیں گے۔ فیاض کوئی کمزور آدمی نہیں تھا اور نہ ہی کوئی کمین تھا کہ گامو جیسے لوفر لفنگے کی دھونس میں آ جاتا۔ اس کا باپ نمبردار تھا۔ اس نے گامو کو ننگی گالیاں دیں اور کہا کہ وہ اسے قصبے سے نکلوا دے گا۔ اس کے جواب میں گامو نے فیاض کو بھی دھمکیاں دیں کہ وہ اس سے بھی نمٹ لے گا۔

فیاض نے مجھے بڑی تفصیل سے اور بڑی لمبی بات سنائی تھی۔ میں نے آپ کو مختصراً یہ بیان سنایا ہے۔ میں نے فیاض کا شکریہ ادا کیا اور اس سے کہا کہ وہ مطمئن ہو کر چلا جائے۔ میں اس کے جگری یار کے قاتل کو پکڑ کر پھانسی پر لٹکواؤں گا۔ وہ چلا گیا۔

خون سفید ہو گیا

فیاض نے میرے شک کو یقین میں بدل دیا تھا۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر کارروائی کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اسی وقت اے ایس آئی کو بلا کر کہا کہ وہ امجد کے ہوٹل پر جائے اور اسے گرفتار کر کے لے آئے۔ میں نے اس سے یہ خاص طور پر کہا تھا کہ ہتھکڑی لگا کر لائے۔ اے ایس آئی کے جانے کے بعد میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل اور ایک کانسٹیبل کو

گامو کی گرفتاری کے لیے بھیجا۔ مجھے گامو پر بڑا غصہ تھا کیونکہ وہ بڑی مکاری سے مجھے چکر دے گیا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد اے ایس آئی امجد کو لے کر آ گیا۔ اس کو ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ اس نے میرے سامنے آتے ہی واویلا شروع کر دیا کہ یہ ظلم ہے کہ ایک تو اس کا بھائی قتل ہو گیا ہے دوسرا اسی کو ہتھکڑی لگا دی گئی ہے۔ میں نے اس کی بکواس سننے کی بجائے اے ایس آئی سے کہا کہ اسے حوالات میں بند کر دے۔ اے ایس آئی اسے گھسیٹ کر وہاں سے لے گیا۔

اس کے بعد ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبل گامو کو بھی لے آئے۔ گامو کی حالت بری ہو رہی تھی۔ ہیڈ کانسٹیبل نے ہتھکڑی کا دوسرا سرا پکڑ رکھا تھا اور موٹے تازے کانسٹیبل نے اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑا ہوا تھا۔ گامو کا ایک ہونٹ پھٹا ہوا تھا اور اس کے چہرے سے اذیت کا اظہار ہو رہا تھا۔ لگتا تھا اس کی اچھی خاصی ٹھکائی کی گئی ہے۔ ایسا میری ہدایت پر ہوا تھا۔

گامو کو میرے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ اس کی ساری بدمعاشی ہوا ہو گئی تھی اور وہ رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''اگر سچ بولو گے تو فائدے میں رہو گے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''بولو، پہلوان کو کس نے قتل کیا ہے؟''

''مجھے کیا معلوم جی!'' اس نے نظریں چرا کر کہا۔ ''میں کیسے بتا سکتا ہوں کہ پہلوان کو کس نے مارا ہے۔''

''وہ تمہارا باپ بھی پکڑا گیا ہے۔'' میں نے اس کے ساتھ پرانا اور آزمودہ داؤ کھیلا اور کہا۔ ''اس نے سب کچھ بک دیا ہے اور وہ تمہارا نام لے رہا ہے۔''

''آپ کس کی بات کر رہے ہیں حضور!'' گامو نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں!''

میں نے کانسٹیبل سے کہا کہ اسے حوالات کا نظارہ کرا کے لائے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ دور سے ہی اسے حوالات میں بند امجد دکھا دے اور کوئی بات کرنے کا موقع نہ دے۔ کانسٹیبل اسے لے گیا اور پھر واپس میرے پاس لے آیا۔

''اب بولو، کہتے ہو؟'' میں نے کہا۔ ''اقبالی بیان دو گے یا......'' میں نے جان بوجھ کر

بات ادھوری چھوڑ دی۔

''قتل میں نے نہیں کیا۔'' گامو نے میرے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''آپ میرا یقین کریں۔''

''پھر کس نے کیا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''وہ تمہارا باپ تمہارا نام لے رہا ہے۔''

''وہ جھوٹ بولتا ہے حضور!'' گامو نے تڑپ کر کہا۔ ''اس نے خود......''

وہ کہتے کہتے رک گیا اور پریشانی سے میری طرف دیکھنے لگا۔

''آگے بولو۔'' میں نے میز پر چھڑی مار کر کہا۔ ''کیوں حرام موت مرنا چاہتے ہو۔''

''اس نے خود پہلوان کو گولی ماری تھی۔'' گامو ایک دم ایسے بولا جیسے پھٹ پڑا ہو۔

وہ کوئی عادی مجرم تو تھا نہیں کہ قتل جیسا جرم ہضم کر لیتا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کی اپنی گردن پھنس رہی ہے تو وہ بول پڑا۔ میں نے اسے اقبالی بیان دینے کے لیے تیار کر لیا۔ اس نے بڑا لمبا بیان دیا جس میں اس نے میرے سوالوں کے جواب میں اس بات کا بھی اعتراف کیا کہ اس کے امجد کی بیوی کے ساتھ غلط قسم کے تعلقات تھے۔ میں یہ بیان آپ کو مختصر کر کے سنا دیتا ہوں کیونکہ اس میں زیادہ تر ان ہی باتوں کی تصدیق کی گئی تھی جو مجھے مقتول پہلوان کے ماموں اور نمبردار کے بیٹے فیاض سے معلوم ہو چکی تھیں۔

گامو اور امجد کی دوستی تھی جو رفتہ رفتہ بڑھ کر راز داری والی دوستی میں بدل گئی۔ امجد کے ہوٹل پر کچھ چھوٹے موٹے جرائم پیشہ لوگوں کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ امجد اور گامو بھی ان میں گھل مل گئے اور بے تکلفی ہو گئی۔ وہاں وہ چھوٹا موٹا نشہ بھی کر لیتے تھے۔ گامو اکثر طوائفوں کے پاس جاتا تھا اور امجد کو بھی کبھی کبھار لے جاتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ گامو کا امجد کے گھر آنا جانا شروع ہو گیا اور اس کے امجد کی بیوی سے ناجائز تعلقات پیدا ہو گئے۔

پہلوان کو یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے امجد کے ساتھ جھگڑا کیا اور گامو کو بھی دھمکی دی کہ وہ امجد کے گھر نہ آیا کرے۔ ایک دن اسی پر بات بڑھ گئی اور پہلوان کلہاڑی لے کر گامو کو مارنے دوڑا۔ پھر کچھ دنوں بعد پہلوان اور امجد کا جھگڑا ہو گیا اور بات ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ پہلوان نے امجد کو اور اس کی بیوی کو بے غیرت کہا اور یہ بھی کہا کہ وہ ان دونوں کو قتل کر دے گا۔

اس سے اگلے دن ہوٹل پر محفل میں امجد نے اپنے دوستوں سے بات کی کہ اس کا چھوٹا

بھائی اس کی جان کا دشمن بن گیا ہے۔ وہ جرائم پیشہ لوگ تھے اور چرس کے نشے میں بھی تھے۔ ان میں سے ایک نے مشورہ دیا کہ اس سے پہلے کہ پہلوان اسے قتل کرے، وہ پہلوان کو صاف کر دے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے قتل کا منصوبہ بن گیا۔ ایک دوست نے کہا کہ اس کے پاس پستول ہے۔ وہ امجد کو لا کر دے گا اور امجد پہلوان کو قتل کر کے اسے واپس کر دے۔ اس کا نام معراج تھا لیکن وہ ماجا کہلاتا تھا۔

اگلے دن ماجے نے امجد کو پستول لا کر دے دیا۔ امجد نے گامو سے بات کی تو وہ اس کا ساتھ دینے پر راضی ہو گیا۔ دونوں نے مل کر قتل کا منصوبہ بنایا اور رات کو پہلوان کے گھر جا پہنچے۔ دیوار کے پاس آ کر گامو نے امجد کو اپنے کندھوں پر بٹھا کر اوپر اٹھایا۔ امجد نے اپنے جوتے اتار دیئے تھے۔ دیوار پر پہنچ کر اس نے گامو کا ہاتھ پکڑ کر اسے اوپر کھینچ لیا۔ گامو دیوار پر بیٹھا رہا اور امجد اندر والی طرف اُتر گیا۔ ان میں یہ طے تھا کہ گامو دیوار پر رہ کر باہر کا خیال رکھے گا۔

امجد اندر چلا گیا پھر تھوڑی دیر بعد دھماکے کی آواز آئی اور اس کے بعد امجد جلدی جلدی آتا نظر آیا۔ گامو نے امجد کو ہاتھ پکڑ کر اوپر کھینچا۔ اسی دوران پہلوان کی بیوی کی آواز سنائی دی جو انہیں للکار رہی تھی۔ مگر وہ دونوں دیوار سے باہر کود گئے۔ امجد نے اپنے جوتے ہاتھ میں پکڑے اور وہ دونوں تیزی سے بھاگنے لگے۔ ذرا آگے جا کر امجد نے جوتے پہن لئے اور وہ دونوں کچے راستے سے نکل کر پکی سڑک پر چڑھ گئے۔ پکی سڑک پر چڑھنے سے پہلے امجد نے چلی ہوئی گولی کا خول نکال کر پھینک دیا اور پستول گامو کو دے دیا۔ گامو پستول اپنے گھر لے گیا اور اگلے دن ماجے کو دے دیا۔

امجد اور گامو ایک لمبا چکر کاٹ کر مخالف سمت سے گاؤں میں داخل ہو گئے۔ پھر امجد شور سن کر پہلوان کے گھر چلا گیا۔ اس کے بعد کے واقعات میں آپ کو شروع میں سنا چکا ہوں۔

گامو نے نئی بات یہ سنائی کہ اس کے بعد انہوں نے نمبردار کے بیٹے فیاض کو بھی قتل کرنا تھا۔ میں نے سارا بیان تحریر کر کے اس پر گامو کا انگوٹھا لگوا لیا۔

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد میں نے گامو کو ایک کمرے میں بند کر دیا اور حوالات سے امجد کو بلوا لیا۔ جب امجد کو میرے پاس لایا گیا تو میں نے گامو کو حوالات میں بند کرا دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ امجد کے بیان دینے سے پہلے وہ دونوں آپس میں کوئی بات کریں۔ میں نے امجد کو کہا کہ وہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو جائے۔ وہ چپ چاپ جا کر دیوار

سے پشت لگا کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ اس طرح اپنی توہین اور تذلیل محسوس کر رہا ہو گا۔ ایسے حربے بے شمار ہوتے ہیں جو پولیس والے مجرموں کو ذہنی اذیت پہنچانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک حربہ ننگی گالیاں بھی ہے۔

''گامو کو تم دیکھ چکے ہو گے۔'' میں نے اس سے کہا۔ ''اس نے سب کچھ بک دیا ہے۔ اگر تم اقبالی بیان دے دو گے تو فائدے میں رہو گے۔ اگر تم اقبالی بیان نہیں دینا چاہتے تو مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میرے پاس موقعہ کا گواہ موجود ہے بولو، بیان دو گے یا نہیں؟''

وہ منہ سے کچھ نہ بولا، سر کو ہاں کے انداز میں ہلایا۔ میں نے اس سے بیان لے لیا جو گامو کے بیان سے مختلف نہیں تھا۔ اس کے بعد آلۂ قتل کی برآمدگی ضروری تھی۔ گامو نے اپنے بیان میں بتایا تھا کہ واردات کے بعد اس نے پستول ماجے کو واپس کر دیا تھا۔ میں نے امجد سے ماجے کا پتہ پوچھا اور اے ایس آئی سے کہا کہ وہ دو کانسٹیبل ساتھ لے کر جائے اور ماجے کو گرفتار کر کے اس کے گھر سے پستول بھی برآمد کر کے لے آئے۔ اے ایس آئی تجربہ کار تھا اور اس قسم کے کاموں کو سمجھتا تھا۔

اس کے بعد میں نے دونوں کے کھُروں کے مولڈ بنوائے۔ امجد کے میں نے ننگے پاؤں والے کھُرے کا مولڈ بھی بنوایا۔ یہ جائے واردات پر پائے جانے والے کھُروں سے مل گئے تھے۔ امجد کے جوتے کے تلوے میں چمڑے کا ٹکڑا لگا ہوا تھا۔ اس نے واردات کے وقت بھی وہی جوتے پہن رکھے تھے۔

اے ایس آئی ماجے کو گرفتار کر کے لے آیا تھا۔ اس کے گھر سے اعشاریہ بتیس کا پستول بھی مل گیا تھا۔ میں نے یہ پستول اور پوسٹ مارٹم رپورٹ میں مقتول کی لاش سے ملنے والی گولی اسلحہ ایکسپرٹ کے پاس بھجوا دی کہ وہ معلوم کرے کہ یہ گولی اسی پستول سے چلائی گئی ہے۔

اس کے بعد میں نے ملزموں کو مجسٹریٹ کے سامنے بیان کے لیے پیش کیا۔ دونوں اپنے بیان پر قائم رہے۔ اس دوران اسلحہ ایکسپرٹ کی رپورٹ بھی آ گئی۔ اس نے لکھا تھا کہ یہ گولی اسی پستول سے چلائی گئی ہے۔ یہ معلوم کرنے کا ایک خاص طریقہ ہوتا ہے۔ پستول یا رائفل وغیرہ کی نالی کے اندر جھریاں سی بنی ہوتی ہیں۔ فائر ہونے کے بعد جب گولی نالی سے نکلتی ہے تو اندر موجود جھریوں کے نشان گولی پر آ جاتے ہیں۔

میں نے کیس تیار کر کے عدالت میں بھیج دیا۔ کیس بڑا مضبوط تھا۔ اس میں، میں نے مقتول کے ماموں، نمبردار کے بیٹے فیاض کے بیانات بھی دلوائے۔ ملزموں کا وکیل کچھ بھی نہ کر سکا۔ جج ایک ہندو تھا۔ مجھے آج بھی اس کا نام یاد ہے۔ اس کا نام لالہ رام لعل بھیل تھا۔ اس نے امجد کو سزائے موت اور اعانت جرم میں گامو کو پانچ سال قید بامشقت سنائی۔ اس کے علاوہ ماجے کو اسلحہ ایکٹ کے تحت ناجائز اسلحہ رکھنے کے جرم میں ایک سال قید بامشقت سنائی۔

دونوں بڑے ملزموں نے اپیل دائر کی جس کے بعد گامو کی سزا کم کر کے تین سال کر دی گئی اور امجد کی سزا جج نے برقرار رکھی

☆======☆======☆

موت، ملاقات اور محبت

وہ بدکار نہیں تھی لیکن اس کے ساتھ بڑا ظلم ہوا تھا اور وہ اپنی دانست میں اس ظلم کا انتقام لے رہی تھی...... لیکن اسے یہ احساس نہیں تھا کہ وہ جس راستے پر چل نکلی ہے اس کا اختتام ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں۔

جس جرم کی کہانی میں سنا رہا ہوں، یہ وہ جرم نہیں جو شہروں میں ہوتے ہیں۔ شہروں میں کار چوری، موٹر سائیکل چوری، بینک ڈکیتی یا فراڈ جیسے جرائم زیادہ ہوتے ہیں جبکہ دیہات میں خاندانی دشمنیاں، دیرینہ عداوت یا غیرت کی خاطر قتل و غارت ہوتی ہے۔ اس دشمنی کی آڑ میں دشمنوں کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کے لیے ایک دوسرے کی کھڑی فصل جلا دی جاتی ہے اور مویشیوں کو زہر بھی دیا جاتا ہے۔ ان احمقانہ کارروائیوں کو مردانگی کا نام دیا جاتا ہے۔

حسبِ سابق میں کسی جگہ کا یا مرد عورت کا اصل نام نہیں لکھوں گا۔ یہ واردات پاکستان بننے کے چند سال بعد کی ہے۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں اُس زمانے کے ایک بڑے مشہور پیر کا نام بھی آتا ہے۔ وہ پیر تو اب زندہ نہیں ہے لیکن اس کی گدی قائم ہے اور پیری مریدی نسل درنسل چلتی آرہی ہے۔ یہ پیر اُس زمانے میں بڑا مشہور تھا اور اس کی شہرت دور دور تک تھی۔ اس کے ہزاروں مرید تھے جو دور دراز علاقوں سے آتے تھے۔

میری تعیناتی اس پیر کے علاقے میں کر دی گئی۔ میرے ساتھیوں اور ملنے جلنے والوں میں جو اس پیر کے معتقد تھے انہوں نے اس تعیناتی پر باقاعدہ مجھے مبارک باد دی تھی اور رشک کا اظہار کیا کہ میں ''سرکار'' کے سائے میں جا رہا ہوں۔ میں چونکہ شروع سے ہی پیری مریدی کا قائل نہیں ہوں اس لیے مجھے ایسی باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

میں نے جب تھانے کا چارج سنبھالا تو معمول کے مطابق وہاں کے چیدہ چیدہ لوگ مجھے سلام کرنے آئے۔ ان میں بعض عادی جرائم پیشہ بھی تھے۔ محرر ہیڈ کانسٹیبل مجھے ہر ایک کے بارے میں بتاتا جا رہا تھا۔ جب سب لوگ چلے گئے تو محرر نے مجھے مشورہ دیا کہ مجھے پیر صاحب کی خدمت میں حاضری دینی چاہیے۔ میں نے اس کو ٹالنا چاہا مگر یہ پختہ عمر محرر بڑا تجربہ کار اور جہاندیدہ تھا۔ اس نے یہ کہہ کر مجھے قائل کر لیا کہ جہاں معزز اور پڑھے لکھے لوگ اس

کے حلقے میں شامل ہیں، وہاں جرائم پیشہ افراد بھی اس پیر کے ہاتھ میں ہیں۔

اس کے بعد میں نے اس پیر سے ملاقات کا ارادہ کر لیا اور اگلے دن وردی کے بغیر سادہ کپڑوں میں پیر سے ملاقات کو چل پڑا۔ محرر نے میری آمد کی اطلاع پیر صاحب کے کارندوں تک پہنچا دی تھی۔ نمبردار کو پتہ چلا تو وہ اور کچھ معززین دوڑے آئے اور میرے ساتھ چل پڑے۔ یوں میں ایک چھوٹے سے جلوس کی صورت میں وہاں پہنچا۔ پہلے میں نے پیر کے آستانے سے متصل مزار پر فاتحہ پڑھی۔ وہاں عقیدت مندوں نے سینکڑوں دیے جلا رکھے تھے اور پھولوں سے قبر کو لاد رکھا تھا۔ سبز رنگ کی بے شمار چادریں جن پر کلمۂ طیبہ، آیت الکرسی وغیرہ لکھی ہوئی تھی، لوگوں نے مزار پر چڑھا رکھی تھیں۔ نقد نذر نیاز کے لیے لوہے کے بکس رکھے ہوئے تھے جن میں لوگ نذرانے ڈالتے تھے۔

دو تین فٹ بلند ایک چبوترا بنا ہوا تھا۔ اس پر ایک ادھیڑ عمر مگر صحت مند آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ سرخ و سفید رنگ، سلیقے سے تراشی ہوئی داڑھی، کندھوں تک لٹکتے بال جن میں تیل لگا کر کنگھی کی گئی تھی۔ اس نے سبز رنگ کا چغہ اور سبز رنگ کی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ ایک ہاتھ میں صندل کی لکڑی سے بنی ہوئی تسبیح اور گلے میں موٹے موٹے دانوں والی مالائیں۔ یہ تھے پیر صاحب۔

میں نے قریب جا کر السلام علیکم کہا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ مجبوراً پیر صاحب نے بھی بیٹھے بیٹھے ہاتھ آگے بڑھایا اور گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ میں نے مصافحے کے بعد نرمی سے ہاتھ چھڑانا چاہا مگر پیر صاحب نے میرا ہاتھ کھینچ کر بے تکلفی سے مجھے اپنے ساتھ چبوترے پر بٹھا لیا۔ اس کے بعد نمبردار اور دوسرے معززین نے رکوع کی حالت میں جھک کر سلام کیا تو پیر صاحب نے اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ سب نے باری باری ہاتھ کو بوسہ دیا اور پھر آنکھوں سے لگایا۔ اس دوران میں نے دیکھا کہ جو بھی شخص اندر آتا، رکوع کی حالت میں سلام کرتا اور جب واپس جاتا تو اُلٹے قدموں جاتا کہ کہیں پیر صاحب کی بے ادبی نہ ہو جائے۔

میرے لیے یہ سب کچھ بڑا اذیت ناک اور ناقابلِ برداشت تھا۔ میں ایسے کئی پیروں کے پول کھول چکا ہوں جو انسان اور اللہ کے درمیان رکاوٹ بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح یہ سب برداشت کرتا رہا۔ اس کے بعد پیر صاحب نے ایک خاص مرید کو اشارہ کیا تو اس نے بڑے ادب سے ایک سبز رنگ کی ویسی ہی چادر جیسی مزار پر چڑھائی جاتی ہیں، پیر صاحب کو پیش کی۔ پیر صاحب نے اس چادر سے میری دستار بندی کی۔ اس کے بعد میری پیٹھ پر تین بار تھپکی دی۔

''تم اب میرے سائے میں آ گئے ہو تھانیدار!'' پیر صاحب نے تھپکیاں دینے کے بعد کہا۔ ''کوئی مجرم تمہاری آنکھوں سے نہیں بچ سکے گا...... ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ تم ترقی کرو گے اور یہاں سے ڈی ایس پی بن کر نکلو گے۔''

اس کے بعد پیر صاحب نے کچھ اور باتیں کیں۔ میں نے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو پیر صاحب نے کہا کہ میں آتا جاتا رہوں۔ دوسرے لفظوں میں وہ مجھے یہ کہہ رہا تھا کہ اس نے مجھے اپنا مرید بنا لیا ہے اور اب میرا فرض ہے کہ میں گاہے گاہے حاضری دیتا رہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں سرکاری ملازم ہوں اور اپنے فرائض کی ادائیگی کی وجہ سے میرے پاس اتنا وقت نہیں نکل سکے گا۔

''سرکار کو خوش رکھو گے یا ہمیں؟'' پیر صاحب نے رعونت سے کہا۔

''دونوں میں سے کسی کو بھی نہیں۔'' میں نے سپاٹ انداز میں کہا۔ ''میں صرف اللہ کی خوشنودی چاہتا ہوں اور سرکار مجھے جس کام کی تنخواہ دیتی ہے، میں وہ کام ایمانداری سے کرتا ہوں۔''

اس کے بعد میں وہاں سے آ گیا۔ سر پر بندھی ہوئی سبز چادر پر اگر کلمہ نہ لکھا ہوتا تو میں نے اتار کر پھینک دینی تھی۔ میں نے وہ چادر یونہی اپنے پاس کھڑے کسی آدمی کو تھما دی تو وہ آدمی یوں خوش ہوا جیسے اسے کوئی خزانہ مل گیا ہو۔

اس مزار کے بارے میں مشہور تھا کہ یہاں کوئی سات جمعرات تک چراغ جلائے تو اس کی جو بھی حاجت ہو وہ پوری ہو جاتی ہے۔ لوگ دور دراز کے علاقوں سے آتے اور منتیں مانتے۔ ان میں دیہاتی زیادہ ہوتے لیکن پڑھے لکھے اور شہری حضرات بھی خاصی تعداد میں آتے تھے۔ اس علاقے میں ہر وقت رونق سی لگی رہتی تھی۔ لوگ اللہ کے بعد پیر صاحب کو مانتے تھے۔

مختصر یہ کہ میں اس کے بعد پیر صاحب کے ''درشن'' کو نہ گیا۔

حرام موت

ایک روز صبح سویرے تھانے اطلاع آئی کہ گاؤں کی جنوبی سمت ایک کھڈ میں کسی آدمی کی لاش پڑی ہے۔ مجھے اطلاع ملی تو میں فوراً تیار ہو کر تھانے پہنچ گیا۔ اطلاع نمبردار خود لے کر آیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک دیہاتی تھا۔ اس کے بارے میں بتایا گیا کہ لاش اس نے دیکھی ہے۔ میں نے اس دیہاتی سے کچھ باتیں پوچھیں اور یہ یقین کر لینے کے بعد کہ اس آدمی نے

انسانی لاش ہی دیکھی ہے، دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر موقعۂ واردات کی طرف چل پڑا۔

گاؤں کی جنوبی سمت کچھ زمین اونچی نیچی تھی اور قابل کاشت بھی نہیں تھی۔ اس طرف کم ہی لوگ آتے جاتے تھے۔ عام طور پر گاؤں کے لوگ رفع حاجت کے لیے کھیتوں کا رخ کرتے تھے۔ کبھی کبھار کوئی آدمی رفع حاجت کے لیے ان کھڈوں کا رخ بھی کر لیتا تھا۔ یہ دیہاتی جس نے لاش دیکھی تھی، رفع حاجت کی نیت سے اس طرف جا نکلا تھا۔ ابھی وہ کھڈ کے اندر نہیں اُترا تھا کہ اوپر سے اس کی نظر لاش پر پڑی۔ اس نے ذرا غور سے دیکھا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ کھڈ میں پڑا ہوا آدمی زندہ نہیں ہے تو وہ سیدھا نمبردار کے گھر گیا اور اسے لاش کے بارے میں بتایا، نمبردار اسے لے کر تھانے آ گیا۔

وہ آدمی ہمیں اس جگہ لے گیا جہاں سے اسے لاش نظر آئی تھی۔ میں نے دیکھا، پندرہ سولہ فٹ گہرائی میں ایک آدمی کی لاش پیٹ کے بل پڑی تھی۔ اس نے سلیٹی رنگ کی قمیص اور سفید شلوار پہن رکھی تھی۔ ایک طرف نیچے اُترنے کے لیے ڈھلوان سی بنی ہوئی تھی۔ میں وہاں سے نیچے اُتر کر لاش کے پاس چلا گیا۔ لاش کی پشت اوپر تھی اور قمیص خون آلود نظر آ رہی تھی۔ میں نے قریب بیٹھ کر غور سے دیکھا۔ لاش کے شولڈر بلیڈ کے قریب ایک گہرا زخم صاف نظر آ رہا تھا۔ میرا تجربہ یہ کہتا تھا کہ یہ کلہاڑی کا زخم ہے۔

لاش سے چند گز پرے ایک جوتی اُلٹی پڑی ہوئی تھی اور چند رنگین چوڑیوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ میں نے چوڑیوں کے ٹکڑے اکٹھے کر کے اپنے رومال میں لپیٹ کر جیب میں ڈال لئے۔ جوتی زنانہ تھی اور بائیں پاؤں کی تھی۔ یہ چمڑے کی بنی ہوئی تھی اور اس پر تلے کی تاروں سے بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ ایسی جوتیاں دیہات میں عام استعمال ہوتی ہیں اور انہیں کھسہ بھی کہا جاتا ہے۔ جوتی کی حالت بتا رہی تھی کہ زیادہ پرانی نہیں ہے اور چند ماہ پہلے بنوائی گئی ہے۔

چوڑیوں کے ٹکڑے اور زنانہ جوتی جائے واردات پر عورت کی موجودگی کو ثابت کر رہے تھے اور یہ بھی کہ قتل کا باعث عورت ہی ہے۔ میں نے ارد گرد کھُروں کا بڑی باریک بینی سے مشاہدہ کیا۔ وہاں کھُرے آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہاں اچھی خاصی دھینگا مشتی ہوئی ہے۔ کچھ کھُرے صاف تھے۔ مقتول کے پاؤں میں پشاوری چپل تھی اور اس کے کھُرے الگ صاف پہچانے جا سکتے تھے۔ دوسرا کھُرا زنانہ جوتی کا تھا۔ ان دونوں کھُروں کے علاوہ بھی ایک مردانہ جوتے کا کھُرا تھا۔ یہ قاتل کا کھُرا تھا۔ یہ کھُرا ایسا ہی تھا جیسا

دیہات میں لوگ عام طور پر جوتے استعمال کرتے ہیں اور اس میں کوئی خاص بات بھی نہیں تھی جو اسے دوسروں سے الگ کرتی۔ بہر حال میں نے اس کو ذہن میں محفوظ کر لیا۔

اس کے بعد میں نے نمبر دار، اطلاع لانے آدمی اور دونوں کانسٹیبلوں کو اپنے پاس بلا لیا۔ میں نے اطلاع لے کر آنے والے آدمی سے کہا کہ وہ گاؤں سے دو تین معززین کو بلا لائے۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کانسٹیبلوں سے کہا کہ وہ لاش کو پشت کے بل کر دیں۔ پشت کا زخم ایسا نہیں تھا کہ موت کا باعث بن سکتا۔ مجھے یقین تھا کہ لاش کے سینے اور پیٹ پر خاصے کاری زخم ہوں گے۔

لاش کو سیدھا کیا گیا تو میرے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ لاش کے سامنے والے حصے میں گردن پر ہنسلی کی ہڈی کے نزدیک کلہاڑی کا گہرا زخم نظر آ رہا تھا اور خاصی گردن بھی کٹ گئی تھی۔ خون بہہ بہہ کر جم گیا تھا۔ ایک زخم سینے پر بائیں طرف پسلیوں پر تھا یقیناً ایک دو پسلیاں کٹ گئی ہوں گی۔ اس کے علاوہ کلہاڑی کے وار کا ایک زخم مقتول کے بائیں بازو پر کہنی سے ذرا ادھر لگا تھا۔ یہ زخم اس وقت لگا ہوگا جب مقتول نے کلہاڑی کا پہلا وار روکنے کے لیے بایاں بازو آگے کیا ہوگا۔ موت کا باعث گردن پر لگنے والا گہرا زخم بنا ہوگا۔

مقتول کی عمر تیس بتیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ گورے چٹے رنگ اور دبلے پتلے جسم کا مالک تھا۔ اس کا چہرہ مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ خوبصورت جوان تھا لیکن کسی کی بہن یا بیوی سے ناجائز تعلقات کی وجہ سے حرام موت مارا گیا تھا۔

میں نے نمبر دار کو آگے آ کر لاش شناخت کرنے کو کہا۔ اس نے قریب آ کر لاش کا چہرہ دیکھا اور فوراً پہچان لیا۔

''یہ تو جیلا ہے۔'' نمبر دار نے فوراً کہا۔

''جیلا کون؟'' میں نے نمبر دار سے پوچھا۔

''اس کا اصل نام جمیل ہے۔'' نمبر دار نے کہا۔ ''لوگ اسے جیلا کہتے ہیں۔ چھوٹے موٹے جرائم کرتا تھا اور ایک بار چھ ماہ جیل میں سزا بھی کاٹ چکا ہے۔''

جیلا کے بارے میں مجھے مزید معلومات تھانے کے ریکارڈ سے مل سکتی تھیں، اس لیے میں نے نمبر دار سے مزید کچھ نہ پوچھا۔ اتنے میں وہ آدمی جسے میں نے گاؤں سے معززین کو لانے کے لیے بھیجا تھا، دو آدمیوں کو ساتھ لے کر آ گیا۔ میں نے موقعہ پر جو کاغذی کارروائی کرنی تھی، وہ کی۔ نقشہ صورتِ حال مرتب کیا اور قانونی طور پر لاش کو اپنے قبضے میں لے لیا۔

اس کے بعد میں نے نمبر دار کی مدد سے لاش کو ایک کانسٹیبل کے ساتھ پوسٹ مارٹم کے لیے قریبی شہر کے سرکاری ہسپتال بھجوا دیا جو وہاں سے پچیس چھبیس میل دور تھا۔

اس کے بعد میں وہاں سے واپس تھانے میں آ گیا۔

تلے والی جوتی اور چُوڑیاں

تھانے میں آ کر میں نے اس کیس کی فائل تیار کی اور چھوٹی سے چھوٹی بات نوٹ کر لی۔ اس کے بعد میں نے اے ایس آئی کو بلا کر اس کیس کے متعلق بتایا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ مقتول کا نام جیلا ہے اور وہ سزا یافتہ بھی ہے۔ میں نے اے ایس آئی سے کہا کہ وہ جیلا کا ریکارڈ نکال کر مجھے اس کے بارے میں تفصیل سے بتائے۔

اے ایس آئی اس کے متعلق پہلے سے ہی جانتا تھا۔ اس نے جیلا کا ریکارڈ تلاش کر کے مجھے جو کچھ بتایا اس کے مطابق جیلا میرے تھانے کے علاقے کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کے ماں باپ مر چکے تھے اور کوئی آگے پیچھے نہیں تھا۔ ڈیڑھ دو سال پہلے اس گاؤں میں آ گیا تھا اور مزار کے ارد گرد گھومتا رہتا تھا۔ وہیں لنگر سے روٹی لے کر کھا لیتا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا اٹھنا بیٹھنا جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ ہو گیا اور چھوٹی موٹی چوری چکاری یا جیب تراشی کی وارداتیں کرنے لگا۔ ایک دو مرتبہ لڑائی جھگڑے میں زخمی بھی ہوا۔ پھر ایک بھینس چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا اور چھ ماہ کی سزا کاٹ کر آیا تھا۔

میں نے سوچا ضرور جیلا نے گاؤں کی کسی لڑکی کے ساتھ دوستی گانٹھ لی ہوگی اور چوری چھپے اس سے ملتا ہوگا۔ کسی طرح لڑکی کے باپ یا بھائی کو اس کے ناجائز تعلقات کا علم ہو گیا اور وہ موقعے کی تلاش میں رہے۔ رات کو اس نے موقعہ پر دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا اور جیلا کو موقعے پر ہی مار ڈالا جبکہ لڑکی جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔

یہ سب مفروضہ تھا۔ ضروری نہیں کہ ایسا ہی ہوا ہو جیسا میں نے سوچا تھا۔ میرے اندازے غلط بھی ہو سکتے تھے۔ یہ بات بڑی اہم تھی کہ قاتل نے اگر غیرت کے جوش میں یہ قتل کیا ہے تو پھر اس نے لڑکی کو کیوں چھوڑ دیا۔ یہ سوچا جا سکتا تھا کہ لڑکی اس وقت موقع ملنے پر بھاگ گئی جب قاتل جیلا کو مار رہا تھا۔ اب سوال پیدا ہوتا تھا کہ کیا قاتل نے گھر پہنچنے کے بعد لڑکی کو چھوڑ دیا ہوگا یا لڑکی کو بھی مار دیا ہوگا؟

اگر لڑکی بھی مر گئی تھی تو پھر اس قتل کا سراغ لگانا تقریباً ناممکن ہی تھا۔ ایک لحاظ سے یہ ایک

اندھا قتل تھا۔ صرف جائے واردات پر موجود لڑکی جانتی تھی کہ قاتل کون ہے۔ اس طرح میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میرا اس لڑکی تک پہنچنا بہت ضروری ہے اور اس لڑکی تک پہنچنے کے لیے میرے پاس اس کی جوتی کا ایک پاؤں اور چوڑیوں کے چند ٹکڑے تھے۔

مجھے یہ کام خاصا مشکل نظر آ رہا تھا۔ میں یہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ گاؤں کی ہر لڑکی کو بلا کر پوچھ گچھ کرتا اور ان کی جوتیاں اور چوڑیاں چیک کرتا۔ بہت سوچ سوچ کر آخر میں نے مخبروں کو استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے تمام مخبروں کو بلا کر جوتی کا بایاں پاؤں اور چوڑیوں کے ٹکڑے دکھا کر سمجھایا کہ انہوں نے کیا کرنا ہے۔ مخبروں میں دو ایسی عورتیں بھی تھیں جو لوگوں کے گھروں میں صفائی ستھرائی اور برتن مانجھنے کا کام کرتی تھیں۔ ان کو میں نے خاص طور پر کہا کہ وہ ہر گھر پر نظر رکھیں۔

مرد مخبروں نے اپنی عورتوں کو بھی اس کام پر لگا دیا کہ وہ جوتی اور چوڑیوں والی کا سراغ لگائیں۔ مختصر یہ کہ میں نے ایسا انتظام کر دیا کہ پورے علاقے میں مخبر عورتوں اور مردوں کو پھیلا دیا۔

شام تک پوسٹ مارٹم رپورٹ آ گئی۔ اس میں موت کا باعث زیادہ خون بہہ جانا لکھا گیا تھا۔ زخموں کی تفصیل وہی لکھی تھی جو میں پہلے بتا چکا ہوں۔ اس میں صرف یہ اضافہ تھا کہ زخموں کی گہرائی اور سائز بھی لکھا گیا تھا۔ موت کا وقت اندازاً رات دس بجے کے بعد کا لکھا گیا تھا۔ مقتول کے معدے میں نیم ہضم شدہ خوراک پائی گئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مقتول نے رات کا کھانا آٹھ بجے کے قریب کھایا ہوگا۔

چونکہ مقتول جیلا لاوارث تھا، اس لیے میں نے ضروری کارروائی کے بعد لاش کو لاوارث قرار دے کر دفن کرا دیا۔

اب مجھے بڑی بے چینی سے مخبروں کی طرف سے کسی خبر کا انتظار تھا۔

عورتوں کا شکاری

اس دوران میں نے مقتول جیلا کے قریبی دوستوں کو بھی تھانے میں بلا کر پوچھ گچھ کی۔ یہ دو آدمی تھے جن کا مقتول کے ساتھ زیادہ اٹھنا بیٹھنا تھا۔ یہ دونوں بھی جواری اور بھنگ چرس کے عادی تھے۔ تھانے بلائے جانے پر وہ بہت خوفزدہ نظر آ رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایسے لوگوں سے پولیس والوں کا سلوک کچھ اچھا نہیں ہوتا۔ پہلے چھوٹا عملہ ننگی گالیوں سے ان کا

استقبال کرتا ہے اور پھر ایک آدھ گھونسہ، تھپڑ یا چھتر ہر کوئی کارِ ثواب سمجھ کر مارتا ہے۔ میں نے دونوں کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ وہ اس عزت افزائی پر خاصے حیران نظر آ رہے تھے کہ تھانیدار نے ان کو کرسیوں پر بٹھایا ہے۔

''دیکھو، جیلا تمہارا دوست تھا۔'' میں نے ان سے کہا۔ ''اسے کسی نے قتل کر دیا ہے۔ میں تمہارے دوست کے قاتل کو پکڑ کر پھانسی پر لٹکانا چاہتا ہوں اور اس کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

''آپ حکم کریں ملک صاحب!'' ایک نے بڑے فدویانہ انداز میں سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

''وہ کسی عورت کے چکر میں قتل ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تمہاری اس کی یاری تھی۔ اس نے ضرور تمہیں بتایا ہوگا کہ اس کی کسی عورت کے ساتھ دوستی ہے اور وہ اس سے ملنے جاتا ہے۔''

''ہاں جی!'' دوسرے نے کہا۔ ''وہ اکثر بتایا کرتا تھا کہ ایک عورت اس کے ساتھ پھنس گئی ہے اور وہ اس سے چوری چھپے ملتا ہے۔''

''پھر تم یہ بھی جانتے ہوگے کہ وہ کس سے ملنے جاتا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں ملک صاحب!'' پہلے نے کہا۔ ''وہ بڑا گھنہ (گہرا) تھا جی، اس نے ہمارے بڑے اصرار کے باوجود بھی اس عورت کے متعلق نہیں بتایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہماری وجہ سے بات پھیل جائے گی اور اس کی دوستی بھی ختم ہو جائے گی۔''

''ویسے وہ بڑا چرب زبان آدمی تھا جی!'' دوسرے نے کہا۔ ''عورتوں سے دوستیاں لگانے کا شوقین تھا اور انہیں شیشے میں اتارنے کا فن جانتا تھا...... میں نے تو اسے کئی بار کہا تھا کہ وہ ضرور کسی دن عورت کے چکر میں مارا جائے گا۔ دیکھ لیں، ایسا ہی ہوا ہے۔''

ان کا جواب سن کر مجھے جو تھوڑی بہت اُمید بندھی تھی کہ جائے واردات پر موجود عورت کا سراغ مل جائے گا، وہ بھی ختم ہو گئی۔ میں اب تنکوں کے سہارے ڈھونڈنے لگا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے اس کی کسی کے ساتھ دشمنی ہو اور مخالف نے موقع دیکھ کر اس کو پکڑ کر قتل کر دیا ہو۔ میں نے جیلا کے دوستوں سے پوچھا کہ اس کی کسی کے ساتھ دشمنی تو نہیں تھی یا گزشتہ دنوں کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا ہوا ہو۔ دونوں نے ایک جیسا جواب دیا کہ وہ لڑنے بھڑنے والا آدمی نہیں تھا اور لڑائی سے بھاگتا تھا۔

''اس کا آگے پیچھے تو کوئی تھا نہیں۔'' ایک نے کہا۔ ''جوئے اور چوری چکاری سے جو

کماتا، وہ عورتوں کو کھلاتا یا خود ہی عیش کرتا تھا۔''

ان دونوں آدمیوں سے میں نے بہت سے سوال پوچھے لیکن مجھے کچھ حاصل نہ ہوا۔ یہ قتل میرے لیے دردِ سر بن گیا تھا۔ قتل کو دو دن گزر گئے تھے اور میں ابھی تک تفتیش کے لیے کوئی لائن نہیں اختیار کر سکا تھا۔ میں نے چوکیدار کو بھی بلا کر اس سے پوچھ گچھ کی تھی لیکن وہ بھی کچھ نہ بتا سکا تھا۔ اب میری تفتیش کا دارومدار مخبروں کی کارگزاری پر تھا اور کوئی مخبر ابھی تک کام کی اطلاع لے کر نہیں آیا تھا۔

یہ قتل کے بعد تیسرے دن کی بات ہے۔ آدھا دن گزر چکا تھا۔ جیلا کے قتل کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ اس دوران میں دوسرے کیس بھی نپٹا رہا تھا مگر میرا ذہن بار بار اسی لڑکی کی طرف جا رہا تھا کہ وہ کون ہو سکتی ہے۔ میں اس امکان پر بھی سوچنے لگا تھا کہ ہو سکتا ہے جائے واردات سے بھاگ جانے والی لڑکی کا تعلق اس گاؤں سے نہ ہو بلکہ وہ کسی قریبی گاؤں سے آئی ہو۔

میرا ذہن اس بات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ کسی لڑکی کا اتنی دور رات کے اندھیرے میں ویران جگہ پر آ کر کسی مرد سے ملنا ممکن نہ تھا۔ ہاں، مرد کے لیے یہ کام مشکل نہیں کہ وہ کسی لڑکی سے ملنے کے لیے دور تک چلا جائے۔

میں ابھی اسی ادھیڑ بُن میں تھا کہ ایک مخبر عورت میرے پاس آ گئی۔ اس کا چہرہ کسی اندرونی جوش سے دمک رہا تھا۔ یہ تقریباً پینتیس چھتیس سال کی عورت تھی۔ اس کا خاوند پکا جواریا تھا اور بھنگ باقاعدگی سے پیتا تھا۔ اگر کبھی جوئے میں جیت جاتا تو بیوی کو عیش کرا دیتا ورنہ اس کی جان کو آیا رہتا اور اس سے پیسے مانگتا رہتا تھا۔ شوہر کی حرکتوں سے تنگ آ کر اس نے خوشحال گھروں میں جھاڑو اور برتن مانجھنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ عورتوں کی مٹھی چاپی بھی کر دیتی تھی اور عورتیں خوش ہو کر اسے کچھ نہ کچھ دے دیتی تھیں۔ اس طرح اچھے خاصے پیسے کما لیتی تھی۔ اس کا نام رانی تھا۔

اس کے چہرے پر نظر آنے والے جوش و خروش کو دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی کام کی بات معلوم کر کے آئی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا خبر لائی ہے؟

''آج تو آپ سے انعام لوں گی تھانیدار جی!'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''فضول باتیں نہ کرو اور کام کی بات کرو۔'' میں نے سرد مہری سے کہا۔ ''اگر انعام والا کام ہوا تو انعام بھی ملے گا۔''

رانی نے اپنے بدن پر لپٹی ہوئی چادر کے پلو کو سامنے کیا جو اس کی پشت کی طرف جھول رہا تھا۔ میں نے دیکھا اس میں کوئی چیز بندھی ہوئی تھی۔ اس نے وہ چیز کھول کر میری میز پر رکھ دی۔ یہ زنانہ جوتی کا دایاں پاؤں تھا۔

''دیکھ لیں، وہی ہے۔'' رانی نے کہا۔

میں نے پہلی نظر میں ہی دیکھ لیا تھا کہ یہ بالکل ویسی ہی جوتی ہے جیسی جائے واردات سے ملی تھی۔ میں نے رانی کی بات کا کوئی جواب دیئے بغیر بڑی تیزی سے اٹھ کر الماری سے جائے واردات سے ملنے والا جوتی کا بایاں پاؤں نکالا اور میز پر پڑے ہوئے دائیں پاؤں کے ساتھ رکھ دیا۔ جوتی کا جوڑا مکمل ہو گیا تھا۔ دونوں جوتیوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ سائز اور ڈیزائن بالکل ایک ہی تھا۔ اس بات میں کوئی شک نہ رہا کہ رانی جو جوتی کا دایاں پاؤں لے کر آئی ہے وہ جائے واردات پر پائی جانے والی بائیں جوتی کا حصہ ہی ہے۔

''یہ جوتی تمہیں کہاں سے ملی ہے؟'' میں نے رانی سے پوچھا۔

''کوڑے کے ڈھیر سے!'' رانی نے کہا۔

میں نے رانی سے کہا کہ وہ پوری بات تفصیل سے سنائے۔ رانی نے مجھے جو بات سنائی وہ میں آپ کو مختصراً سنا دیتا ہوں۔ گاؤں کے ایک طرف ایک بڑا پرانا جوہڑ بنا ہوا تھا جس میں اکثر گاؤں والوں کی بھینسیں بیٹھی رہتی تھیں اور بطخیں اپنی خوراک تلاش کرتی تھیں۔ اس کے جوہڑ کے کنارے کوڑے کرکٹ کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ یہاں سارے گاؤں والے کوڑا پھینکتے تھے۔

رانی اس دن وہاں کوڑا پھینکنے گئی تو اسے کوڑے کے ڈھیر پر یہ جوتی پڑی نظر آ گئی۔ اسے چونکہ پہلے ہی قتل کی واردات کا علم تھا اور جوتی کا سراغ لگانے کے لیے کہا گیا تھا اور اسے اس جوتی کی تلاش تھی۔ اس نے فوراً جوتی اٹھا لی۔ جوتی تو مل گئی تھی لیکن جوتی والی کا سراغ لگانا ضروری تھا ورنہ جوتی بیکار تھی۔ جوتی نے خود تو نہیں بتانا تھا کہ وہ کس کی ملکیت ہے۔ یہ سراغ رسانی رانی نے خود کرنی تھی۔

رانی ذہین اور جہاندیدہ تھی اور استادی چکر کھیلنا جانتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ دو تین غریب عورتیں لوگوں کے گھروں میں کام کرتی ہیں۔ اس نے جوتی کو چادر کے پلو میں باندھ لیا اور باری باری ان عورتوں سے ملنے کا پروگرام بنا لیا۔ اتفاق کی بات کہ دوسری عورت نے اس کا مسئلہ حل کر دیا۔

رانی نے اسے جوتی دکھا کر کہا۔ ''دیکھو، کیسی نئی جوتی کا ایک پیر کوڑے کے ڈھیر سے ملا

ہے۔شاید دوسرا بھی مل جائے......تم بھی خیال رکھنا شاید......''

''دوسرے پاؤں کو بھول جاؤ۔'' اس عورت نے کہا۔''یہ میں نے اپنے ہاتھوں سے کوڑے میں پھینکا تھا۔''

اس عورت نے رانی کو بتایا کہ وہ چوہدری جہانگیر کے گھر کام کاج کرتی ہے۔کل اس کی بیوی تاجی نے کہا کہ یہ جوتی کوڑے میں پھینک دو۔اس عورت نے کہا کہ کتنی خوبصورت اور نئی جوتی ہے، اس کا دوسرا پاؤں ہو تو مجھے دے دیں تو اس کے جواب میں تاجی نے اسے بتایا کہ دوسرا پاؤں نہیں ہے۔اس کی بڑی بہن یہ جوتی مانگ کر لے گئی تھی اس نے کسی دوسرے شہر شادی پر جانا تھا۔وہاں اس سے بایاں پاؤں گم ہو گیا، اس لیے اب یہ ایک پاؤں بالکل بیکار ہے۔اس عورت نے جوتی کا یہ پاؤں کوڑے میں پھینک دیا جہاں سے یہ رانی کو مل گیا۔

اس کے بعد رانی یہ جوتی لے کر میرے پاس آ گئی تھی۔ میں نے رانی سے کچھ اور باتیں پوچھیں اور پھر اس سے کہا کہ وہ تاجی کے گھر کام کرنے والی عورت کو میرے پاس لے کر آئے۔ میں نے اسے یہ بھی کہا کہ راز داری کا خاص خیال رکھے اور خاص طور پر یہ بات تاجی کو معلوم نہ ہونے دے۔

اس کے بعد میں نے رانی کو کچھ روپے انعام کے طور پر دیئے تو وہ خوش ہو گئی۔

ٹی بی کا مارا خاوند

رانی نے میرے لیے اس اُلجھے ہوئے کیس کو حل کرنے کے راستے کھول دیئے تھے اور مجھے پوری اُمید ہو گئی تھی کہ تاجی کے ذریعے میں قاتل تک پہنچ جاؤں گا۔اب یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ تاجی ہی وہ عورت تھی جو قتل کے وقت مقتول جیلا کے ساتھ کھڈ میں موجود تھی اور یہ قتل اس کے سامنے ہوا تھا۔

اس دوران کئی بار میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ قاتل کو بھی علم ہے کہ ایک عورت اس قتل کی عینی شاہد ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ اس کو بھی قتل کرنے کی کوشش کرے لیکن میرا یہ خیال غلط نکلا تھا اور کسی عورت یا لڑکی کے قتل کا واقعہ نہیں ہوا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد رانی اس عورت کو اپنے ساتھ لے کر تھانے آ گئی جو تاجی کے گھر کام کرتی تھی۔ میں نے اسے اپنے پاس بٹھالیا اور رانی کو باہر جانے کو کہا۔وہ عورت جواں سال تھی اور خاصی گھبرائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔رانی کے باہر جانے پر وہ مزید گھبرا گئی۔ میں نے اسے

تسلی دلاسہ دیا کہ وہ بالکل نہ گھبرائے، اس سے چند باتیں پوچھنی ہیں۔

میں نے اس کے دل سے پولیس اور تھانے کا ڈر نکال دیا اور جب وہ بولنے پر آمادہ ہو گئی تو میں اس سے تاجی اور اس کے گھر کے متعلق سوال پوچھنے لگا۔وہ میرے سوالوں کے جواب دیتی گئی۔

اس سے مجھے تاجی کے متعلق جو معلومات حاصل ہوئیں وہ کچھ اس طرح تھیں کہ تاجی کی شادی کو تین چار سال ہوئے تھے اور اس کا کوئی بچہ نہیں تھا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا خاوند اکثر بیمار رہتا تھا۔وہ ٹی بی کا مریض تھا۔تاجی کی شادی کچھ دھوکے فریب اور کچھ برادری سسٹم کی وجہ سے ایک ٹی بی کے مریض سے کر دی گئی تھی۔اس کے خاوند کے حصے میں باپ کی جائیداد میں سے خاصی زرعی زمین اور مویشی وغیرہ آئے تھے، اس لیے یہ خوشحال لوگ تھے۔گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔

''کیا تاجی اس گھر میں خوش ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جس کا گھر والا ناکارہ ہو، اس نے کیا خوش ہونا ہے جی!'' اس عورت نے کہا۔''عورت دال چٹنی کھا کر خوش رہ سکتی ہے مگر خاوند کی محبت کے بغیر خوش نہیں رہ سکتی۔''

میں سمجھ گیا کہ اس کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تاجی کا خاوند جسمانی لحاظ سے ناکارہ تھا اور اس قابل نہیں تھا کہ اس کی شادی کی جاتی۔اگر ان حالات میں تاجی نے کسی سے دوستی لگا لی تھی تو یہ کوئی حیران کن بات نہیں تھی۔تاجی اگرچہ گناہگار تھی لیکن تاجی سے زیادہ وہ لوگ گناہگار تھے جنہوں نے اسے اس جہنم میں دھکیلا تھا۔

''سنا ہے تاجی کا چال چلن ٹھیک نہیں ہے۔'' میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔''وہ راتوں کو چھپ چھپ کر کسی سے ملتی ہے۔''

''سنا تو میں نے بھی ہے۔'' اس عورت نے کہا۔''لوگ کہتے ہیں کہ اس کا چال چلن ٹھیک نہیں ہے لیکن جب تک آنکھوں سے نہ دیکھو، کسی پر الزام نہیں لگانا چاہئے۔ میں اس گھر کا نمک کھاتی ہوں اور میں لوگوں کی باتوں میں آ کر نمک حرامی نہیں کروں گی کہ یوں ہی انہیں بدنام کرتی پھروں۔''

میں نے اس عورت سے بہت گھما پھرا کر سوال کیئے اور اس سے یہ اگلوانے کی کوشش کی کہ تاجی فلاں آدمی سے ملتی ملاتی ہے لیکن اس نے ایسا کوئی اشارہ نہ دیا۔ میں نے اسے یہ کہہ کر جانے کی اجازت دے دی کہ وہ کسی کو نہ بتائے کہ اسے تھانے بلایا گیا تھا۔

وہ چلی گئی تو میں نے ایک کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ وہ رانی کو میرے پاس بھیج دے۔ تھوڑی دیر بعد رانی میرے پاس آ گئی۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ کسی کانسٹیبل کو بھیج کر تاجی کو تھانے بلالوں مگر پھر میں نے رازداری کے خیال سے یہ کام رانی کے سپرد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے رانی کو بتایا کہ وہ تاجی کو اپنے ساتھ لے کر تھانے آ جائے۔ میں نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اگر تاجی نہ آئی تو میں اسے کانسٹیبل بھیج کر بھی تھانے بلوا سکتا ہوں۔

''تاجی سے کہہ دینا۔'' میں نے رانی سے کہا۔ ''کہ میں نے اس کی عزت کا خیال رکھا ہے اس لیے وہ بھی مجھ سے اپنی عزت کرائے۔''

رانی نے کہا کہ وہ اگلے دن صبح تاجی کو ساتھ لے کر تھانے آ جائے گی۔ رانی چلی گئی تھی۔ اب شام ہونے کو آئی تھی۔ میں نے باقی کارروائی اگلے دن پر ڈالنے کا فیصلہ کیا اور تھانے سے نکل آیا۔

مان گئی

دوسرے دن میں تھانے میں بیٹھا ایک لڑائی جھگڑے کا کیس نمٹا رہا تھا کہ ایک کانسٹیبل نے آ کر بتایا کہ ہماری مخبر عورت رانی ایک عورت کو ساتھ لے کر آئی ہے۔ میں جو جھگڑے کا کیس نمٹا رہا تھا، ایسے واقعات دیہاتی زندگی میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ ایک آدمی نے دوسرے کی زمین پر لگا ہوا درخت کاٹ لیا تھا اور مالک کو اس کا علم ہو گیا تھا۔ باتوں باتوں میں بات بڑھ گئی تھی اور نوبت ڈانگ سوٹے تک جا پہنچی تھی۔ دونوں طرف سے کچھ آدمی زخمی ہوئے تھے اور معاملہ تھانے تک آ گیا تھا۔ میری کوشش تھی کہ صلح صفائی کرا دوں مگر دونوں میں سے کوئی فریق اس پر راضی نہیں ہو رہا تھا۔

میرے لیے جیلا کا قتل مسئلہ بنا ہوا تھا، اس لیے میں نے اے ایس آئی کو بلا کر کہا کہ وہ لڑائی جھگڑے کے اس کیس کو دیکھے۔ میرا یہ اے ایس آئی بڑا تیز وطرار تھا اور جہاں موقع مل جاتا، رشوت لینے سے نہیں چوکتا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ اب یہ دونوں پارٹیوں سے مال بٹورے گا اور آخر صلح کرا دے گا۔

ان لوگوں کو بھیج کر میں نے کانسٹیبل سے کہا کہ وہ رانی اور اس کے ساتھ آنے والی عورت کو لے آئے۔ تھوڑی دیر بعد تاجی کے پیچھے پیچھے ایک لڑکی بھی اندر آ گئی۔ وہ نوجوان لڑکی نہیں تھی بلکہ جواں سال تھی۔ اگرچہ اس کی شادی کو تین چار سال کا عرصہ ہو گیا تھا مگر کوئی بچہ وغیرہ نہ

ہونے کی وجہ سے اس کے چہرے پر جوانی کی رونق اور بدن کی شادابی قائم تھی۔

اس کا رنگ گورا نہیں بلکہ گندمی تھا۔ اس کے نقوش میں جاذبیت تھی۔ اس کی ایک خاص بات جو میں نے نوٹ کی، وہ یہ تھی کہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کا تاثر ہمہ وقتی تھا۔ یعنی وہ نہ بھی مسکرا رہی ہو تو لگتا تھا مسکرا رہی ہے۔ ایسے چہروں سے اکثر مرد حضرات دھوکا کھا کر غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

وہ بہت زیادہ گھبرائی ہوئی تھی۔ اس کی گھبراہٹ قدرتی تھی۔ قتل کی واردات اس کے سامنے ہوئی تھی اور وہ موقعہ کی گواہ تھی۔ میری نظر اس کے بازوؤں پر گئی لیکن اس نے دونوں بازو چادر میں چھپا رکھے تھے۔ اس نے چادر اس طرح اوڑھ رکھی تھی کہ پورا بدن ڈھکا ہوا تھا۔ میں اس کی چوڑیاں دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے اپنے سامنے بیٹھنے کو کہا تو وہ جھجکتی ہوئی بیٹھ گئی۔ میں نے رانی سے کہا کہ وہ باہر جا کر انتظار کرے۔

رانی کے جانے کے بعد میں نے تاجی سے اِدھر اُدھر کی کچھ باتیں کر کے اس کا خوف دور کیا اور وہ میرے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ اب میں اس سے اپنے مطلب کی باتیں پوچھنے لگا۔

''تم نے کوئی جرم نہیں کیا تاجی!'' میں نے اسے کہا۔ ''میں تم سے کچھ باتیں پوچھوں گا۔ اگر سچ سچ جواب دو گی تو تمہیں گھر جانے کی اجازت دے دوں گا ورنہ یہیں حوالات میں بند کر دوں گا۔''

میری یہ بات سن کر تاجی کے چہرے پر پریشانی کا ایک سایہ سا آ کر گزر گیا اور وہ اپنی جگہ پر بیٹھی پہلو بدلنے لگی۔

''جمیل (مقتول) کو جانتی ہو؟'' میں نے تاجی سے پوچھا۔

تاجی جواب دینے کی بجائے اس طرح میری طرف دیکھنے لگی جیسے میں نے اس سے کوئی غیر متوقع سوال پوچھ لیا ہو یا پھر میرا سوال اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا ہو۔ میں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

''کک...... کون جمیل؟'' اس نے بڑی مشکل سے اٹکتے ہوئے کہا۔

''وہ جو تمہاری وجہ سے مارا گیا ہے۔'' میں نے آگے کو جھک کر کہا۔ ''قتل کی رات تم اس کے ساتھ تھیں۔ پھر تم اسے چھوڑ کر بھاگ آئیں۔''

''یہ...... یہ جھوٹ ہے۔'' تاجی نے تڑپ کر کہا۔ ''میں کھڈ میں نہیں تھی۔''

''میں نے تو کھڈ کا نام بھی نہیں لیا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"تم کس کھڈی کی بات کر رہی ہو؟"

"وہ......وہ......" اس نے کچھ بولنے کی کوشش مگر پھر خاموش ہوگئی۔

میں نے دیکھا، اس کا اتنا اچھا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا تھا اور وہ مجھ سے نظریں چرانے لگی۔ اسے ابھی اندازہ نہیں تھا کہ میں اس کے بارے میں جان چکا ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جھوٹ بولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے میز کی دراز سے اس کی جوتی کا دایاں پاؤں نکالا جو اس نے کوڑے میں پھینک دیا تھا۔ میں نے دائیں جوتی اس کے سامنے میز پر رکھ دی۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ جوتی کو دیکھ کر اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوگیا تھا۔

"اسے پہچانتی ہو؟" میں نے تاجی سے پوچھا اور کہا۔ "اب جھوٹ نہ بولنا اور یہ نہ کہنا کہ یہ جوتی تمہاری نہیں ہے...... کیا یہ جوتی تمہاری ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا کر اقرار کیا کہ یہ جوتی اسی کی ہے۔

"یہ آپ کو کہاں سے ملی؟" اس نے پوچھا۔

"تم مجھ سے کوئی سوال نہ کرو۔" میں نے سختی سے کہا۔ "صرف میرے سوالوں کے جواب دو...... یہ بتاؤ، اس کا دوسرا پاؤں کہاں ہے؟"

"جوتی میری بہن لے گئی تھی۔" تاجی نے کہا۔ "اس کا بایاں پاؤں اس نے گم کر دیا، اس لیے میں نے یہ ایک جوتی بھی کوڑے میں پھینک دی۔"

اس کے بعد تاجی نے بڑی تفصیل سے بتایا کہ کس طرح اس کی بہن یہ جوتی ایک شادی والے گھر گم کر آئی تھی۔ میں نے اسے بالکل نہیں ٹوکا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ میں نے اس کی پوری بات سنی۔ جب وہ اپنی بات پوری کر چکی تو میں نے بغیر کچھ کہے میز کی دراز سے اسی جوتی کا بایاں پاؤں جو جائے واردات سے ملا تھا، نکال کر میز پر پڑے دائیں پاؤں کے ساتھ رکھ دیا۔ اس طرح جوڑا مکمل ہوگیا۔ میری نظریں تاجی کے چہرے پر تھیں۔

وہ دونوں جوتیوں کو دیکھ کر پہلے تو بری طرح چونکی پھر ایک دم یوں پیچھے کو ہٹی جیسے اسے پتہ ہو کہ جوتیوں میں کوئی سانپ چھپا بیٹھا ہے جو نکل کر اسے ڈس لے گا۔ اس کی حالت اتنی بری ہوگئی تھی کہ مجھے خدشہ ہوا کہ وہ بے ہوش ہی نہ ہو جائے۔

"تم کیوں بار بار جھوٹ بول رہی ہو؟" میں نے تاجی سے کہا۔ "میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ تم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ تمہارے سامنے جرم ہوا ہے، ایک انسان قتل ہوا ہے اور میں اس قاتل کو پکڑنا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

اس کے بعد میں نے تاجی کو حکم دیا کہ وہ اپنے دونوں بازو چادر کے اندر سے نکال کر میز کے اوپر رکھ دے۔ اس نے حیران سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر چپ چاپ دونوں بازو چادر سے نکال کر میز کے اوپر رکھ دیئے۔ اس کے دونوں بازوؤں میں رنگدار چوڑیاں تھیں اور میں نے پہلی نظر میں ہی بھانپ لیا تھا کہ یہ چوڑیاں بالکل ویسی ہی ہیں جیسے ٹکڑے جائے واردات پر مقتول کی لاش کے پاس پائے گئے تھے۔

میں نے جائے واردات سے ملنے والے چوڑیوں کے ٹکڑے نکال کر تاجی کے سامنے رکھ دیئے اور وہ مجھے اس طرح خوف اور حیرانی سے دیکھنے لگی جیسے میں کوئی جادوگر ہوں اور اس کی ایک ایک حرکت کے بارے میں مجھے معلوم ہے۔ اس کے بعد اس نے اس انداز میں سر جھکا لیا جیسے اپنی شکست تسلیم کر لی ہو۔

"جمیل کو کس نے قتل کیا تھا؟" میں نے تاجی سے پوچھا۔

"میں نہیں جانتی کہ وہ کون تھا۔" تاجی نے جواب دیا۔

"کیا تم نے اس کی شکل نہیں دیکھی تھی؟"

"نہیں۔" تاجی نے کہا۔ "ایک تو اندھیرا تھا، دوسرا اس نے منہ پر ڈھاٹا باندھا ہوا تھا۔"

"تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتیں۔" میں نے پوچھا۔ "قد کاٹھ اور ڈیل ڈول سے کچھ تو اندازہ کیا جا سکتا ہے۔"

"وہ اچانک ہی آ گیا تھا۔" تاجی نے کہا۔ "اور آتے ہی کلہاڑی سے جمیل پر وار کرنے لگا تھا۔ میں بھی گھبرا گئی تھی۔"

میں نے تاجی سے بہت سوال کیے مگر اس کا یہی جواب تھا کہ وہ قاتل کو نہیں پہچان سکی کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات اور لہجے کی صداقت سے اندازہ لگا لیا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کا کوئی چاہنے والا ایسا ہو سکتا ہے جو رقابت کی آگ میں جل کر قتل کرنے کی ہمت رکھتا ہو۔ تاجی نے صاف انکار کر دیا کہ اس کا اور کوئی عاشق نہیں ہے۔

میں نے تاجی سے پوچھا کہ جمیل (مقتول) کے ساتھ اس کی دوستی کیسے ہوئی تھی۔ اس کے جواب میں تاجی نے تفصیل سے مجھے ہر بات بتا دی۔ تاجی کی طویل باتوں کو مختصر کر کے کام کی باتیں آپ کو سنا دیتا ہوں۔

تاجی کی ایک بڑی بہن اس کے شوہر جہانگیر کے بڑے بھائی سے بیاہی ہوئی تھی۔ یہ

ایک ہی برادری کے لوگ تھے اور آپس میں رشتے داری بھی تھی۔ تاجی جوان ہوئی تو اس کی بڑی بہن نے خود اپنے دیور جہانگیر کے لیے تاجی کے رشتے کی بات کی۔ تاجی کے ماں باپ اس رشتے پر راضی نہیں تھے۔ اگرچہ یہ بات چھپائی گئی تھی لیکن لوگوں میں مشہور تھا کہ جہانگیر کو کوئی موذی بیماری لگی ہوئی ہے اور وہ شادی کے قابل نہیں ہے۔

ان لوگوں نے اس رشتے سے انکار کر دیا مگر ان کی بڑی بہن اپنے ماں باپ کے پیروں میں گر گئی اور روتے ہوئے بتایا کہ اگر وہ ناکام گئی تو اسے طلاق ہو جائے گی۔ اس کے شوہر یعنی جہانگیر کے بڑے بھائی نے کہا تھا کہ اگر رشتہ نہ ملا تو وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں بیٹھی رہے واپس نہ آئے، اسے وہیں طلاق نامہ پہنچ جائے گا۔

مختصر یہ کہ تاجی کے ماں باپ نے جانتے بوجھتے ہوئے بھی بڑی بیٹی کا گھر بسانے کے لیے چھوٹی بیٹی کو جہنم میں دھکیل دیا۔ بعد میں شادی کے بعد تاجی کو پتہ لگا کہ اس کے خاوند کو ٹی بی کی بیماری نے کھوکھلا کر رکھا ہے۔ تاجی نے رونے دھونے کی بجائے حالات سے سمجھوتہ کر لیا اور جیسے تیسے گزارہ کرنے لگی۔

اگر کھیتی کا مالک کمزور ہو اور اس کی رکھوالی کے قابل نہ ہو تو پھر ہر آتا جاتا اس میں منہ مارنے کی کوشش کرتا ہے۔ بالکل ایسا ہی تاجی کے ساتھ ہوا۔ کچھ اوباش فطرت نوجوانوں نے اسے لوٹ کا مال سمجھ کر اس سے ناجائز دوستیاں لگانے کی کوشش کی مگر وہ کسی کے ہتھے نہ چڑھی۔

اس کی ایک سہیلی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ گاؤں کے قریب موجود مزار پر سات جمعراتیں چراغ جلائے اور اپنے خاوند کی صحت یابی کے لیے دعا کرے تو اس کی دعا ضرور پوری ہوگی۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر وہ پیر صاحب سے دعا بھی کرائے تو اس کی ہر مراد پوری ہوگی۔

تاجی بڑی باقاعدگی سے جمعرات کے جمعرات خانقاہ پر چراغ جلانے کے لیے جانے لگی۔ وہ تیسری جمعرات تھی جب اس کی ملاقات وہاں جمیل عرف جیلا سے ہوئی۔ اسے یہ جوان آدمی پسند آیا تھا اور پھر ان کی باقاعدہ ملاقاتیں ہونے لگیں۔ جمیل بڑا مکار اور چالاک آدمی تھا۔ اس نے تاجی کی جسمانی تشنگی کے احساس کو ابھارا اور پھر ان کی ملاقاتیں پاک نہ رہیں۔ تاجی کو اپنے خاوند کا کوئی ڈر تھا نہ اس کی کوئی پرواہ تھی۔ وہ اکثر اسی کھڈ میں ملتے تھے جہاں بالآخر جیلا قتل ہوا تھا۔

قتل کی رات بھی وہ دونوں اسی کھڈ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ تاجی جیلا کے سینے سے پشت لگائے بیٹھی تھی۔ انہیں بیٹھے ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ اچانک اندھیرے سے مٹی کے

ایک تودے کے پیچھے سے ایک سایہ برآمد ہوا۔ وہ دونوں چونک کر الگ ہٹ گئے۔ سائے نے منہ چھپا رکھا تھا اور اس کے دائیں ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بڑی تیزی سے جیلا پر کلہاڑی کا وار کیا۔ جیلا نے بازو آگے کر کے وار روکنے کی کوشش کی اور کلہاڑی نے بازو پر گہرا زخم ڈال دیا۔ اس کے ساتھ ہی جیلا کے منہ سے ''ہائے'' کی آواز نکلی۔

کلہاڑی بردار نے ایک اور زوردار وار کیا جو سینے پر لگا اور جیلا پیچھے کو گر پڑا۔ اس دوران تاجی نے خوفزدہ ہونے کی بجائے بڑی دلیری سے کام لیا اور پیچھے سے حملہ آور کو جھا ڈال کر اپنے دانت حملہ آور کے بازو میں کہنی سے اوپر پوری طاقت سے گاڑ دیئے۔ حملہ آور درد کی شدت سے تڑپ اٹھا اور اس نے تاجی کو بالوں سے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ تاجی کا منہ اکھڑ گیا اور وہ پرے جا گری۔ اس کے بعد حملہ آور نے جیلا کی گردن پر کلہاڑی کا وار کیا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر تاجی وہاں سے بھاگ نکلی۔ کچھ دور آ کر اسے احساس ہوا کہ اس کے بائیں پاؤں کی جوتی وہیں کہیں رہ گئی ہے۔ وہ گرتی پڑتی گھر پہنچی تو باہر کا دروازہ اسی طرح بند تھا جیسے وہ چھوڑ کر نکلی تھی۔ کنڈی نہیں لگی ہوئی تھی۔

وہ دبے پاؤں اندر چلی گئی۔ وہ اپنے خاوند کے پاس نہیں سوتی تھی بلکہ پچھلے ڈیڑھ دو ماہ سے الگ کمرے میں سوتی تھی۔ اس خاوند سے اسے تشنگی کے سوا کچھ نہیں ملتا تھا۔ وہ آرام سے جا کر لیٹ گئی۔ ساری رات اسے نیند نہ آسکی۔ پھر اگلے دن پورے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ رات کھڈوں کے علاقے میں ایک آدمی قتل ہو گیا ہے۔

ساری بات سنا کر تاجی نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیئے اور پھر اس کے آنسو بہنے لگے۔ یہ ندامت کے آنسو تھے۔

''مجھے معاف کر دیں۔'' تاجی نے روتے ہوئے کہا۔ ''میری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ میں قسم کھاتی ہوں کہ آج کے بعد بدی کے راستے پر نہیں چلوں گی اور میرا خاوند جیسا بھی ہے، اس کی وفادار رہوں گی۔''

مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ اپنے خاوند کو دھوکہ دیتی ہے یا اس کی وفادار رہتی ہے۔ میرا اصل مقصد یہ تھا کہ قاتل کو گرفتار کر کے عدالت میں پیش کروں۔ جس قسم کے حالات پیش آ رہے تھے، معاملہ پھر الجھ گیا تھا۔ قاتل کے ملنے کی جو یقینی امید پیدا ہوگئی تھی، وہ ایک بار پھر مایوسی میں بدل گئی۔

میں نے تاجی کے ساتھ بڑا مغز کھپایا، اتنے زیادہ سوالات کئے کہ وہ تنگ آگئی اور بے

بسی سے میری طرف دیکھنے لگی۔ سوچتے سوچتے میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ قتل تاجی کے بیمار خاوند جہانگیر نے کیا ہو۔ بے شک وہ ٹی بی کا مریض تھا مگر ایسا گیا گزرا بھی نہیں ہوگا کہ کلہاڑی نہ چلا سکے۔ پھر جب انسان غیرت کے جوش میں آیا ہوا ہو تو اس کے اندر ایک اضافی طاقت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے دیوانگی بھی کہا جا سکتا ہے۔

میں نے اپنے شک کا اظہار تاجی سے کیا تو وہ چونک گئی اور اس کے چہرے پر ایک لمحے کو خوف کا تاثر ابھرا مگر دوسرے ہی لمحے وہ مطمئن سی نظر آنے لگی۔

"ناممکن!" تاجی نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "اس کے اندر اتنی جان نہیں ہے کہ وہ کسی انسان کو قتل کر سکے۔"

"قتل والی رات کو یاد کرو۔" میں نے تاجی سے کہا۔ "تم جب کھڈ سے بھاگ کر گھر پہنچی تھی تو اپنے خاوند کو دیکھا تھا؟..... کیا وہ سو رہا تھا؟"

"وہ سو رہا تھا۔" تاجی نے کہا۔ "میں نے اس کمرے کے دروازے میں ذرا سی درز بنا کر دیکھا تھا، وہ اپنے بستر میں منہ لپیٹے سو رہا تھا۔"

سوچ سوچ کر میرا سر دُکھنے لگا تھا کہ آخر قاتل کون ہو سکتا ہے اور اس نے قتل کیوں کیا؟ قتل کے کیسوں میں سب سے اہم چیز وجۂ قتل ہوتی ہے۔ کوئی یونہی کسی کی جان نہیں لیتا۔ اگر وجۂ قتل معلوم ہو جائے تو پھر تفتیش آسان ہو جاتی ہے۔

میں نے تاجی کو باہر بھیج دیا اور تھانے میں ہی رہنے کو کہا۔ میں کچھ دیر اپنے دماغ کو آرام دینا چاہتا تھا تا کہ تازہ دم ہو کر بہتر طریقے سے کچھ سوچ سکوں۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو کہا کہ اس عورت کو تھانے سے باہر نہ جانے دے۔ اس کے جانے کے بعد میں آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت سے ٹک گیا۔ میں نے منع کر دیا تھا کہ پندرہ بیس منٹ تک کوئی میرے پاس نہ آئے۔

سچا عاشق

تقریباً آدھے گھنٹے کے آرام کے بعد میں تازہ دم ہو گیا۔ میں نے کانسٹیبل کو بلا کر پوچھا کہ اس دوران کوئی مجھ سے ملنے تو نہیں آیا۔ اس نے بتایا کہ اپنا ایک مخبر خاصی دیر سے آیا ہوا ہے۔ اس کے پاس کوئی اہم اطلاع ہے۔ میں نے تاجی کو بلانے سے پہلے ضروری سمجھا کہ اس مخبر سے مل لوں۔ یہی سوچ کر میں نے مخبر کو بلا لیا۔ یہ تھانے کا خاص آدمی تھا اور باقاعدہ مخبر تھا جو لوگوں کی چھوٹی بڑی باتوں سے تھانیدار کو آگاہ رکھتا تھا۔

اس مخبر نے جو اطلاع دی اسے سن کر میں چونک گیا۔ اگر اس کی لائی ہوئی اطلاع درست تھی تو پھر میرا کام آسان ہو گیا تھا۔ اس مخبر نے تاجی کے ایک اور عاشق کے متعلق بتایا جو تاجی کے آگے پیچھے پھرتا تھا۔ اس کا اصل نام تو عباس تھا مگر سب اسے باسو کہتے تھے۔

میرے اس مخبر نے باسو کے متعلق جو تفصیل بتائی تھی، اس کے مطابق باسو بہت شریف آدمی تھا۔ باقاعدگی سے مسجد میں جاتا تھا اور اس کے علاوہ پیر صاحب کے خاص مریدوں میں بھی شامل تھا۔ لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ عورتوں میں یہ مشہور تھا کہ باسو اور تاجی کا ضرور کوئی چکر ہے۔ باسو کی شخصیت ایسی تھی کہ کوئی کھل کر اس پر انگلی نہیں اٹھاتا تھا۔

یہ مخبر بڑے کام کی اطلاع لے کر آیا تھا۔ یہ اطلاع اس وقت مجھے ملی تھی جب میں تنکوں کے سہارے ڈھونڈ رہا تھا اور مجھے کوئی ایسا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ جس پر چل کر میں تفتیش کے کام کو آگے بڑھا سکتا۔

مخبر نے عباس عرف باسو کے متعلق ایک بات خاص طور پر یہ بتائی کہ وہ عورتوں کے لیے بڑی کشش رکھتا ہے۔ اس کی مردانہ وجاہت ایسی تھی کہ عورتیں اس کی طرف کھنچی جاتی تھیں لیکن وہ کسی کو گھاس نہیں ڈالتا تھا۔ آج تک اس کی کسی ایسی ویسی حرکت کی اطلاع نہیں ملی تھی۔

میں نے اسی وقت باسو کو تھانے بلانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس مخبر نے جو اس کے بارے میں اطلاع لے کر آیا تھا، بتایا کہ باسو اس وقت پیر صاحب کے پاس ہوگا یا مزار پر بیٹھا مل جائے گا۔ مخبر نے یہ بھی بتایا کہ وہ مزار سے متعلقہ کام کرتا ہے اور پیر صاحب کا ہر حکم بجا لاتا ہے، اس کے علاوہ کوئی کام نہیں کرتا۔ اس کی تمام ضرورتیں اور اخراجات پیر صاحب پوری کرتے ہیں۔

میں نے باوردی کانسٹیبل بھیجنے کی بجائے اسی مخبر کو باسو کو بلا کر لانے کے لیے بھیج دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ باوردی کانسٹیبل کو دیکھ کر پیر تک بات پہنچ جائے اور وہ اس معاملے میں کسی قسم کی دخل اندازی کرے۔

میرا مخبر باسو کو لانے کے لیے چلا گیا تو میں نے ایک کانسٹیبل سے کہا کہ وہ تاجی کو میرے پاس لے آئے۔ مجھے تاجی پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ میں نے اس کی بہت عزت کی تھی اور اس سے کہا تھا کہ ہر بات سچ سچ مجھے بتا دے لیکن وہ بار بار میرے ساتھ جھوٹ بول کر مجھے چکر دے رہی تھی۔ میں اتنی دیر سے اس کے ساتھ مغز کھپا رہا تھا۔ اگر وہ مجھے پہلے ہی باسو کے متعلق بتا دیتی تو مجھے ایک ایسا مشتبہ مل جاتا جس پر شک کیا جا سکتا تھا کہ یہ قتل اس نے کیا ہوگا۔

تاجی آ گئی۔ وہ بیٹھنے لگی تو میں نے اسے کھڑا رہنے کو کہا۔ وہ میرے رویے میں اس تبدیلی

پر حیران نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

''میں نے تمہاری بہت عزت کی تھی۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''لیکن لگتا ہے تم اس قابل نہیں ہو۔''

''کیا بات ہو گئی ہے تھانیدار صاحب!'' تاجی نے پریشانی سے پوچھا۔

''یہ باسو کون ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔ ''تمہارا اور اس کا کیا تعلق ہے؟''

''تو آپ کو پتہ چل ہی گیا۔'' تاجی نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

''تم نے مجھے باسو کے متعلق کیوں نہیں بتایا؟'' میں نے تاجی سے پوچھا۔

''میں آخر وقت تک یہ بات چھپانا چاہتی تھی۔'' تاجی نے اچانک جاندار آواز میں کہا۔

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لیے کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ پکڑا جائے۔'' تاجی نے بے خوف لہجے میں کہا۔ ''وہ بہت اچھا انسان ہے۔ میں اس کو اپنا پیر و مرشد مانتی ہوں۔''

''تمہارا اس کے ساتھ یارانہ ہوگا۔'' میں نے جان بوجھ کر ''یارانہ'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔

''خدا کے لیے ایسا نہ کہیں۔'' تاجی نے تڑپ کر کہا۔ ''وہ تو فرشتہ ہے...... وہ میرے ساتھ سچی محبت کرتا ہے۔''

اس کے بعد تاجی نے اپنے اور باسو کے تعلقات کے متعلق ہر بات کھل کر بیان کر دی۔ اس کے بیان کے مطابق باسو کی پرکشش مردانہ وجاہت کی وجہ سے اکثر مزار پر گئی ہوئی عورتیں اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتی تھیں اور باسو ہنس مسکرا کر ٹال جاتا تھا۔ تاجی کو بھی باسو اچھا لگتا تھا۔ تاجی جب بھی مزار پر دعا کے لیے جاتی، باسو سے ضرور ملتی۔ رفتہ رفتہ باسو کی آنکھوں میں اس کے لیے پسندیدگی ظاہر ہونے لگی اور وہ دونوں خاصے بے تکلف ہو گئے۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ یہ بے تکلفی بے حیائی والی نہیں تھی۔

ایک دن باسو نے تاجی سے پوچھ لیا کہ اس کا کیا مسئلہ ہے اور وہ کیا دعا مانگنے آتی ہے۔ اس کے جواب میں تاجی نے باسو کو اپنے بیمار خاوند کے متعلق بتایا اور ہر بات تفصیل سے بتا دی۔ باسو نے تاجی سے کہا کہ اس طرح رو رو کر زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ وہ طلاق لے لے، وہ اس سے شادی کر لے گا۔ اس کے جواب میں تاجی نے اسے اپنی مجبوری بتائی کہ اگر وہ اپنے خاوند سے طلاق لے گی تو اس کی بڑی بہن کو بھی طلاق ہو جائے گی۔ تاجی نہیں چاہتی تھی

کہ اس کی وجہ سے اس کی بہن کا گھر برباد ہو جائے اور چھوٹے چھوٹے بچے رُل جائیں۔

تاجی ازدواجی زندگی کی تشنگیوں کی شکار تھی اور اس کا دماغ ہر وقت انتقامی سوچیں سوچتا رہتا تھا۔ اس نے باسو پر ڈھکے چھپے لفظوں اور اشاروں کنائیوں میں یہ ظاہر کیا کہ وہ اس کی بے نکاحی بیوی بننے کے لیے تیار ہے۔

باسو کسی اور طرح کا انسان تھا۔ اس نے گناہ کا یہ کھیل کھیلنے سے صاف انکار کر دیا اور تاجی کو لعنت ملامت کی۔ تاجی اس سے بہت متاثر ہوئی۔ ان دونوں میں سچی اور روحانی محبت کا تعلق بنا رہا مگر تاجی کو روحانی کی بجائے جسمانی محبت کی ضرورت تھی۔ اس طرح وہ آہستہ آہستہ باسو سے دور ہٹنے لگی۔ پھر اس کی ملاقات جمیل عرف جیلا سے ہو گئی۔ جیلا مجرمانہ ذہنیت کا مالک اور عورتوں کا شکاری تھا۔ اس نے تاجی جیسے آسان شکار کو پھانس لیا اور پھر تاجی نے اپنا آپ جیلا کے حوالے کر دیا۔

باسو کو ان تعلقات کا علم ہوا تو اس نے بڑی سختی سے تاجی کو منع کیا اور سمجھایا کہ جیلا پکا وارداتیا ہے، وہ اس کو خراب کر کے بدنام کرے گا۔ تاجی اس وقت کوئی بات سمجھنے والی ذہنی حالت میں نہیں تھی۔

وہ بدکار عورت نہیں تھی۔ اس کے ساتھ جو زیادتی ہوئی تھی، اپنی دانست میں وہ اس کا انتقام لے رہی تھی لیکن اسے احساس نہیں تھا کہ وہ جس راستے پر چل نکلی ہے اس کا اختتام ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں۔ یہ میرا ذاتی خیال ہے جو غلط بھی ہو سکتا ہے۔

بہرحال تاجی باسو کے سمجھانے پر اپنی حرکتوں سے باز نہ آئی اور اس نے باسو سے کہا کہ وہ ایک شرط پر جیلا سے دوستی ختم کرے گی کہ باسو اس سے ویسی ہی دوستی کر لے۔ باسو نے وہی بات کہی کہ اگر وہ یعنی تاجی طلاق لے لے تو وہ اس سے شادی کر لے گا لیکن تاجی کی مجبوری تھی کہ وہ طلاق نہیں لے سکتی تھی۔

میں نے تاجی سے پوچھا کہ باسو نے کبھی ایسی دھمکی دی ہو گی کہ اگر اس نے جیلا کے ساتھ تعلق نہ توڑا تو وہ اسے قتل کر دے گا۔

''قتل کی دھمکی تو نہیں جی تھی۔'' تاجی نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''البتہ یہ ضرور کہا تھا کہ لگتا ہے جیلا کا کچھ بندوبست کرنا پڑے گا۔''

''کیا باسو میں اتنی ہمت ہے کہ کسی کو قتل کر دے؟'' میں نے تاجی سے پوچھا۔

''وہ سیدھا اور کھرا آدمی ہے۔'' تاجی نے کہا۔ ''ایسے آدمی کو کسی کا ڈر نہیں ہوتا۔ باسو

جیسا آدمی سب کچھ کرنے کی ہمت رکھتا ہے۔"

اس کے بعد تاجی باسو کے متعلق اس طرح باتیں کرنے لگی جیسے وہ کوئی سپر مین قسم کی چیز ہو۔ وہ اپنی طرف سے اس کی تعریفیں کر رہی تھی اور یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ نادانستگی میں باسو کے خلاف شک پکا کر رہی ہے۔ مجھے پکا یقین ہو گیا تھا کہ یہ قتل باسو کے علاوہ اور کسی نے نہیں کیا۔

میں باسو کے متعلق سوچ رہا تھا کہ میرا وہ مخبر آ گیا جسے میں نے باسو کو لینے کے لیے بھیجا تھا۔ اس نے اشارے سے مجھے بتایا کہ وہ باسو کو لے آیا ہے۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو بلا کر اس سے کہا کہ وہ تاجی کو اس طرح لے جائے کہ باسو کا اور اس کا آمنا سامنا نہ ہو۔ اس کے بعد میں نے تاجی سے کہا کہ وہ اب گھر جا سکتی ہے جب اس کی ضرورت پڑے گی میں اس کو گھر سے بلا لوں گا۔ میں نے اسے اس بات کا پابند بھی کر دیا کہ وہ تھانے میں بتائے بغیر گاؤں سے باہر نہ جائے۔

پھر تاجی چلی گئی اور میں نے کانسٹیبل سے کہا کہ وہ باسو کو میرے پاس لے آئے۔

مردوں والا کام

تھوڑی دیر کے بعد کانسٹیبل باسو کو لے آیا۔ اسے دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ وہ صحیح معنوں میں جواں مرد دکھائی دیتا تھا۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، گٹھا ہوا جسم اور سرخ و سفید رنگت۔ اس نے بڑے احترام سے سلام کیا اور میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر مصافحہ کیا۔

"حکم کریں سرکار!" باسو نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "آپ نے مجھے یاد کیا ہے؟"

"مردوں والا کام کیا ہے تم نے باسو!" میں نے اس کے کندھے پر بے تکلفی سے تھپکی دے کر کہا۔

"میں سارے کام مردوں والے ہی کرتا ہوں۔" اس نے حیران ہو کر کہا۔ "آپ نہ جانے کس کام کی بات کر رہے ہیں؟"

"میرا اشارہ جیلا کی طرف ہے۔" میں نے کہا۔

"میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔" باسو نے اطمینان سے کہا۔ "اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ اسے میں نے قتل کیا ہے تو آپ غلطی پر ہیں۔ بھلا مجھے کیا ضرورت تھی اسے قتل کرنے کی؟"

"تم تاجی کو پسند کرتے تھے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "اور تاجی جیلا کے ساتھ ملاقاتیں کرتی تھی چنانچہ رقابت کے جوش میں آ کر تم نے موقع پا کر اس کا

کانٹا نکال دیا۔ تم اقبالی بیان دے دو، تمہارے خلاف مضبوط شہادت موجود ہے۔"

میں نے اکثر اپنی تفتیشی کہانیوں میں آپ کو سنایا ہے کہ کسی ملزم پر قتل کا الزام لگایا یا اسے اقبالی بیان دینے کے لیے کہا تو وہ قسمیں کھانے لگا یا رونے لگا اور اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کے لیے کوشش کرنے لگا لیکن باسو کا ردِعمل بڑا عجیب اور میری توقع کے خلاف تھا۔ میری بات سن کر وہ اس طرح مسکرایا جیسے میری بات سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔

"میں آپ کو ہر بات سچ سچ بتا دیتا ہوں۔" باسو نے کہا۔ "یقین کرنا یا نہ کرنا آپ کا کام ہے۔ میرا ارادہ قتل کرنے کا ضرور تھا لیکن میرا خیال تھا کہ پہلے جیلا کی تھوڑی مرمت کروں گا اور اسے تاجی سے ملنے سے منع کروں گا۔ اگر اس کے بعد بھی وہ باز نہ آتا تو میں نے اسے قتل کر دینا تھا۔ اس کے بعد میں نے ایک قتل اور کرنا تھا اور یہ قتل تاجی کے بے غیرت خاوند جہانگیر کا ہوتا...... میں خود اس بات پر حیران ہوں کہ جیلا کو کون قتل کر گیا۔"

باسو کے بولنے کا انداز ایسا تھا کہ لگتا تھا وہ سچ بول رہا ہے لیکن میں فوراً اس کی باتوں پر یقین نہیں کر سکتا تھا۔ حالات و واقعات اور شواہد ایسے تھے جو باسو کو مشتبہ نمبر ایک ظاہر کر رہے تھے۔ اس لیے میں اتنی آسانی سے اس کی باتوں پر یقین نہیں کر سکتا تھا۔ ہر مجرم اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے قصے کہانیاں سناتا ہے۔ اللہ رسول کی قسمیں کھا کر یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔

میں نے باسو کو قتل والی رات یاد دلا کر پوچھا کہ اس رات وہ کہاں تھا۔ اس کے جواب میں اس نے بتایا کہ وہ رات کو پیر صاحب کے ڈیرے پر سوتا ہے اور اس رات بھی وہیں سویا ہوا تھا۔ میں نے جائے واردات پر پائے جانے والے کھرے اپنے ذہن میں محفوظ رکھے ہوئے تھے۔ میں نے باسو کے کھرے کچی زمین پر لے کر ان کا جائے واردات والے کھروں سے موازنہ کیا۔ دونوں کھروں میں بہت تھوڑا سا فرق محسوس ہوتا تھا۔ اتنا فرق تو جوتا تبدیل کرنے سے بھی پیدا ہو سکتا تھا۔ میرا شک باسو پر اور پکا ہو گیا۔

میں نے باسو کو اس بات پر آمادہ کرنا شروع کر دیا کہ وہ اقبالی بیان دے دے گا تو میں اس کی مدد کروں گا اور مقدمہ ایسا ڈھیلا بناؤں گا کہ وہ صاف بری ہو کر آ جائے گا۔

"کس بات کا اقبالی بیان دے دوں؟" باسو نے حیرانی سے کہا۔ "میں نے کوئی جرم نہیں کیا تو پھر خواہ مخواہ کسی کا گناہ اپنے سر تھوپ لوں۔ آپ اپنی تفتیش کریں۔ اگر میں مجرم ثابت ہو گیا تو کوئی رعایت نہیں مانگوں گا۔"

میں نے اس کے ساتھ بہت مغز کھپایا، اپنے استادی طریقوں سے اسے گھیرنے کی کوشش کی لیکن وہ ایسا گھاگ تھا کہ پروں پر پانی نہیں پڑنے دے رہا تھا۔ اب مجھ پر جھنجھلاہٹ طاری ہونے لگی تھی۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا اور اسے کہا کہ باسو کو حوالات میں بند کر دے اور اسے اپنی مہارت کا تھوڑا نمونہ دکھائے۔

یہ ہیڈ کانسٹیبل بڑا صحت مند تھا اور ملزموں سے ان کے سینے کے اندر چھپے ہوئے راز نکالنے میں ماہر سمجھا جاتا تھا۔ اس نے باسو کو اس طرح دیکھا جیسے قصائی بکرے کو دیکھتا ہے اور پھر اس کی گردن دبوچ کر کمرے سے باہر لے گیا۔

تاجی مشکوک تھی

مجھے پورا یقین تھا کہ تھوڑے سے تشدد سے باسو اقبالی بیان دینے پر آمادہ ہو جائے گا۔ تھوڑی دیر بعد اندر سے باسو کی تکلیف میں ڈوبی ہوئی آوازیں آنے لگیں۔ ہیڈ کانسٹیبل نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ میں عام طور پر تشدد کا قائل نہیں تھا، صرف مجبوری کے عالم میں یہ طریقہ اس وقت استعمال کرتا تھا جب مجھے یقین ہو جاتا کہ ملزم ہی مجرم ہے اور مجھے چکر دینے کی کوشش کر رہا ہے تو پھر ایسے ملزموں سے مجھے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی تھی۔

تھانے میں باسو کی چیخ و پکار گونج رہی تھی جب ایک کانسٹیبل نے آ کر مجھے بتایا کہ پیر صاحب کا ایک آدمی مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے کانسٹیبل سے کہا کہ وہ اس آدمی کو میرے پاس بھیج دے۔ میں سمجھ گیا کہ کسی طرح پیر صاحب تک یہ خبر پہنچ گئی ہے کہ اس کے خاص مرید باسو کو قتل کی تفتیش کے سلسلے میں تھانے بلایا گیا ہے اور اب باسو کی سفارش آ گئی تھی۔

”سرکار نے پیغام بھیجا ہے حضور!“ اس نے کہا۔

”کیا پیغام بھیجا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”باسو کو چھوڑ دیں۔“ اس آدمی نے کہا۔ ”حضرت صاحب نے کہا ہے کہ باسو معصوم آدمی ہے اور ان کا خاص بالکا ہے۔“

مجھے یہ سن کر بڑا غصہ آیا کہ پیر مجھے حکم دے رہا تھا کہ میں باسو کو چھوڑ دوں۔

”باسو معصوم ہے یا مجرم!“ میں نے اس آدمی سے کہا۔ ”اس کا فیصلہ تمہارے پیر صاحب نے نہیں، میں نے کرنا ہے۔ اپنے پیر صاحب سے کہہ دو کہ وہ سرکاری کام میں مداخلت نہ کریں اور مجھے اپنا کام کرنے دیں۔“

وہ آدمی اس طرح حیران ہو کر میری شکل دیکھنے لگا جیسے میں دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہوں۔ یہ دیہاتی سا آدمی ان عقیدت مندوں میں سے تھا جو اپنے پیر کو اللہ کے بعد مانتے ہیں اور بعض اوقات اللہ کی ذات کو بھی بھول کر پیر کے سامنے ماتھا رگڑتے ہیں ایسے آدمی کے لیے میں عجوبہ ہی تھا۔ وہ حیران و پریشان چلا گیا۔

وہ تو چلا گیا لیکن میرا موڈ خراب کر گیا۔ میں اس طرف چلا گیا جہاں ہیڈ کانسٹیبل باسو پر تشدد کر رہا تھا۔ باسو کی قمیص اس کے جسم پر نہیں تھی اور وہ فرش پر پڑا گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ تھوڑی سی دیر میں ہی اس کی حالت بری ہو گئی تھی۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”بڑا ڈھیٹ ہے سر!“ اس نے کہا۔ ”مجھے تھوڑا سا وقت اور دے دیں، اس کی بوٹی بوٹی اقبال جرم کرے گی۔“

اچانک ایک خیال میرے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔ مجھے یاد آ گیا کہ تاجی نے کہا تھا کہ اس نے قاتل کے بازو پر پورے زور سے دانت گاڑے تھے جو یقیناً گوشت کے اندر تک اُتر گئے ہوں گے اور قاتل کے بازو پر دانتوں کے زخم کا نشان موجود ہو گا۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو تشدد کرنے سے روک دیا اور آگے بڑھ کر فرش پر پڑے ہوئے باسو کے قریب جا بیٹھا۔ میں نے پہلے اس کا دایاں بازو اور پھر بایاں بازو کندھے سے ذرا نیچے اور کہنی سے اوپر غور سے دیکھا، کسی بازو پر دانتوں کے زخم کا نشان نہیں تھا۔

یہ دیکھ کر میں پریشان ہو گیا۔ اگر تاجی کا کہنا درست تھا تو پھر اس کے مطابق باسو قاتل ثابت نہیں ہوتا تھا۔ میں نے جلد بازی میں کوئی فیصلہ کرنے کی بجائے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ باسو کو پانی وغیرہ پلائے اور حوالات میں بند رکھے۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کل تھانے آتے ہی تاجی کو تھانے بلاؤں گا اور ذرا سختی سے اس سے دوبارہ پوچھ گچھ کروں گا۔ مجھے اب تاجی بھی مشکوک نظر آنے لگی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ قتل باسو نے یا اس کے خاوند جہانگیر نے ہی کیا ہو اور تاجی نے اسے پہچان بھی لیا ہو اور اب وہ اس کو بچانے کے لیے ڈرامہ کر رہی ہے۔

بھید کھل گیا

اگلا دن بڑا ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ میں ابھی تھانے میں آ کر بیٹھا ہی تھا اور میرا ارادہ تھا کہ

کچھ دیر بعد کسی کو بھیج کر تاجی کو تھانے بلواؤں گا۔ اتنے میں ایک کانسٹیبل نے آ کر بتایا کہ تاجی آئی ہے اور ملنا چاہتی ہے۔ میں اس کی صبح صبح آمد پر بڑا حیران ہوا۔ پھر میں نے سوچا کہ ضرور اسے کوئی نئی بات معلوم ہوئی ہے۔ میں نے اسے فوراً بھیجنے کو کہا۔

تھوڑی دیر بعد تاجی آ گئی۔ اس کے چہرے پر عجیب سا تاثر پھیلا ہوا تھا جسے میں کوئی مفہوم نہ پہنا سکا۔ عجیب یقین اور بے یقینی کی کیفیت تھی جیسے وہ کسی فیصلے پر نہ پہنچ پا رہی ہو۔ میں نے اسے بیٹھنے کو کہا تو وہ کرسی پر اس طرح بیٹھی جیسے ابھی اٹھ کھڑی ہو گی۔ میں نے اسے آرام سے بیٹھنے کو کہا اور یہ بھی کہا کہ وہ پورے اطمینان سے بات کرے۔

اس نے جو بات سنائی اسے سن کر مجھے ایسے لگا جیسے میری اب تک کی ساری تفتیش غلط رخ پر جا رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ صبح سویرے گھر کے کام کاج کر رہی تھی۔ وہ اپنے خاوند کے لیے ناشتہ لے کر اس کے کمرے میں گئی تو وہ میلی قمیص اتار کر صاف پہننے لگا تھا۔ تاجی نے دیکھا کہ اس کے دائیں بازو پر ایک زخم نظر آ رہا تھا۔ تاجی کو دیکھ کر وہ ایک دم چونک گیا اور جلدی سے دوسری طرف گھوم گیا تا کہ زخمی بازو تاجی کو نظر نہ آئے۔ پھر اس نے بڑی جلد بازی میں قمیص پہن لی۔

تاجی نے اس پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ اس نے وہ زخم دیکھ لیا ہے۔ وہ انجان بنی رہی۔ تاجی نے مجھے بتایا کہ اس کو کبھی کبھی شک ہونے لگتا تھا کہ قاتل اس کا خاوند ہو سکتا ہے لیکن پھر وہ اپنے خیال کو خود ہی رد کر دیتی کہ اس کے بیمار ٹی بی کے مارے خاوند میں اتنی ہمت نہیں ہو سکتی۔ پھر دوسری بات جو خاوند پر سے اس کا شک رفع کرتی تھی، وہ یہ تھی کہ جب قتل والی رات وہ جان بچا کر گھر پہنچی تو اس نے اپنے خاوند کے کمرے میں جھانک کر دیکھا تھا، وہ سو رہا تھا۔

اب تاجی نے خاوند کے بازو پر عین اس مقام پر جہاں اس نے قاتل کے بازو پر دانتوں سے کاٹا تھا، زخم کا نشان دیکھا تو اس کا شک پھر بیدار ہو گیا۔ اس کو یقین ہونے لگا کہ جیلا کو اس کے خاوند نے ہی قتل کیا ہو گا۔ یہی سوچ کر وہ میرے پاس آ گئی۔

میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور اسی وقت دو کانسٹیبلوں کو بھیجا کو وہ تاجی کے خاوند جہانگیر کو لے آئیں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ اگر وہ نہ آنا چاہے تو زبردستی ہتھکڑی لگا کر لے آئیں۔ کانسٹیبل چلے گئے تو میں تاجی سے باتیں کرنے لگا۔ اس کے بعد میں نے تاجی کو ایک دوسرے کمرے میں بٹھایا تا کہ اس کے خاوند کی اس پر نظر نہ پڑے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد کانسٹیبل تاجی کے خاوند کو لے آئے۔ اسے ہتھکڑی لگانے کی

ضرورت نہیں پڑی تھی اور وہ شرافت سے آ گیا تھا۔ کانسٹیبل اسے میرے پاس چھوڑ کر چلے گئے تو میں نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ اس کے بعد میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنی قمیص اتار دے۔

وہ میرا یہ حکم سن کر پریشان نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اسے غالباً مجھ سے ایسے کسی حکم کی توقع نہیں تھی۔ میں نے میز پر پڑی ہوئی بید کی چھڑی اٹھا لی۔ وہ کچھ خوفزدہ نظر آنے لگا۔

''سنا نہیں تم نے!'' میں نے چھڑی کو زور سے میز پر مار کر کہا۔ ''میں نے تم سے کیا کہا ہے؟''

''آپ نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟'' اس نے منمناتی آواز میں کہا۔

''تم سے صرف چند سوال پوچھوں گا۔'' میں نے اس سے کہا۔ ''ان کا جواب ٹھیک ٹھیک دو اور چلے جاؤ...... اب تم شرافت سے قمیص اتار دو ورنہ میں کانسٹیبلوں کو بلا کر کہوں گا وہ خود ہی یہ کام کر لیں گے۔''

اس نے مجبوراً قمیص کے بٹن کھولے اور قمیص اتار دی۔ اس کے دائیں بازو پر زخم کا نشان صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کر غور سے دیکھا۔ زخم بگڑ رہا تھا مگر پھر بھی صاف نظر آ رہا تھا کہ یہ دانتوں کے زخم کا نشان ہے۔ میں نے جہانگیر کی طرف دیکھا تو اس کا برا حال تھا۔

''یہ زخم کیسے آ گیا ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''وہ...... وہ جی......'' اس نے بولنے کی کوشش کی لیکن بول نہ سکا۔

''یہ تو کسی کے دانتوں کا نشان لگتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''آں...... ہاں جی...... نن نہیں جی!'' اس نے بوکھلا کر پہلے اقرار کیا پھر انکار کرنے لگا۔

''مجھے صرف ایک سوال کا صحیح جواب دے دو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''یہ کس کے دانتوں کے نشان ہیں؟''

وہ کھوئی کھوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سوال کا کیا جواب دے۔ پھر ایک دم اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات نظر آنے لگے اور اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ خیال ہی خیال میں کسی دشمن کی گردن دبا رہا ہو۔

''یہ سب اس حرامزادی کا کام ہے۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے غلطی

ہوئی کہ اس کو زندہ چھوڑ دیا...... سارے فساد کی جڑ وہی ہے۔"

اس کی سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی کہ آج ہی اس کی بیوی نے اس کے بازو کا زخم دیکھا اور پھر تھانے میں اس کی طلبی ہو گئی۔ میں نے قمیص اُتروا کر زخم دیکھا تو بات دو جمع دو چار کی طرح صاف ہو گئی۔

"ہاں، میں اقرار کرتا ہوں۔" جہانگیر نے کہا۔ "جیلا کو میں نے قتل کیا ہے۔ آپ میرا اقبالی بیان لکھ لیں۔"

"وہ کلہاڑی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔ "جس سے تم نے جیلا کو قتل کیا تھا۔"

"گھر میں رکھی ہے۔" جہانگیر نے جواب دیا۔

میں نے سب سے پہلے اس کا اقبالی بیان لے کر لکھ لیا اور اس کے دستخط کرا لئے۔ اس کے بعد میں کلہاڑی کی برآمدگی کے لیے اس کے ساتھ اس کے گھر چلا گیا۔ میں نے نمبردار اور ایک دو معزز آدمیوں کو ساتھ لیا اور جہانگیر کو کلہاڑی برآمد کرانے کو کہا۔ جہانگیر نے ان معززین کی موجودگی میں ایک بڑے سے لوہے کے ٹرنک کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک کلہاڑی نکال کر مجھے دے دی۔

میں نے کلہاڑی کی برآمدگی کا مشیر نامہ تیار کر کے معززین سے بطور گواہ دستخط کروالئے اور پھر جہانگیر کو لے کر تھانے آ گیا۔ میں نے کلہاڑی کا معائنہ کیا تو اس پر خون نہیں لگا ہوا تھا غالباً ملزم نے واردات کے بعد دھو ڈالی تھی۔ جہانگیر نے بڑا طویل اور جذباتی بیان دیا تھا۔ میں مختصراً اس کا بیان سنا دیتا ہوں۔

وہ آخر مرد تھا

جہانگیر کی شادی تاجی کے ساتھ جیسے تیسے ہو گئی تھی لیکن بعد میں اس پر اس خوفناک حقیقت کا انکشاف ہوا کہ وہ شادی جیسا بارِ گراں اٹھانے کے قابل نہیں ہے۔ ٹی بی کے موذی مرض نے اسے اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔ تاجی نے کچھ عرصہ تو گزارہ کیا پھر ان کے درمیان اکثر لڑائی جھگڑا رہنے لگا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ تاجی الگ کمرے میں سونے لگی۔

اس کے بعد جہانگیر کو تاجی کی شکایتیں ملنے لگیں کہ وہ مردوں سے دوستیاں لگانے لگی ہے۔ پہلے تو جہانگیر برداشت کرتا رہا لیکن پھر ایک رات اس نے تاجی کو اپنے کمرے سے

غائب پایا تو اسے یقین آ گیا کہ لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔ وہ بے شک ٹی بی کا مریض تھا اور بیماری نے اسے اندر سے کھا لیا تھا لیکن آخر وہ مرد تھا اور کوئی مرد یہ برداشت نہیں کرتا کہ اس کی بیوی دوسرے مرد کی طرف مسکرا کر بھی دیکھے۔

اس دن کے بعد سے جہانگیر تاجی کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کے لیے موقع کی تاک میں رہنے لگا۔ وہ اکثر راتوں کو اٹھ اٹھ کر اس کے کمرے میں جھانکتا۔ آخر ایک رات جب وہ سو رہا تھا کہ اچانک ایک کھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ دبے قدموں باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ تاجی باہر والے دروازے سے باہر نکل رہی تھی۔ اس کا خون کھول اٹھا۔ اس نے اپنی کلہاڑی پکڑی اور چادر لپیٹ کر تاجی کا تعاقب کرنے لگا۔

جہانگیر بڑی کامیابی سے تاجی کا تعاقب کرتا رہا۔ تاجی کھڈوں کے اندر غائب ہو گئی۔ جہانگیر محتاط انداز میں آگے بڑھتا گیا اور پھر اس جگہ پہنچ گیا جہاں سے کھڑے ہو کر میں نے جیلا کی لاش دیکھی تھی۔ اس نے اوپر سے دیکھا کہ تاجی ایک مرد کے ساتھ لگی بیٹھی تھی اور وہ دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ جہانگیر سمجھ گیا کہ تاجی یہاں بدکاری کی نیت سے رات کے اندھیرے میں اسے دھوکہ دے کر ایک غیر مرد کے پاس آئی ہے۔

تاجی اور جیلا کی یہ ملاقات موت کی ملاقات ثابت ہوئی۔

اس پر وہی پاگل پن سوار ہو گیا جو قتل سے پہلے ہر قاتل پر سوار ہوتا ہے۔ اس نے چادر کو منہ پر اچھی طرح لپیٹ کر ڈھاٹا سا باندھ لیا اور دبے قدموں نیچے اُتر گیا۔ اس نے اچانک وہاں پہنچ کر مرد پر کلہاڑی سے حملہ کیا۔ مرد نے کلہاڑی کا وار روکنے کی کوشش کی مگر کلہاڑی اس کے بازو کو زخمی کر گئی۔

اس کے بعد جو ہوا، وہ تاجی کی زبانی پہلے سنا چکا ہوں۔ تاجی وہاں سے بھاگ کر گھر پہنچ گئی تھی۔ جہانگیر خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ پھر اس نے صبح منہ اندھیرے کلہاڑی دھو کر رکھ دی۔

تاجی نے جہاں اس کے بازو پر کاٹا تھا، وہاں خاصی تکلیف تھی مگر وہ کسی کو دکھانے کی بجائے خود ہی اس پر گھی یا تیل لگاتا رہا۔ زخم خراب ہونے لگا مگر جہانگیر نے اس کو تاجی سے بھی چھپائے رکھا۔ پھر اتنی احتیاط کے باوجود اس دن تاجی کی نظر اس زخم پر پڑ گئی اور پھر وہ ساری بات سمجھ گئی اور تھانے آ گئی۔

یہاں میں نے جہانگیر سے کہا کہ تاجی نے بتایا تھا کہ وہ جب بھاگ کر گھر آئی تھی تو اس

نے تمہارے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو تم بستر پر سو رہے تھے جبکہ تمہارا کہنا ہے کہ تم تاجی کے بعد گھر پہنچے تھے۔

"تاجی گھبرائی ہوئی تھی۔" جہانگیر نے کہا۔ "یقیناً اس نے دروازے کو معمولی سا کھول کر اندر جھانکا ہوگا، اندھیرا بھی تھا۔ اس طرح اسے غلطی لگی ہوگی کہ میں بستر پر ہی سو رہا ہوں۔"

جہانگیر کے بعد میں نے تاجی کا بیان دوبارہ لیا۔ پھر اس کے بعد میں نے کیس تیار کر کے عدالت میں پیش کر دیا۔ میں نے کیس بہت مضبوط تیار کیا تھا اور کوئی کمزوری نہ رہنے دی تھی۔ عینی شاہد کے طور پر تاجی نے اپنے خاوند کے خلاف گواہی دی تھی لیکن جہانگیر کے بھائی نے بڑا قابل اور مہنگا وکیل کیا تھا۔ اس وکیل نے سارا زور فوری اشتعال ثابت کرنے پر لگا دیا اور وہ اس کوشش میں کامیاب بھی رہا۔

جج نے فوری اشتعال کا نکتہ تسلیم کر لیا اور جہانگیر کو بری کر دیا۔ جہانگیر نے بری ہونے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ تاجی کو طلاق دے دی اور اپنی غلطی تسلیم کر لی کہ اسے شادی کرنی ہی نہیں چاہئے تھی اور یہ اس کی بہت بڑی غلطی تھی۔

اس واقعے کے بعد باسو نے تاجی کے رشتے کے لیے پیغام بھجوایا مگر اس کے گھر والوں نے انکار کر دیا۔ باسو نے پیر صاحب کے سامنے یہ مسئلہ رکھا تو پیر صاحب نے تاجی کے گھر والوں کو حکم دیا کہ اگر وہ باسو کو رشتہ نہیں دیں گے تو ان کے گھر پر تباہی و بربادی نازل ہوگی اور وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔

تاجی کے گھر والے ڈر گئے۔ ویسے بھی وہ پیر صاحب کے حکم سے انکار کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔ تاجی کی شادی باسو کے ساتھ ہوگئی اور پھر ان کے کئی بچے بھی ہوئے۔

☆======☆======☆

پاگل خانے سے پاکستان تک

جرم و سزا اور تفتیش کی یہ کہانی اس لحاظ سے مختلف اور منفرد ہے کہ اس میں انسانی نفسیات کا پہلو قابلِ غور ہے۔ دیکھئے، ذہن کتنی بڑی قوت ہے اور پیار کیسے معجزے کر کے دکھا سکتا ہے۔

1959ء کی بات ہے، میں راولپنڈی کی مال روڈ پر اپنے کسی خیال میں سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔ ایوب خان مرحوم کے مارشل لاء کا پہلا سال تھا۔ یوں سمجھ لیں جیسے ابھی ابھی سیلاب آیا ہو اور اتنے جوش و خروش میں ہو جیسے راستے میں آنے والی تمام بستیاں بہا لے جائے گا۔ وہ مارشل لاء ایک دہشت تھی جو سارے ملک پر طاری کر دی گئی تھی۔ میں سروس سے ریٹائرڈ ہو چکا تھا اور مارشل لاء والوں نے مجھے گھر سے بلا کر مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے سکیورٹی سٹاف میں رکھ لیا تھا۔ انہوں نے جب میری فرض شناسی اور صلاحیتیں دیکھیں تو ایک اونچا رُتبہ دے دیا جسے خفیہ رکھا گیا۔ اس سلسلے میں یعنی اپنے فرائض کے سلسلے میں کئی بار میری ملاقات ایوب خان مرحوم کے ساتھ تنہائی میں ہوئی۔

وہ ایک الگ داستان ہے جو میں کبھی بھی نہیں سناؤں گا کیونکہ اس میں بڑے بڑے نھنے خان لیڈر اور کچھ دیگر حضرات بے نقاب ہوتے ہیں۔ مجھے کسی کو بے نقاب کر کے نمبر بنانے کا کوئی شوق نہیں اور یہ بات بھی ہے کہ مجھے اس آخری عمر میں کسی نامعلوم قاتل کی گولی سے مرنے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ آپ اپنی دلچسپی راولپنڈی کی مال روڈ پر ہی رکھیں جہاں میں سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔

''ملک صاحب السلام علیکم۔'' ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے پہلے سر اٹھایا پھر رکا۔ میرے سامنے بڑے قیمتی پینٹ کوٹ میں ملبوس ایک آدمی کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کا لباس، اس کی ٹائی اور اس کا چہرہ مہرہ بتاتا تھا کہ یہ شخص سرکاری افسر ہی ہو سکتا ہے۔ اس کی مسکراہٹ کے جواب میں مجھے بھی مسکرانا پڑا۔

''معافی چاہتا ہوں آپ کو راہ جاتے روک لیا ہے۔'' اس خوش پوش اور خوش وضع شخص نے کہا۔ ''مجھے غلطی نہیں لگ سکتی۔ آپ ملک احمد یار خان صاحب ہیں۔''

اس نے اپنا دایاں ہاتھ آگے کیا جو میں نے گرم جوشی سے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کہا کہ اس نے مجھے ٹھیک پہچانا ہے یہ بھی کہا کہ میں اسے نہیں پہچان سکا۔ اس نے مشرقی پنجاب کے ایک بڑے قصبے کا نام لیا اور مجھے یاد دلایا کہ چودہ پندرہ سال پہلے میں اس قصبے کے تھانے کا ایس ایچ او ہوا کرتا تھا۔

مجھے وہ قصبہ بھی یاد آ گیا اور یہ تو میں بھول ہی نہیں سکتا تھا کہ میں وہاں ایس ایچ او رہ چکا ہوں۔ سارے ہندوستان کے تھانوں کے انچارج سب انسپکٹر ہوا کرتے تھے۔ کبھی یوں بھی ہوتا تھا کہ کسی بڑے تھانے کا انچارج خصوصی وجوہات کے پیشِ نظر کسی انسپکٹر کو بنا دیا جاتا تھا۔ میں اس وقت انسپکٹر تھا اور یہ تھانہ مجھے دیا گیا تھا۔ یہ کوئی دلچسپ بات نہیں کہ کن وجوہات کی بنا پر مجھے یہ تھانہ دیا گیا تھا۔ بہرحال کچھ وجوہات تھیں، بات سنانے والی یہ ہے کہ میں اس شخص کو پہچان نہ سکا۔ سروس میں ایسے ہزاروں لوگوں سے واسطہ پڑتا رہا ہے۔ ان سب کے چہرے یاد رکھنا ممکن نہیں۔

اس خوش پوش شخص نے جس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی، جانفزا مسکراہٹ سے اپنا نام بتایا اور مختصراً ایک قتل کی واردات سنائی۔ مجھے پھر بھی یہ شخص یاد نہ آیا۔ ہم اس وقت فلیٹی ہوٹل کے بالکل سامنے کھڑے تھے۔ اس شخص نے میرا بازو پکڑا اور کہنے لگا کہ وہ مجھے کھانا کھلانا چاہتا ہے اور میں انکار نہ کروں۔ میں نے انکار تو کیا جو محض رسمی تھا لیکن اس کے پُرزور اصرار کے آگے سر جھکانا پڑا۔ حقیقت یہ ہے کہ دن کا ایک بج چکا تھا اور مجھے بھوک لگی ہوئی تھی اور میں نے آگے جا کر صدر بازار کے کسی درمیانہ ہوٹل میں کھانا کھانا تھا۔ وہ مجھے فلیٹی ہوٹل میں لے گیا۔

اب تو فلیٹی ہوٹل کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہی، میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں اس وقت بڑی بڑی شخصیتیں اسی ہوٹل میں قیام کیا کرتی تھیں۔ قائد اعظم بھی اسی ہوٹل میں ٹھہرتے یا کھانا کھایا کرتے تھے۔ میرا میزبان مجھے فلیٹی ہوٹل میں لے گیا، بڑے پُرتکلف کے کھانے کا آرڈر دیا اور قتل کی وہ واردات سنانے لگا۔

آخر مجھے یہ کیس یاد آ گیا اور یہ بھی یاد آیا کہ اس کے کچھ اشارے میں نے اپنی ڈائری میں لکھے ہوئے ہیں...... کھانے کے بعد ہم جدا ہوئے تو میں نے سوچا کہ گاؤں جاؤں گا اور ڈائری میں یہ کیس پڑھوں گا۔ میں نے ایسے اشارے بہت سے کیسوں کے لکھے ہوئے ہیں کہ وہ جب سامنے آتے ہیں تو ہر کیس کی ہر ایک تفصیل یاد آ جاتی ہے۔ پھر یوں ہوا کہ میں

تین مہینوں تک گاؤں نہ جا سکا۔ ڈائریاں گاؤں میں رکھی ہوئی تھیں۔

اس شخص نے مجھے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ جب گاؤں ایک دو دنوں کے لیے گیا تو ڈائریوں کی ورق گردانی کر کے یہ کیس نکالا اور جب میں پڑھنے لگا تو میری آنکھوں کے آگے ایک فلم چل پڑی۔ 1959ء میں تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میری کہانیاں کسی رسالے میں کبھی چھپا بھی کریں گی اور کتابیں بھی چھپ کر مارکیٹ میں آئیں گی اور مقبولیت حاصل کریں گی۔ وقت گزرتا گیا اور چند سالوں بعد میں اس نوکری سے بھی فارغ ہو گیا اور پھر اپنی تفتیشی کہانیاں لکھنے کا سلسلہ چل پڑا۔

میں جس کیس کا حوالہ دے رہا ہوں یہ پھر میرے ذہن سے نکل گیا۔ تقریباً ڈیڑھ مہینہ پہلے کا واقعہ ہے کہ اس سے ملتی جلتی واردات راولپنڈی کے ایک محلے میں ہو گئی۔ مجھے اچانک یہ کیس یاد آ گیا اور یہ بھی کہ 1959ء میں اس کیس کا ایک اہم کردار مجھے ملا تھا۔ میں نے ڈائری نکالی اور یہ کیس نکال کر پڑھنے لگا تو اس کی ذرا ذرا سی بات بھی یاد آ گئی اور میں نے یہ تفتیشی کہانی کاغذوں پر بکھیر دی۔ اتنی لمبی تمہید کی معافی چاہتا ہوں، آئیے، اب اصل کہانی سن لیجئے۔

ایک بھائی پاگل

جس قصبے کا ذکر ہو رہا ہے وہ مشرقی پنجاب کی مشرقی سرحد پر تھا۔ اب تو سنا ہے بہت بڑا شہر بن گیا ہے۔ یہ سکھوں کی اکثریت کا علاقہ ہے لیکن اس قصبے میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً اتنی ہی تھی جتنی سکھوں کی تھی اور کچھ آبادی ہندوؤں کی بھی تھی۔ علاقہ زرخیز تھا۔ قصبے میں مسلمان زمیندار بھی رہتے تھے اور ان میں اکثر مسلمان گھرانوں میں تعلیم بھی تھی۔

ایسا ہی ایک مسلمان امیر کبیر زمیندار میرے پاس تھانے میں آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر غم کا بڑا گہرا تاثر دیکھ کر میں جان گیا کہ کوئی اچھی خبر نہیں لایا۔ میرے منہ کی طرف دیکھے جا رہا تھا جیسے اس کی زبان ہی نہ ہو۔ میں نے پوچھا خیریت؟...... اس نے بتایا کہ اس کا جوان بیٹا قتل ہو گیا ہے۔ میرے منہ سے مشین گن کی طرح سوال نکلے، کہاں، کب، کیسے وغیرہ۔

اس نے یہ واردات اس طرح سنائی کہ علی الصباح ابھی سویرا دھندلا ہی تھا کہ اس شخص کو اپنی بیوی کی چیخ سنائی دی۔ یہ دوڑتا باہر نکلا تو دیکھا بیوی سیڑھیوں کے پاس کھڑی ہے اور اس کا بیٹا اس طرح گرا پڑا ہے کہ اس کا سر اور کندھے پہلی سیڑھی پر تھے اور باقی جسم فرش پر۔

میاں بیوی نے بیٹے کو مل کر اٹھایا اور اندر کمرے میں پلنگ پر ڈالا۔ باپ نے نبض دیکھی پھر دل پر ہاتھ رکھا۔ نبض بھی خاموش اور دل بھی خاموش تھا۔ دونوں کا خیال یہ تھا کہ یہ سیڑھیوں سے گرا ہے۔ کسی وجہ سے اوپر چلا گیا ہو گا اور کسی طرح گرا اور سیدھا نیچے آ گیا اسی لیے آدھا پہلی سیڑھی پر اور باقی آدھا فرش پر پڑا تھا۔

ماں باپ کیسے یقین کر لیتے کہ یہ مر گیا ہے۔ یہ باپ جب مجھے یہ رپورٹ دے رہا تھا اس وقت ساڑھے دس یا پونے گیارہ بجے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے پوچھا کہ وہ اتنی دیر سے تھانے کیوں آیا ہے؟ اس نے بتایا کہ وہ مان ہی نہیں سکتا تھا کہ اس کا بیٹا مر چکا ہے اور یہ تو وہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ بیٹا قتل ہوا ہے۔ وہ بیٹے کو بے ہوش سمجھتا رہا اور ڈاکٹر کے گھر کو دوڑ پڑا۔

وہ ہندو ڈاکٹر تھا جو سرکاری ہسپتال کا سول سرجن کہلاتا تھا۔ اُس زمانے میں ڈاکٹروں کی آج والی بھرمار نہیں ہوتی تھی۔ قصبے میں ایک تو یہ سول سرجن تھا یا دو ڈاکٹر اور تھے۔ اس ڈاکٹر نے تیار ہونے میں خاصی دیر لگا دی اور پھر اس شخص کے گھر گیا۔

ڈاکٹر نے نبض دیکھتے ہی کہہ دیا کہ یہ تو مر چکا ہے۔ پھر ڈاکٹر نے جسم کی ہر طرف سے دیکھا اور سر کو خاص طور پر چیک کیا۔ اسے کہیں بھی کوئی چوٹ یا خراش نظر نہ آئی۔ جب اس نے مرنے والے کی گردن دیکھی تو اس کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے کہ اس کا تو گلا گھونٹا گیا ہے۔

گلا گھونٹنے کے نشان صاف نظر آ جایا کرتے ہیں۔ یہ تو ڈاکٹر تھا جس کے لیے موت کا باعث سمجھنا کوئی مشکل نہ تھا۔ ڈاکٹر یہ فیصلہ دے کر چلا گیا لیکن باپ کی ذہنی حالت ایسی بگڑ گئی کہ کچھ فیصلہ نہ کر سکا کہ اس ڈاکٹر کی تشخیص مان لے یا کیا کرے۔ مرے ہوئے بیٹے کی ماں وہیں موجود تھی۔ اس کی آہ و بکا اور چیختے چلاتے بَین باپ کو اور زیادہ پاگل کر رہے تھے۔ ماں کہتی تھی کہ دوسرے ڈاکٹر کو بلا لاؤ۔ باپ لڑکھڑاتے قدموں سے دوسرے ڈاکٹر کو ساتھ لانے کے لیے چلا گیا۔ وہ قصبے کے دوسرے سرے پر رہتا تھا۔ اس نے آتے آتے خاصا وقت لگا دیا۔ اس نے بھی سول سرجن کی طرح لاش کو دیکھا اور گردن کو دیکھ کر سول سرجن کی تائید کر دی کہ اس کا گلا گھونٹا گیا ہے اور سیڑھیوں سے نہیں گرا۔ ڈاکٹر یہ کہہ کر چلا گیا۔

اتنی دیر میں محلے کے لوگ اکٹھے ہونے شروع ہو گئے تھے۔ عورتیں صحن میں ہجوم کر کے آ گئیں اور آدمی جو بھی آتا تھا وہ سب سے پہلے مقتول کو دیکھتا اور اپنی رائے دیتا تھا۔ اس طرح

باپ کا وقت ضائع ہوتا رہا اور عقل مند قسم کے دو تین آدمیوں کے کہنے پر وہ تھانے آ گیا اور اس وقت ساڑھے دس بج چکے تھے۔

دو ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ یہ قتل کا کیس ہے اور اس کا گلا گھونٹا گیا ہے اس لیے میں نے فوراً تسلیم کر لیا کہ یہ قتل کی واردات ہے۔ فوراً باپ کے نام سے ایف آئی آر تحریر کروائی اور اپنے ضروری عملے کو ساتھ لے کر میں مقتول کے باپ کے ساتھ چل پڑا۔ راستے میں پوچھا کہ اس کی یا اس کے بیٹے کی کسی کے ساتھ دشمنی ہوگی۔ اس نے وثوق سے بتایا کہ کسی کے ساتھ دشمنی نہیں اور بیٹا تو بڑا ہی شریف لڑکا تھا۔ میں نے سوچا کہ ہر باپ اپنے بیٹے کو خواہ وہ مقتول ہو یا قاتل، شریف ہی کہا کرتا ہے۔ یہ تو مجھے دوسروں سے اور اپنے ذرائع سے معلوم کرنا تھا کہ اس خونی ڈرامے میں کون شریف اور کون بدمعاش ہے۔ بہر حال میں راستے میں باپ سے ضروری باتیں پوچھتا گیا لیکن اس کے منہ سے کام کی کوئی بات نہ نکلی۔

قصبے کی ایک کشادہ گلی میں اس کا کم و بیش ایک کنال میں پھیلا ہوا مکان تھا۔ ایسے مکانوں کو میں اکثر حویلی لکھا کرتا ہوں۔ اس کے اوپر بھی ایک منزل تھی۔ اس طرح یہ حویلی چوبارہ بن گیا تھا۔ آج کل کوٹھیوں کی باتیں ہوتی ہیں۔ اس دور میں آدمی کی حیثیت حویلی سے جانی پہچانی جاتی تھی۔ وہ بڑی خوبصورت حویلی تھی جس سے اس شخص کی امیرانہ حیثیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ وہ مجھے اندر لے گیا۔

میں نے جاتے ہی تمام عورتوں کو صحن سے ہٹا دیا اور کہا کہ کوئی باہر کا آدمی یا عورت قریب نہ رہے۔ صحن سے سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں۔ ان سیڑھیوں میں موڑ نہیں تھا بلکہ بالکل سیدھی تھیں۔

انہوں نے لاش اٹھا کر اندر پلنگ پر ڈال دی تھی۔ میں نے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ لاش کہاں اور کس طرح پڑی تھی، مقتول کے باپ سے کہا کہ وہ اس پوزیشن میں ہو کر مجھے دکھائے۔ باپ فوراً اس پوزیشن میں ہو گیا جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ پھر میں کمرے میں لاش کو دیکھنے گیا۔ سب سے پہلے گردن دیکھی جہاں نیلے نشان بتا رہے تھے کہ گلا گھونٹا گیا ہے۔ نشانات سے صاف پتہ چلتا تھا کہ گلا ہاتھ سے گھونٹا گیا ہے۔ رسی سے گلا گھونٹا جائے یا کوئی کپڑا مروڑ کر اس سے گلا گھونٹا جائے تو پھر نشان مختلف ہوتے ہیں۔ دو ڈاکٹر لاش کے پورے جسم کا معائنہ کر چکے تھے اس لیے میں نے یہ تردد نہ کیا۔ ڈاکٹروں کی رائے میری رائے سے زیادہ قابلِ اعتماد تھی۔ یقینی طور پر یہ قتل کی واردات تھی۔

میں نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی۔ صحن میں کھڑے ہو کر حویلی کو دیکھا۔ چاروں طرف کمرے ہی کمرے تھے اس لیے یہ کہا ہی نہیں جا سکتا تھا کہ قاتل دیوار پھاند کر اندر آیا تھا۔ میں نے پوچھا کہ ڈیوڑھی کا دروازہ بند تھا یا زنجیر اُتری ہوئی تھی؟ باپ نے بتایا کہ جب وہ ڈاکٹر کو بلانے گھر سے نکلا تھا تو باہر والے دروازے کی اندرونی زنجیر چڑھی ہوئی تھی اور اس کے کھلنے کا امکان تھا ہی نہیں۔

میں نے خود ڈیوڑھی میں جا کر دروازہ بند کیا، زنجیر چڑھائی، کواڑ اندر کو کھینچے تو یقین ہو گیا کہ باہر سے کسی طریقے سے بھی یہ زنجیر نہیں اتاری جا سکتی۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ قاتل اوپر سے آیا تھا۔ میں پھر صحن میں چلا گیا اور مقتول کے باپ کی رہنمائی میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا۔ پرانے محلوں کے مکان آپس میں ملے ہوتے ہیں اور چھتوں سے آدمی ایک مکان سے دوسرے مکانوں تک بڑے آرام سے آ جا سکتا ہے۔

میں جب اوپر گیا تو اوپر دو یا غالباً تین کمروں کا چوبارہ دیکھا۔ آگے صحن کے طور پر کھلی چھت تھی۔ ایک کمرے کے دروازے میں ستائیں اٹھائیس سال عمر کا ایک خوب رُو جوان کھڑا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ ایک تھانے دار گھر میں آیا ہے اور اس کے ساتھ گھر کا سربراہ بھی ہے تو بھی اس آدمی نے کوئی ذرا سی بھی حرکت نہ کی نہ اس کے چہرے پر کوئی تبدیلی آئی۔ وہ بالکل ہی لاتعلق کھڑا رہا۔ میں نے یہی سمجھا تھا کہ اس گھر کا فرد نہیں، مہمان ہوگا یا ہو سکتا ہے کرایہ دار ہو پھر بھی اسے کسی نہ کسی ردِعمل کا اظہار کرنا چاہیئے تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔

''میرا بڑا بیٹا ہے۔'' مقتول کے باپ نے کہا۔ ''اوپر اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔''

میں یہ سن کر حیران رہ گیا کہ یہ مقتول کا بڑا بھائی ہے اور اس طرح لاتعلق ہو کر اوپر کھڑا ہے جیسے اسے کچھ خبر ہی نہیں کہ نیچے کیا قیامت آئی ہوئی ہے۔ وہ بچہ ہوتا تو میں بچہ ہی سمجھ کر اسے نظر انداز کر دیتا لیکن وہ اتنا جوان تھا کہ اسے باپ کا ایک بازو سمجھنا غلط نہ تھا۔ میں نے اپنے اخلاق کے مطابق اس سے ہاتھ ملانے کو ہاتھ آگے کیا۔ میرے اور اس کے درمیان دو قدموں کا ہی فاصلہ تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ آگے کرنے کی بجائے میرے ہاتھ کو یوں حیرت سے دیکھا جیسے میں اسے کچھ دے رہا ہوں یا اس سے کچھ لینا چاہتا ہوں۔

''سلام کر انسپکٹر صاحب کو!'' باپ نے اسے ذرا ڈانٹ کر کہا۔ ''آگے بڑھ کر ہاتھ ملا۔''

اس نے ہاتھ تو آگے کر دیا لیکن عجیب پاگلانہ انداز سے ہنسا اور میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کا ہاتھ بے جان تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ دانستہ زور سے دبایا۔ وہ یک لخت سنجیدہ ہو گیا اور جب میں نے اس کا ہاتھ چھوڑا تو وہ پھر ہنسا اور پھر یکلخت اس کے چہرے پر سنجیدگی آ گئی۔ میں آگے بڑھ گیا۔

"میری قسمت دیکھیں۔" باپ نے بڑی ہی مغموم آواز سے کہا۔ "بڑا بیٹا ذہنی طور پر معذور ہے اور اس سے چھوٹا قتل ہو گیا ہے۔"

یہ تو میں سمجھ ہی گیا تھا کہ یہ جوان دماغی طور پر معذور ہے۔ ایسے آدمی کو جھلا کہا کرتے ہیں اور بعض لوگ کملا بھی کہتے ہیں لیکن شریفانہ اور باعزت الفاظ میں ذہنی مریض کہا جاتا ہے۔ میں نے باپ سے یہ نہ پوچھا کہ یہ اس کا پیدائشی نقص ہے یا کسی اور وجہ سے بعد میں پیدا ہوا تھا۔ اس وقت میرے ذہن پر یہ سوال آسیب کی طرح طاری تھا کہ قاتل آیا کس طرف سے تھا۔

دلہن سے نوکرانی زیادہ خوبصورت تھی

میرے سامنے کھلی چھتیں تھیں۔ میں نے ایک طرف والی فصیل جا کر دیکھی۔ اس طرف ایک گلی تھی اور چھت اتنی اونچی کہ ادھر سے کسی کے اوپر آنے کا امکان نہیں تھا۔ حویلی کی چھت پچھواڑے والے مکان کی چھتوں سے ملتی تھی اور ان کے درمیان اونچی فصیل تھی جو کم و بیش چھ فٹ اونچی تھی۔ ایک جوان آدمی اسے پھاند سکتا تھا۔ درمیان میں سوراخ چھوڑے ہوئے تھے جیسے عام طور پر فصیلوں میں ہوتے ہیں۔ کسی بھی سوراخ میں قدم جما کر اوپر چڑھا جا سکتا تھا۔

میں اسی طرح فصیل پر چڑھا۔ اوپر گرد تھی اور دو تین جگہوں پر ایسے رگڑ کے نشان تھے جو صاف ظاہر کرتے تھے کہ اس کے اوپر سے کوئی آیا بھی ہے اور گیا بھی ہے۔ وہیں سے آگے کو دیکھا، چار پانچ گھروں کی چھتیں آپس میں ملی ہوئی تھیں اور دو جگہوں پر فصیلیں تھیں جو زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ میں آگے تو نہ گیا لیکن یہ میرے دماغ میں آئی کہ کسی بھی گھر کی طرف سے کوئی آدمی اوپر آ سکتا ہے۔ واردات والی حویلی کی چھت کچی یعنی لپائی والی نہیں تھی بلکہ اینٹوں کا فرش تھا۔ اس پر کسی کھرے کا ملنا ناممکن تھا۔

میں یہ سوچ رہا تھا کہ مقتول رات اپنے کمرے سے باہر کیوں نکلا تھا اور وہ سیڑھیوں پر کیوں قتل ہوا۔ ایک خیال یہ آیا کہ کوئی چور نیچے اُترا ہو گا اور مقتول پیشاب کے لیے اٹھا اور

چور کے ساتھ اس کا آمنا سامنا ہو گیا۔ چور نے اپنے بچاؤ کے لیے مقتول کی گردن دونوں ہاتھوں میں پکڑی اور اسے پھینک کر پھر سیڑھیاں چڑھ گیا۔ چور کا ارادہ قتل کا نہیں ہو گا۔

اس کے ساتھ ہی یہ خیال آ گیا کہ اتنے بڑے اور اتنے امیرانہ گھر میں کوئی چور اکیلا نہیں آیا کرتا۔ اُس دور میں عموماً یوں ہوتا تھا کہ ڈاکہ پڑتا تھا اور ڈاکوؤں کی رہنمائی کوئی گھر بھیدی کرتا تھا۔ البتہ ایک خیال اور آ گیا۔ میں نے ڈیوڑھی میں ایک چھترا بندھا دیکھا تھا۔ پندرہ سولہ دنوں بعد بقرعید تھی۔ یہ چھترا یقیناً قربانی کے لیے پالا جا رہا تھا۔ آج کل بھی آپ نے دیکھا اور سنا ہو گا کہ قربانی کے دنبے اور بکرے کبھی چوری بھی ہو جاتے ہیں۔ مجھے شک یہ ہوا کہ کوئی چور چھترا کھولنے اوپر سے آیا اور یہ کہ چھترا کھول کر ڈیوڑھی کے دروازے سے نکل جائے گا لیکن مقتول سے آمنا سامنا ہو گیا اور اس طرح چوری کی معمولی سی واردات قتل کی واردات بن گئی۔

یہاں میں تھوڑی سی وضاحت پیش کروں گا۔ یہ جو میں نے کہا ہے کہ چوری کی معمولی واردات، اس کا مطلب یہ نہ لیں کہ معمولی سی چوریاں کرنے والا وارداتیا کسی کمرے میں گھس کر کوئی ٹرنک یا کوئی قیمتی چیز اُٹھا لائے گا۔ معمولی وارداتیا یوں واردات کیا کرتا تھا کہ کسی بڑے گھر میں کسی طرح رات کو چلا گیا اور صحن میں رسی پر لٹکے ہوئے دو چار کپڑے دیکھے تو وہی اٹھا لایا یا باورچی خانہ کھلا ملا تو وہاں سے ایک دو دیگچے ہی اٹھا لے گیا اور اگلے روز بیچ کر چند روپے کما لئے۔

میں اسی گھر کی بیٹھک میں بیٹھ گیا اور مقتول کے باپ کو اپنے پاس بٹھایا۔ وہ بے چارہ روتا زیادہ اور بولتا کم تھا۔ میں نے اسے کہا کہ جب تک وہ مجھے کوئی ٹھوس اشارہ نہیں دے گا، میں قاتل تک نہیں پہنچ سکوں گا۔ حیرت والی بات یہ بھی تھی کہ کسی دشمن نے مقتول کو قتل کیا تھا تو باہر کہیں کیوں نہ کر دیا۔ یہ سوچ بھی آئی کہ گھر کے ہی کسی فرد نے اسے قتل نہ کر دیا ہو!

مقتول کے باپ نے بتایا کہ مقتول شادی شدہ تھا اور اس کی چند مہینوں کی ایک بچی بھی تھی۔ اس کی بیوی کچھ دنوں سے میکے گئی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ مقتول کی بیوی سے بھی پوچھ گچھ کروں گا۔ مجھے اُمید ہوئی کہ بیوی جانتی ہو گی کہ مقتول کی باہر کس کے ساتھ دشمنی تھی۔ میں نے مقتول کے باپ سے کہا کہ اس کی بہو تو اطلاع ملتے ہی آ گئی ہو گی۔

"نہیں!" باپ نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا۔ "نہیں آئی اور شاید نہ ہی آئے۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آئے گی؟...... باپ نے بتایا کہ سسرال کے

ساتھ مقتول کی اچھی خاصی چپقلش چل رہی تھی۔ وہ اس لیے کہ مقتول کو اپنی بیوی پسند نہیں تھی۔ شادی کو دو سال ہو گئے تھے، ان کی ایک دن بھی آپس میں نہیں بنی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر دونوں لڑتے جھگڑتے تھے۔

میں نے وجہ پوچھی کہ مقتول کو بیوی کیوں اچھی نہیں لگتی تھی، کیا وہ بدصورت ہے؟ باپ نے بتایا کہ بدصورت تو نہیں لیکن خوبصورت بھی بالکل نہیں۔ اس کا رنگ سانولا ہے اور وہ گھریلو قسم کی عورت ہے اور چاؤ چونچلے نہیں کرتی۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ مقتول کی عمر چوبیس پچیس سال تھی۔ اس عمر میں سنجیدگی اور پختگی پوری طرح بیدار نہیں ہوئی ہوتی۔ مقتول گوری چٹی اور شوخ سی بیوی چاہتا ہو گا۔ بہرحال اس وقت یہ دیکھنا تھا کہ قاتل کو پکڑنے کے لیے میں کیا چاہتا ہوں۔

باپ نے بتایا کہ مقتول نے بیوی کو مارنا پیٹنا بھی شروع کر دیا تھا۔ بیوی نے بیٹی کو جنم دیا تو مقتول اور زیادہ بگڑ گیا۔ کہتا تھا اسے بیٹا پیدا کرنا چاہئے تھا۔ اس حقیقت کو تو وہ تسلیم ہی نہیں کرتا تھا کہ یہ تو اللہ کی دَین ہے، بیٹی دے دیا بیٹا۔

باپ نے لمبی چوڑی تفصیلات نہ سنائیں لیکن میں سارا فتور سمجھ گیا۔ مقتول نے طلاق تک نوبت پہنچا دی تھی لیکن باپ راستے میں حائل تھا۔ میں اس فتنہ اور فساد کو اپنے زاویے سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے پوچھا کہ مقتول کے سسر یا بھائیوں نے کبھی کوئی دھمکی دی تھی یا ان کا رویہ اور ردِعمل کیا تھا۔ باپ نے جواب دیا کہ مقتول کا سسر تو گلے شکوے کرتا اور مقتول کا باپ اسے راضی کر لیتا تھا لیکن مقتول کے دو سالے تھے جو دھمکیوں کی زبان میں بات کرتے تھے۔

''میری ایک بات ذہن میں رکھ چوہدری!'' میں نے کہا۔ ''میں قتل کی تفتیش کر رہا ہوں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ میاں بیوی کے درمیان جو چپقلش تھی اور سسرال کا جو رویہ تھا، کیا یہ قتل تک پہنچ سکتا تھا؟ کیا یہ معاملہ اتنا سنگین ہو گیا تھا؟''

''اس کا فیصلہ تو آپ ہی کر سکتے ہیں۔'' باپ نے کہا۔ ''میں آپ کو حالات بتا رہا ہوں۔ میری بہو کا بڑا بھائی خود بھی غنڈہ ہے اور غنڈے ہی اس کے دوست ہیں۔ وہ کہتا پھرتا ہے کہ طلاق دے کر تو دیکھیں، اس شخص کو قبر میں اتار دوں گا۔''

میں نے مقتول کے اس سالے کا نام پوچھا۔ باپ نے نام بتایا تو مجھے کچھ اطمینان ہوا کیونکہ اس شخص کو میں نہایت اچھی طرح جانتا تھا۔ اچھی خاصی سلام دعا بھی تھی۔ اس کا اصل نام کچھ اور تھا، میں اسے رضا لکھوں گا۔ اس کے ذریعے میں اس خاندان کی حیثیت وغیرہ سے

بھی واقف تھا۔ یہ بھی مسلمانوں میں ایک امیر زمین دار خاندان تھا۔ رضا کا باپ اور چھوٹا بھائی کپڑے کا ہول سیل کاروبار کرتے تھے اور رضا زمینوں کی دیکھ بھال اور مزارعین کی نگرانی کرتا تھا۔

رضا جس قسم کا غنڈہ تھا وہ میں بیان کرتا ہوں۔ ایک تو گھٹیا قسم کے جرائم پیشہ آدمی ہوتے ہیں جنہیں ہم غنڈہ اور بدمعاش کہتے ہیں لیکن ایک قسم معزز غنڈوں کی ہوتی ہے۔ ایسی قسم آج کل زیادہ دیکھنے میں آتی ہے۔ یہ حیثیت والے لوگ ہوتے ہیں۔ اسمبلیوں کے ممبر بھی بن جاتے ہیں اور ان کا میل جول اونچے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اصل میں وہ غنڈے ہوتے ہیں جس طرح آج کل قبضہ گروپ مشہور ہے اور غنڈہ گردی کے ذریعے کسی کو دھمکانا، اپنا کام نکلوانا ایک رواج بھی بن گیا ہے اور کاروبار بھی۔ رضا ایسا ہی معزز قسم کا غنڈہ تھا جس کے ہاتھ میں کئی غنڈے اور بدمعاش تھے۔ پولیس والے اسے عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

رضا قتل کی واردات کر بھی سکتا تھا اور کروا بھی سکتا تھا لیکن مجھے یہ دیکھنا تھا کہ معاملہ کیا اتنا سنگین ہو گیا تھا کہ اس کا علاج قتل ہی ہوتا یا انتقام قتل کر کے ہی لیا جانا تھا؟...... یہ تو میں نے مخبروں سے معلوم کر ہی لینا تھا۔ کسی بھی مخبر نے یقینی طور پر یہ تو کہنا ہی نہیں تھا کہ یہ قتل رضا نے کیا یا کروایا ہے، مخبروں نے مجھے کچھ باتیں بتانی تھیں اور آگے میری عقل تھی جس نے ان باتوں سے اپنے مطلب کی بات نکالنی تھی۔

رضا کے خلاف دل میں شک رکھ کر میں نے مقتول کے باپ سے سوال وجواب کا سلسلہ شروع کر دیا۔ میں بال کی کھال اتارنے کی کوشش میں تھا یعنی میں بہت ہی باریک اور بظاہر نہایت معمولی باتیں بھی پوچھ رہا تھا مگر میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ مقتول کا باپ ہر بات کا جواب نہیں دے سکتا، دینا نہیں چاہتا یا شاید یہ صدمے کا اثر تھا کہ وہ پوری طرح تعاون نہیں کر رہا تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اسے اس صدمے کی حالت میں مزید پریشان نہ کروں۔

میں نے اس سے پوچھا کہ اس کے مقتول بیٹے کے سسرال کہاں کے رہنے والے ہیں...... اس نے جو جواب دیا اس سے میرا ذہن کچھ اور روشن ہو گیا۔ مقتول کے سسرال اسی محلے میں رہتے تھے۔ پہلو والی گلی میں اس حویلی سے چوتھا یا غالباً تیسرا گھر تھا۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ حویلی کے پچھواڑے دور تک جتنے مکان ہیں ان کی چھتیں حویلی کی چھت سے ملی ہوئی ہیں۔ میں اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا اور باپ سے کہا کہ چلو پھر اوپر چلتے ہیں۔

میں باپ کو ساتھ لے کر اوپر چھت پر چلا گیا اور اب کرسی قریب رکھوا کر میں فصیل پر چڑھا اور مقتول کے باپ کو بھی اوپر چڑھایا اور پھر ہم دونوں پچھواڑے والے مکان کی چھت پر اُتر گئے۔ وہاں سے اگلی چھتوں پر گئے۔ آگے ایک اور فصیل آئی جو زیادہ اونچی نہیں تھی۔ وہاں سے باپ نے میرے کہنے پر مقتول کے سسرال کا گھر دکھایا۔

میں وہاں سے واپس آ گیا۔ اب میں اس سوچ میں اُلجھ گیا کہ رضا بڑی آسانی سے چھتوں پر چلتا مقتول کے گھر اُتر سکتا تھا۔ سیڑھیوں کا دروازہ کھلا رکھا جاتا تھا کیونکہ مقتول کا بڑا بھائی بیوی کے ساتھ اوپر والی منزل میں رہتا تھا۔ میرے ذہن میں جرم کا نقشہ یہ بنا کر رضا اوپر سے مقتول کے پاس آیا ہو گا اور کمرے میں بیٹھ کر ان کے درمیان کچھ باتیں ہوئی ہوں گی۔

رضا قتل کی نیت سے آیا ہوتا تو مقتول کو کمرے میں ہی گلا دبا کر مار سکتا تھا لیکن ان میں کچھ تلخ کلامی ہوئی ہو گی اور رضا غصے میں اٹھ کر نکلا اور جب سیڑھیاں چڑھنے لگا تو مقتول نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہو گی جس نے رضا کو مشتعل کر دیا اور اس نے مقتول کا گلا گھونٹا اور وہیں پھینک کر دبے پاؤں اوپر چلا گیا اور اپنے گھر جا پہنچا۔

میں نے مقتول کے باپ سے پوچھا کہ رضا شام کے بعد مقتول کے پاس آیا تھا؟......

باپ نے کہا کہ اسے معلوم نہیں۔ شاید نہیں آیا۔ میں نے کچھ اور باتیں پوچھیں تو دیکھا کہ باپ گول مول سی باتیں کرنے لگا تھا۔ میں نے اسے اٹھا دیا اور کہا کہ اپنی بیوی کو میرے پاس بھیج دے۔

مقتول کی ماں اپنے سینے پر آہستہ آہستہ ہاتھ مارتی اور بَین کرتی میرے پاس آئی۔ میں نے اسے بٹھایا اس نے پہلی بات روتے ہوئے یہ کہی۔ ”کلموئی ڈائن میرے بیٹے کو کھا گئی ہے۔“ پھر اس نے اپنے خاوند کو سنانا شروع کر دیا پھر بولی۔ ”میں چوہدری سے کہتی تھی کہ اس کلموئی کو کہاں سے لے آئے ہو۔ تھانے دار صاحب! آپ نے میرا بیٹا مرا ہوا دیکھا ہے۔ کیا یہ خوبصورت جوان نہیں تھا؟ باپ اس کے لیے جو دلہن لایا وہ بھی دیکھ لینا۔ اس سے تو میری نوکرانی زیادہ خوبصورت ہے۔ میرا یہ چوہدری خاوند تو اپنی چوہدراہٹ میں ہی مگن رہتا ہے۔ اسے کوئی ہوش نہیں کہ گھر کا حال احوال بھی دیکھ لیا کرے۔“

اس عورت کی اس بات سے میں سمجھ گیا کہ مقتول کا باپ کیوں گول مول سے جواب دیتا تھا۔ اسے گھر کے حالات سے دلچسپی ہی نہیں تھی۔ یہ عورت جذبات کی ماری بولتی ہی چلی

جا رہی تھی۔ آخر ماں تھی، اس کا جوان شادی شدہ بیٹا قتل ہو گیا تھا لیکن میں یہ باتیں سننے نہیں آیا تھا۔ میں نے اسے یہ کہہ کر چپ کرایا کہ مجھے ایسی باتیں بتائے کہ میں اس کے بیٹے کے قاتل کو پکڑوں اور جلدی پھانسی چڑھا دوں۔

میں نے اس سے پہلی بات یہ پوچھی کہ گزشتہ رات رضا مقتول کے پاس آیا تھا؟......

اس نے بتایا کہ نہیں آیا۔ اس سلسلے میں باتیں ہوئیں تو اس نے بتایا کہ مقتول کی بیوی کبھی کبھی اوپر اوپر سے ہی اپنے گھر چلی جایا کرتی اور واپس آ جاتی تھی لیکن کبھی اس گھر کا کوئی مرد اوپر سے نہیں آیا۔ یہ بات سن کر بھی میں نے سوچا ہو سکتا ہے رضا گزشتہ رات اوپر سے آیا ہوتا کہ کسی کو پتہ نہ چلے اور وہ مقتول کے ساتھ کچھ باتیں کرنے آیا ہو گا۔ مطلب یہ کہ میرے ذہن میں رضا کے خلاف شک قائم رہا۔

اس کے بعد مقتول کی ماں نے مقتول اور اس کی بیوی کی وہی باتیں سنائیں جو مقتول کا باپ سنا چکا تھا۔ فرق یہ تھا کہ یہ عورت تھی اس لیے اس نے فطرت کے مطابق تفصیل سے باتیں سنائیں۔ ان سے مجھے یہ معلوم ہو کہ میاں بیوی کی ناچاقی بڑی ہی سنگین نوعیت کی تھی۔ دلوں میں کدورت اور عداوت پیدا ہو گئی تھی۔ رضا اور مقتول میں یہ عداوت زیادہ ہی پکی ہو گئی تھی بلکہ خطرناک صورت اختیار کر چکی تھی۔

مقتول کی ماں مقتول کی بیوی پر ہی ہر الزام تھوپ رہی تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ مقتول اپنی بیوی کو مارتا پیٹتا اور مقتول کا بڑا سالا یعنی رضا مقتول کو دھمکیاں دیتا تھا۔

اس عورت نے نئی بات یہ بتائی کہ مقتول کی بیوی مقتول پر بدچلنی کے الزام لگاتی رہتی تھی...... میں نے اس عورت کو یہیں پر روک لیا اور پوچھا کہ مقتول کی بیوی عموماً کس عورت پر شک کرتی تھی کہ اس کے خاوند نے اس عورت کے ساتھ تعلقات پیدا کر رکھے ہیں؟

ماں نے سب سے پہلے ایک نوکرانی کا ذکر کیا۔ اس نے بتایا کہ یہ نوکرانی کئی سالوں سے ان کے گھر رہی ہے۔ چند دنوں سے اس نے نوکری چھوڑ دی ہے۔ یہ تقریباً تیس سال عمر کی عورت تھی، نقش و نگار اچھے اور رنگ کچھ گورا تھا۔ مقتول کی ماں کے بیان کے مطابق یہ عورت نوکرانی لگتی ہی نہیں تھی۔ اسی وجہ سے وہ نوکری چھوڑ گئی ہے کہ مقتول کی بیوی اس پر شک کرتی تھی۔ ماں نے یہ بھی بتایا کہ مقتول نوکرانی کے ساتھ ذرا بے تکلفی سے بولتا تھا۔ اس کی بیوی گھٹی گھٹی طبیعت کی لڑکی تھی اس لیے وہ مقتول پر بڑا گندا الزام لگاتی تھی۔

”بالکل ایسے ہی وہ میرے سوتیلے بیٹے کی بیوی کے متعلق بھی شک میں رہتی تھی۔“

مقتول کی ماں نے کہا۔ ''میرا سوتیلا بیٹا اوپر رہتا ہے۔''

''سوتیلا؟'' میں نے چونک کر حیرت سے پوچھا۔ ''کیا تم چوہدری کی دوسری بیوی ہو!''

اس نے بتایا کہ وہ چوہدری کی دوسری بیوی ہے۔ میں نے اوپر جس جھلّے سے جوان آدمی کو دیکھا تھا وہ چوہدری کی پہلی بیوی کا بیٹا تھا۔ وہ دو تین سال کا تھا تو اس کے ماں مرگئی تھی اور باپ نے اس موجودہ بیوی کے ساتھ شادی کرلی تھی۔ اس بیوی سے مقتول پیدا ہوا، ایک اور چھوٹا بھائی تھا اور دو بہنیں تھیں۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ اوپر کی منزل میں رہنے والا بیٹا ذہنی مریض تھا۔

میں یہ انکشاف سن کر حیران اس لیے نہیں ہوا تھا کہ یہ عورت چوہدری کی دوسری بیوی تھی۔ اس میں حیران ہونے والی کوئی بات نہیں تھی۔ حیران میں اس لیے ہوا کہ چوہدری نے مجھے اتنی اہم بات نہیں بتائی تھی۔ میں اس بات کو اہم اس وجہ سے کہہ رہا ہوں کہ جہاں سوتیلے ہوتے ہیں وہاں عداوت بھی ہوتی ہے۔

میں ایک بات کئی بار پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب بھی کہتا ہوں کہ میں ہر بات کو پولیس کے زاویہ نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ میں وہاں کہانیاں سننے نہیں گیا تھا۔ تفتیش میں ہر قدم شک کی بنا پر اٹھایا جاتا ہے۔ دوسرے لوگوں کے لیے جو بات بہت ہی معمولی ہوتی ہے وہ پولیس کے لیے بڑی ہی اہم ہوسکتی ہے۔ سوتیلے کے لفظ سے میں چونکا ضرور لیکن یہ خیال بھی آ گیا کہ وہ تو ذہنی مریض ہے۔ میرے ذہن میں یہ شک بھی بیٹھا ہوا تھا کہ قاتل اوپر سے آیا تو قاتل اس گھر کا ہی کوئی فرد ہوگا۔ رضا کا نام سامنے آنے سے اور اس کی اور مقتول کی دشمنی کا علم ہونے سے یہ شک کمزور پڑ گیا تھا لیکن اب سوتیلے بھائی کی موجودگی سے یہ شک پھر ابھر آیا۔ میں نے اس سلسلے میں بڑی دور گہرائی تک جانا تھا، ابھی میں آپ کو اپنا شک بتاتا ہوں۔ سوتیلا بھائی ذہنی مریض تھا اور اس کی بیوی بھی تھی۔ شک یہ پیدا ہو گیا کہ اس جھلّے بھائی کی بیوی نے ہوسکتا ہے اپنی تسکین کا کوئی ذریعہ بنایا ہوا ہو۔ یہ ذریعہ مقتول ہوسکتا تھا۔

ابھی تو دیکھنا تھا کہ سوتیلا بھائی کس حد تک ذہنی مریض تھا۔ میرا تجربہ اور مشاہدہ یہ تھا کہ بعض ذہنی مریض ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں عزت اور غیرت کا ذرا سا بھی احساس نہیں ہوتا۔ اگر کسی وجہ سے ذہنی مریض بگڑ جائے یا کوئی بات اسے مشتعل کردے تو وہ انتہائی اقدام تک پہنچ سکتا ہے۔ مجھے خیال یہ آ گیا تھا کہ ایسا تو نہیں کہ مقتول نے اس ذہنی مریض کی بیوی کے

ساتھ چھیڑ چھاڑ کی ہو اور یہ مریض بھائی اچانک غیرت میں آ گیا ہو۔ یہ کوئی حیرت والی بات نہیں ہوتی کہ کسی پاگل نے کسی کا پیٹ پھاڑ دیا ہو یا کسی کا گلا دبا دیا ہو۔

حقیقت معلوم کرنے کے لیے مقتول کی ماں بہترین ذریعہ تھا۔ وہ اس لیے کہ ذہنی مریض بھائی اس کا سوتیلا بیٹا تھا اور وہ اس کی بیوی کی ساس تھی۔ اس طرح اس کے دل میں ان دونوں میاں بیوی کی محبت اور ہمدردی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ میں نے اپنے انداز سے بات کی۔ انداز یہ تھا جیسے میں تفتیش نہیں کررہا بلکہ میری تمام ہمدردی مقتول کے ساتھ ہے۔ میں نے پوچھا کہ اس کے سوتیلے بیٹے کی بہو کیسی ہے؟

''یہ ہر لحاظ سے ٹھیک ٹھاک لڑکی ہے۔'' ماں نے جواب دی۔ ''بڑے ہی معمولی اور اتنے ہی شریف گھر سے آئی ہے۔ اس کے ساتھ ہوئی تو زیادتی ہے لیکن اللہ کا شکر ادا کرتی ہے کہ اتنا بڑا اور امیر گھر مل گیا ہے۔ میرے تو اشاروں پر ناچتی ہے اور ذرا شکایت نہیں کرتی۔''

اس عورت نے اپنی اس بہو کی اتنی تعریفیں کیں کہ میں کسی اور ہی شک میں پڑ گیا۔ میں نے مزید تفصیلات معلوم کرنے کے لیے اس سے کئی باریک باتیں پوچھیں تو یہ صورتِ حال سامنے آئی کہ اس کا یہ سوتیلا بیٹا عام طور پر خاموش رہتا ہے اور اکیلے بیٹھے رہنے کا عادی ہے۔ دیکھنے سے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ دماغی طور پر صحیح نہیں لیکن اکیلا بیٹھا ہنسنے لگتا ہے اور کبھی خود بولتا اور اچانک چپ ہو کر سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ کبھی اس کے آنسو بہنے لگتے ہیں تو بہتے ہی چلے جاتے ہیں۔

اس کی بیوی نے اپنی ساس کو یعنی مقتول کی ماں کو بے تکلفی سے ہر بات بتائی تھی۔ اس ذہنی مریض کے اصلی نام کی بجائے میں اسے رحیم لکھوں گا۔ اسے بالکل احساس نہیں تھا کہ خاوند اور بیوی کے تعلقات کیا ہوتے ہیں۔ اس کی بیوی نام کی بیوی تھی۔ کوئی جسمانی تعلق نہیں تھا نہ رحیم کو اس تعلق کا احساس تھا۔ بیوی صبر اور شکر کرتی تھی اور رحیم کی ہر طرح کی خدمت میں چاک و چوبند رہتی تھی۔ یہ مقتول کی ماں کا بیان تھا جو میں بتا رہا ہوں۔ مجھے اپنے ذرائع سے اس بیان کی تصدیق یا تردید کروانی تھی۔ میں نے کہا کہ میں کسی اور شک میں پڑ گیا تھا جو میں ابھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ ذہن میں رکھ کر اپنے خیالوں کے گھوڑے دوڑائے، مقتول کی ماں ساس بھی تھی سوتیلی ماں بھی۔

میرے پوچھنے پر مقتول کی ماں نے بتایا کہ یہ شادی کس طرح ہوئی تھی۔ ہر کوئی جانتا

تھا کہ رحیم پگلا یا جھلّا ہے۔ کوئی بھی اسے اپنی بیٹی دینے کا ظلم نہیں کر سکتا تھا لیکن ایک باپ ایسا مل ہی گیا۔

یہ باپ بہت ہی تھوڑی تنخواہ پانے والا آدمی تھا۔ اس کی تین بیٹیاں تھیں۔ صرف ایک بیٹی کی شادی کی تو وہ مقروض ہو گیا۔ تنخواہ کا اچھا خاصا حصہ قرض کی ادائیگی میں جانے لگا۔

کسی طرح رحیم کے باپ کو پتہ چل گیا۔ وہ اس شخص سے ملا اور اسے یہ پیش کش کی کہ وہ اس کا سارا قرض ادا کر دے گا اور اس کی بیٹی کو بغیر جہیز کے قبول کر لے گا اور شادی کے تمام اخراجات ادا کر دے گا۔ اس نے غالباً کچھ اور رقم بھی پیش کی تھی۔ حاجت مند باپ نے یہ پیش کش قبول کر لی اور ایک بیٹی دے دی۔ یوں کہہ لیں کہ رحیم کی بیوی خریدی گئی تھی۔

لڑکی صاف گو تھی

''اس پگلے کی شادی کی ضرورت ہی کیا تھی؟'' میں نے مقتول کی ماں سے پوچھا۔

''ڈاکٹروں نے کہا تھا۔'' ماں نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے ایک ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اس کی شادی کر دو تو یہ ٹھیک ہو جائے گا۔''

علاج کی تفصیل معلوم ہوئی جو کچھ اس طرح تھی۔ باپ امیر کبیر آدمی تھا۔ وہ کچھ عرصہ پہلے بیٹے کو دلی نفسیات کے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ اس ڈاکٹر نے اس کا کچھ نفسیاتی علاج بھی کیا اور دوائیاں بھی دی تھیں۔ ظاہر ہے یہ ذہنی سکون دینے والی دوائیاں تھیں۔ اس ڈاکٹر نے کہا تھا کہ مریض کی شادی کر دی جائے لیکن بیوی ایسی ہو جو اسے دلی پیار اور محبت دے سکے۔ بچپن میں اس کی ماں مر گئی تھی اور ماں کی ممتا کی محرومی نے اسے اس حد تک پہنچا دیا۔ کچھ دوستوں نے یا کسی عقل مند آدمی نے چوہدری کو یہ بات سمجھائی کہ اس کی شادی نہ کرنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ لڑکی جو اس کی بیوی بنے، اسے قبول نہ کرے اور رحیم کو ایک اور صدمہ پہنچے۔

تھوڑا عرصہ علاج کیا گیا لیکن کوئی بہتر تبدیلی نظر نہ آئی۔ پھر باپ اسے دلی کے ایک ذہنی امراض کے سپیشلسٹ کے پاس لے گیا۔ وہ ایک اینگلو انڈین ڈاکٹر تھا۔ میں چونکہ خاصا عرصہ دہلی میں رہا تھا اس لیے اس سپیشلسٹ سے بڑی اچھی طرح واقف تھا۔ دو تفتیشوں میں مجھے اس کی مدد اور رائے کی ضرورت پڑی تھی اور اس نے بہت تعاون کیا تھا۔ اس ڈاکٹر نے رحیم کا علاج شروع کیا۔ اس نے ایسی کوئی بات نہ کہی کہ اس کی شادی کر دی جائے۔ رحیم کے باپ نے اس ڈاکٹر سے شادی کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا کہ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا

سکتا۔ ہو سکتا ہے شادی سے یہ ٹھیک ہو جائے لیکن اس میں خطرہ بھی ہے۔ بہر حال اس نے اتنا ضرور کہا کہ شادی کر کے دیکھ لیں اور یہ بھی ذہن میں رکھ لیں کہ کوئی اور مسئلہ بھی کھڑا ہو سکتا ہے۔

اس اینگلو انڈین ڈاکٹر کی اس بات سے رحیم کے باپ نے یہ مطلب نکال لیا کہ اس کی شادی کر دی جائے تو اس کا ذہنی مرض ٹھیک ہو سکتا ہے۔ سب پیسے کا کھیل تھا۔ باپ نے اس لڑکی کو خرید لیا اور شادی ہو گئی۔ اس کے بعد بھی باپ رحیم کو دلی اس ڈاکٹر کے پاس لے جاتا رہا۔ ڈاکٹر نے دو دوائیاں لکھ دی تھیں جو رحیم ابھی تک لے رہا تھا۔ یہ یقیناً نیند اور سکون کی دوائیاں تھیں...... رحیم کی شادی کو نو دس مہینے گزر گئے تھے۔

''دیکھو چوہدرانی!'' میں نے مقتول کی ماں سے کہا۔ ''میری یہ بات ذہن میں بٹھا لو کہ تمہارا بیٹا واپس نہیں آئے گا۔ قاتل تو یہیں کہیں گھوم پھر رہا ہے۔ کیا تم نہیں چاہتیں کہ قاتل کو سزا ملے؟ تم اصل بات چھپا کر اِدھر اُدھر کی باتیں بتاتی رہو گی تو قاتل کو میں کس طرح پکڑ سکوں گا؟ تمہارا بیٹا اچھا تھا یا اچھا نہیں تھا وہ تمہارا بیٹا تھا۔ میں اس کے خون کے بدلے خون لینا چاہتا ہوں۔ میری مدد کرو اور کچھ سچی اور صحیح باتیں بتا دو...... کیا تمہارا بیٹا رحیم کی غیر حاضری میں اس کے کمرے میں اس کی بیوی کے پاس جا کر بیٹھا کرتا تھا؟ کیا اس نے رحیم کی بیوی کے ساتھ کوئی اچھا یا برا تعلق رکھا ہوا تھا؟''

''میں سچ کہہ رہی ہوں کہ میرا بیٹا بہت ہی شریف تھا۔'' ماں نے جواب دیا۔ ''وہ اتنا بے غیرت نہیں تھا کہ اپنے بڑے بھائی کی بیوی کے ساتھ عشق لڑانا شروع کر دیتا۔ اگر اسے پتہ چلتا کہ رحیم کی بیوی رحیم کو دھوکہ دے رہی ہے تو میرا بیٹا اس لڑکی کو بھی اور اس کے یار کو بھی قتل کر دیتا۔''

اس کی یہ بات میرے لیے قابلِ یقین نہیں تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کے دل میں کچھ شک ضرور ہو گا کہ فلاں شخص قاتل ہو سکتا ہے۔ اس نے فوراً رضا کا نام لیا۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی۔

''بارہ چودہ روز پہلے کی بات ہے۔'' اس نے کہا۔ ''رضا مجھے باہر گلی میں ملا تھا۔ اس نے مجھے روک کر کہا کہ اپنا بیٹا زندہ اور سلامت چاہتی ہو تو اسے انسان کا بچہ بنا کر رکھو۔ اس نے میری بہن کو مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا ہے اور اب میرے گلے پڑتا ہے۔ میں دوبارہ تمہیں یہ بات نہیں کہوں گا۔''

میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے یہ بات اپنے خاوند کو یا اپنے مقتول بیٹے کو بتائی تھی؟...... اس نے کہا کہ اس کا خاوند تو ایسا بے پرواہ اور لاتعلق آدمی ہے کہ اسے بتانا نہ بتانا ایک برابر ہے۔ گھر کے سارے معاملات اور مسئلے چوہدرانی نے اپنے ہاتھ میں رکھے ہوئے تھے پھر اس نے اپنے مقتول بیٹے کے متعلق بتایا کہ اسے رضا کی یہ دھمکی سنائی تھی تو بیٹا ہنس کر کہنے لگا کہ میں نے کل اس کا دماغ درست کر دیا تھا اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ تمہاری بہن کو طلاق دے دوں گا۔

”کیا ان کا باہر کہیں لڑائی جھگڑا تو نہیں ہوا تھا؟......“ میں نے پوچھا۔

”مجھے شک ہوا تھا۔“ ماں نے جواب دیا۔ ”اُڑتے اُڑتے سنی بھی تھی کہ ان کی آپس میں ہاتھا پائی ہوئی تھی لیکن میں نے بیٹے سے پوچھا تو اس نے کوئی خاص بات نہیں بتائی۔“

میں نے اس عورت کے سینے سے کوئی صحیح اور کام کی بات نکالنے کی بہت کوشش کی لیکن یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے بیٹے کے اخلاق اور کردار پر پردہ ڈال رہی ہو...... میری معلومات کے مطابق اس گھر میں اور جو افراد تھے ان میں ایک رحیم کی بیوی تھی، مقتول کا چھوٹا بھائی تھا جس کی عمر ابھی بمشکل تیرہ سال تھی اور دو بہنیں تھیں۔ ایک بہن مقتول سے سال ڈیڑھ سال چھوٹی تھی اور اس کی شادی ڈیڑھ سال پہلے ہو چکی تھی۔ اس سے چھوٹی ایک اور بہن تھی جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے ان کی ماں سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ شادی شدہ بیٹی صبح اطلاع ملتے ہی آ گئی تھی۔ میں نے ماں سے کہا کہ وہ چلی جائے اور اپنی شادی شدہ بیٹی کو میرے پاس بھیج دے۔

میں نے رحیم کے ساتھ بھی باتیں کر کے اندازہ کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا کہ یہ کس حد تک ذہنی مریض ہے۔ اس کی بیوی سے بھی پوچھ گچھ کرنی تھی لیکن بہتر یہ سمجھا کہ مقتول کی سگی بہن سے کچھ پوچھ لیا جائے۔

مجھے اندازہ تھا کہ مقتول کی یہ بہن کس حالت میں میرے پاس آئے گی۔ وہ آئی تو اس کی حالت بہت زیادہ خراب تھی جس کی مجھے توقع تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں بوٹیوں کی طرح سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ٹھیک طرح چل بھی نہیں سکتی۔ میں نے بڑی شفقت اور پیار سے اپنے پاس بٹھایا اور ہمدردی کا اظہار کیا۔ وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ میں نے کہا کہ میں اس کے بھائی کے قاتل سے اس طرح انتقام لینے کو بے تاب ہوں کہ اسے جلدی سے جلدی پکڑ کر پھانسی کے تختے تک پہنچاؤں لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہو

سکتا ہے کہ وہ مجھے اپنا شک بتائے اور میری رہنمائی کرے۔

بہت ساری باتیں کہہ کر اور اپنے تمام تر تجربے کو بروئے کار لا کر اس لڑکی کو بولنے کے لیے تیار کیا۔ میں نے اسے یہ بھی کہا کہ وہ اگر صرف یہ ثابت کرنا چاہے گی کہ اس کا بھائی بڑا ہی نیک اور شریف انسان تھا اور خواہ مخواہ سے کسی نے قتل کر دیا ہے تو اس سے کچھ حاصل نہیں ہو گا اور بہتر ہے کہ وہ کوئی بات کیے بغیر چلی جائے۔

”مجھ پر ایسا شک نہ کریں۔“ بہن نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا۔ ”اس بھائی کے ساتھ میری روحانی محبت تھی اور راز داری بھی۔ اس کے بارے میں آپ کو جو باتیں مجھ سے معلوم ہو سکتی ہیں وہ کسی اور کو معلوم نہیں۔ میں بات یہیں سے شروع کرتی ہوں کہ میرا یہ بھائی دراصل شریف آدمی نہیں تھا۔“

نوجوان لڑکی کی اس بات نے میرے ذہن اور دل سے بوجھ اتار دیا۔ لڑکی صاف گو معلوم ہوتی تھی۔

نوکرانی خوبصورتی اور دھمکی

”تم کیا سمجھتی ہو قاتل کون ہو سکتا ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”بھائی کی اپنے بڑے سالے کے ساتھ دشمنی پیدا ہو گئی تھی۔“ بہن نے جواب دیا۔ ”اس کی بیوی کو آپ دیکھیں تو ضرور کہیں گے کہ یہ اتنی بری تو نہیں کہ اسے دھتکار ہی دیا جائے لیکن میرے بھائی نے اسے قبول ہی نہیں کیا تھا۔“

مقتول اور اس کی بیوی آپس میں جس طرح رہتے، لڑتے اور جھگڑتے تھے اور جس طرح مقتول بیوی کو مارتا پیٹتا تھا، یہ سب مقتول کی اس بہن نے بتایا۔ یہ باتیں میں پہلے بھی سن چکا تھا۔ اس نے اس میں اضافہ یہ کیا کہ مقتول اپنی بیوی کو بے زبان نوکرانی بنا کر رکھنا چاہتا تھا لیکن بیوی کو اپنے بھائیوں کی غنڈہ گردی پر اور اپنے باپ کی زمین جائیداد اور دولت پر بہت ناز تھا۔ وہ سر جھکانا جانتی ہی نہیں تھی۔

”میں نے بھائی کے دل میں بیوی کی محبت پیدا کرنے کی بہت کوشش کی تھی۔“ بہن نے کہا۔ ”لیکن میرا بھائی عاشق مزاج آدمی تھا۔ اس کا دل ایک جگہ ٹکتا ہی نہیں تھا۔ گھر میں اسے سب سے زیادہ محبت میرے ساتھ تھی لیکن بیوی کے معاملے میں میری کوئی طرف دارانہ بات نہیں سنتا تھا۔ اصل مشکل یہ پیدا ہو گئی تھی کہ ہماری ماں بیٹے کا ساتھ دیتی اور بیٹے کی بیوی کے ساتھ بیٹے سے بھی زیادہ برا سلوک کرتی تھی۔“

اس لڑکی نے سنایا کہ بھائی نے جب بیوی کی مار پٹائی شروع کر دی تو ماں نے بیٹے کی حوصلہ افزائی کی اور بیٹے کی بیوی کو ہی برا بھلا اور قصوروار کہا۔ اس بہن نے یہ مثال میرے آگے رکھی کہ اب بھائی کی بیوی یہ اعلان کر کے میکے چلی گئی ہے کہ بھائی نے اسے مارا پیٹا تھا۔ ماں کو چاہئے تھا کہ بیچ بچاؤ کرتی لیکن ماں نے اپنا سلیپر اتار کر بھائی کی بیوی کے منہ پر اور پھر سر پر مارا۔ ساتھ گالیاں دیں اور یہ بھی کہا کہ تُو نے میرے بیٹے کی زندگی جہنم بنا رکھی ہے۔

اس نوجوان لڑکی کا بیان مجھے اس وجہ سے حیران کر رہا تھا کہ اس خاندان میں بھی کوئی سچ بولنے والا فرد پیدا ہوا ہے۔ اس لڑکی کو تو فیشن پرست اور نمائش پسند ہونا چاہئے تھا لیکن یہ تو سچی باتیں کہہ رہی تھی۔ یہ لڑکی فطرت کے طور پر صداقت پسند ہوگی لیکن میں سمجھ گیا تھا کہ اس کے ذہن اور دل پر جوان بھائی کی موت کا اس قدر صدمہ اور غم طاری ہے کہ اس کے اندر سے جلی کٹی اور سچی باتیں نکل رہی ہیں۔ وہ قاتل کو اتنا نہیں کوس رہی تھی جتنا اپنی ماں اور اپنے بھائی کے خلاف بول رہی تھی۔ اس کا بیان کچھ لمبا تھا اور میں نے اس دوران اس سے کچھ باتیں پوچھی بھی تھیں۔ میں ذرا اختصار سے اس کا بیان سنا دیتا ہوں۔

اس ایک مثال سے ہی آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ مقتول کی بیوی کو صرف مقتول ہی نہیں بلکہ مقتول کی ماں بھی بہت تنگ اور پریشان کرتی تھی۔ غور فرمائیں کہ مقتول کی بیوی کسی معمولی اور غریب گھر کی لڑکی نہیں تھی بلکہ امیر ماں باپ کی بیٹی اور اپنا رعب دب رکھنے والے بھائیوں کی بہن تھی۔ وہ دبک کر رہ سکتی ہی نہیں تھی۔ مقتول کی اس بہن نے بتایا کہ مقتول کی یہ بیوی اینٹ کا جواب پتھر سے دیتی تھی۔ اس لڑکی نے صاف الفاظ میں بتایا کہ سارے فساد کی اصل جڑ اس کی ماں تھی۔ خاوند پر بھی اور بہو پر بھی اور ہر کسی پر اپنا حکم چلاتی تھی۔

مقتول کی بہن نے ایک انکشاف اور کیا جس نے میرے دماغ کو کچھ اور روشنی دے دی۔ اس نے بتایا کہ کچھ دن پہلے مقتول کی اور رضا کی باہر کہیں لڑائی ہوئی تھی اور مقتول نے چاقو نکال کر رضا کو مارا۔ رضا وار بچا گیا لیکن اس کے بازو پر ذرا سا چاقو لگ گیا۔ بہن نے یہ بھی بتایا کہ مقتول نے یہ بات صرف اس بہن کو سنائی تھی۔ گھر میں کسی اور کو معلوم نہیں۔

یہ میں ہی جانتا تھا کہ رضا جیسے پُر وقار غنڈے اور غنڈہ پرور آدمی کے لیے یہ وار ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ سلجھا اور سنبھلا ہوا آدمی تھا۔ میں نے سوچا کہ اس نے لڑائی میں ہی انتقام لینے کی بجائے یوں انتقام لیا کہ مقتول کو اس دنیا سے ہی صاف کر دیا۔ اس میں اس کی بہن کا

انتقام بھی شامل تھا۔

میں نے یہ ساری گھریلو تفصیلات سن کر مقتول کی بہن سے پوچھا کہ مقتول کی بیوی اس پر بدچلنی کے الزام لگاتی رہتی تھی۔ ان میں کہاں تک صداقت ہے۔

لڑکی نے فوراً جواب دیا کہ کوئی ایک بھی الزام غلط نہیں تھا۔ عورت یا حسن و جوانی کے معاملے میں مقتول کی عادتیں بہت ہی بری تھیں۔ بہن نے سب سے پہلے نوکرانی کا ذکر کیا۔ اس نے بتایا کہ تیس اکتیس سال کی خوبصورت عورت ہے اور اس کے جسم میں ایک خاص کشش ہے۔ بہن کے بیان کے مطابق، یہ نوکرانی ان کے پاس چند سالوں سے کام کر رہی تھی۔ مقتول نے اس پر بری نظر رکھ لی۔ نوکرانی نے مقتول کی اس بہن کو تین چار مرتبہ کہا کہ اپنے بھائی کو سمجھا لے کہ مجھے ایسی بری اور بدکار عورت نہ سمجھے۔ بہن نے بھائی سے یہ بات نہ کی کیونکہ اسے ڈر تھا کہ معاملہ بگڑ نہ جائے۔

مقتول کی بہن نے ایک واقعہ سنایا۔ وہ یوں کہ ایک روز یہ بہن اپنے سسرال سے ماں باپ کے گھر آئی۔ اس کے سسرال ساتھ والے محلے میں رہتے تھے۔ وہ اپنے گھر آئی تو گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ ایک کمرے کی طرف گئی تو اندر سے دھیمی دھیمی باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور کھڑکی کا ایک کواڑ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ بہن نے دبے پاؤں اس ذرا سے کھلے ہوئے کواڑ میں سے اندر جھانکا تو دیکھا کہ مقتول نوکرانی کو اپنے بازوؤں میں لینے کی کوشش کر رہا تھا اور نوکرانی اس سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔

مقتول نے اس کی منتیں شروع کر دیں کہ وہ اسے اس طرح نہ دھتکارے اور مایوس نہ کرے اور جتنے پیسے مانگتی ہے لے لے۔ مقتول نے جیب سے کچھ پیسے نکالے تو نوکرانی وہاں سے بھاگی اور باہر نکل آئی۔ بہن اندر چلی گئی، بھائی سے ملی لیکن اس نے یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ اس نے یہ منظر دیکھا ہے۔

گھر کے باقی افراد کہیں اِدھر اُدھر نکل گئے تھے۔ بہن مقتول کے پاس بیٹھی باتیں کہتی سنتی رہی اور کچھ دیر بعد باہر نکلی اور اس کمرے میں گئی جہاں نوکرانی جھاڑ پونچھ کر رہی تھی۔ نوکرانی پر بھی بہن نے ظاہر نہ ہونے دیا کہ اس نے یہ منظر دیکھا ہے لیکن نوکرانی نے اسے بتایا کہ آج اس کے بھائی نے یہ حرکت کی ہے، اسے باز کر لو ورنہ میں نوکری چھوڑ دوں گی اور اپنی بے عزتی کا انتقام بھی لوں گی۔

بہن نے کہا کہ مقتول کی بیوی سارے گھر میں صرف اسے یعنی اس بہن کو اچھا اور مخلص

سمجھتی تھی اور دل کی ہر بات اس کے ساتھ کر لیتی تھی۔ بیوی نے اس بہن کو چند مرتبہ بتایا تھا کہ مقتول نوکرانی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا ہے۔ معلوم ہوا کہ نوکرانی نے خود مقتول کی بیوی کو یہ بات بتائی تھی۔ پھر نوکرانی نوکری چھوڑ گئی۔

میرے دماغ میں یہ بات آئی کہ نوکرانی کو رونا چاہئے تھا کہ وہ اتنی غریب اور مجبور ہے کہ اس کی عزت بھی محفوظ نہیں اور مقتول اس لیے اس پر دست درازی کرتا رہتا ہے کہ وہ اس کا آقا ہے لیکن نوکرانی نے دھمکی دی تھی کہ وہ انتقام لے گی۔ کوئی اور آدمی نوکرانی کی یہ بات سنتا تو ہنس پڑتا کہ یہ غریب سی گھروں میں کام کرنے والی عورت کیا انتقام لے گی لیکن میں ہر تھانے دار کی طرح جرم و گناہ کی دنیا کا آدمی تھا۔ جو میں نے دیکھا وہ عام لوگ نہیں دیکھ سکتے۔ میں نے مقتول کی بہن سے کہا کہ نوکرانی نے انتقام کی جو دھمکی دی تھی اس کے متعلق اس کی رائے کیا ہے، کیا یہ کھوکھلی دھمکی تھی یا نوکرانی کے پیچھے کوئی طاقت یا پشت پناہی تھی۔

مقتول کی بہن نے بتایا کہ سچی بات یہ ہے کہ وہ اس کی دھمکی سے ڈر گئی تھی۔ بہن نے کہا کہ باہر کی اکثر باتیں گھروں کی عورتوں تک بھی پہنچ جاتی ہیں۔ اس نوکرانی کے متعلق اس نے بتایا کہ اس کا خاوند بڑا کمزور، معذور اور مزدوری پیشہ آدمی ہے اور گھر کے اخراجات نوکرانی خود پورے کرتی ہے۔ بہن نے یہ بھی بتایا کہ سنا ہے کہ ایک بہت بڑا غنڈہ اور بدمعاش آدمی شہر میں موجود ہے جس نے نوکرانی کو باقاعدہ داشتہ بنا رکھا ہے۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں۔ ہو سکتا ہے نوکرانی کے خاوند کو بھی معلوم ہو۔ نوکرانی صرف اس لیے نوکری کرتی ہے کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ اپنے جسم اور عصمت کی کمائی کھا رہی ہے۔

بہن نے اس غنڈے بدمعاش کا نام لیا تو میں اس نام سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ وہ ذرا اونچے درجے کا جرائم پیشہ اور سزا یافتہ آدمی تھا۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ وہ گھٹیا قسم کا وارداتیا نہیں تھا، اپنا وقار اور اپنا رعب و دبدبہ رکھتا تھا۔ اس میں کوئی حیرت والی بات نہیں تھی کہ اس شخص نے ایک عورت کو داشتہ بنا رکھا تھا۔

بہن نے یہ بھی بتایا کہ اس شہر میں کسی شخص میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ اس نوکرانی کو بری نظر سے دیکھے۔ سب جانتے ہیں کہ یہ کس کی چیز ہے اور سب اس شخص سے ڈرتے ہیں......

جب یہ واقعہ اور اس غنڈے جرائم پیشہ کا نام میرے کانوں میں پڑا تو یوں سمجھیں کہ ایک اور مشتبہ میرے سامنے آ گیا۔ میں اس شخص کو اچھی طرح جانتا تھا، اس کے لیے کسی کو قتل کر دینا کوئی مشکل کام نہ تھا۔

میرا دماغ یہاں آ کر اٹک جاتا تھا کہ مقتول کو گھر میں کیوں اور کس طرح قتل کیا گیا۔ قتل عموماً باہر ہوا کرتے تھے۔ بعض آدمیوں کو تو غائب کر دیا جاتا تھا۔ ابھی تو تفتیش کی ابتداء تھی۔ میں نے ابھی اپنے خفیہ ذرائع استعمال کرنے تھے پھر ہی ان معموں کے حل کا امکان پیدا ہو سکتا تھا۔

پاگل خاوند صابر بیوی

اس کے بعد میں مقتول کی بہن کو چھلتے رحیم اور اس کی بیوی کی طرف لایا۔ بہن نے کہا یہ تھا کہ مقتول کی بیوی یہ شک بھی کرتی تھی کہ مقتول نے رحیم کی بیوی کے ساتھ بھی دوستانہ گانٹھ رکھا ہے۔

''دوستانے والی بات بالکل غلط ہے۔'' مقتول کی بہن نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''صحیح یہ ہے کہ میرا بھائی رحیم کی بیوی کے ساتھ دوستی پیدا کرنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا اور یہ لڑکی بے چاری بہت ہی پریشان تھی۔ اس لڑکی کے ساتھ بھی میری بے تکلفی اور راز داری ہے۔ غریب طبع اور صابر لڑکی ہے۔ اپنے غریب ماں باپ کی عزت کی خاطر اس نے یہ خاوند قبول کیا اور اس کی خدمت میں لگی رہتی ہے۔ یقین کریں اس نے میرے بھائی کی شکایت مجھ سے نہیں کی تھی بلکہ ایک روز میں نے پوچھا کہ میرا بھائی تمہیں پریشان تو نہیں کرتا...... اس بے چاری کے آنسو نکل آئے۔ کہنے لگی کہ ہمیں ڈرتی بات نہیں کرتی تھی۔ ڈر یہ تھا کہ تم لوگ امیر کبیر ہو اور تمہارے سامنے میری حیثیت ہی کیا ہے، ایسا نہ ہو کہ میں کوئی جائز شکایت کروں تو مجھے دھکے دے کر گھر سے نکال دو۔ ایسا ہوا تو میرا باپ بے چارہ چارپائی سے لگ جائے گا۔''

مقتول کی بہن نے تفصیل یہ بتائی کہ رحیم کی بیوی نے اسے بتایا کہ رحیم جب دوائی کھا کر گہری نیند میں بے ہوش پڑا ہوتا تھا یا باہر کہیں نکل جاتا تھا تو مقتول اس لڑکی کے پاس آ بیٹھتا اور عشق و محبت کا اظہار کرتا تھا۔ لڑکی اسے دھتکارنے کی یا اسے یہ کہنے کی جرأت نہیں کرتی تھی کہ اس کے کمرے میں نہ آیا کرے۔ اس کی بجائے وہ روتی اور مقتول کی منت سماجت کرتی تھی کہ وہ بدنام ہو جائے گی اس کے ساتھ یہ سلوک نہ کرے۔

رحیم کی بیوی نے مقتول کی بہن کو روتے ہوئے بتایا کہ مقتول اسے کہتا تھا کہ تم پر بہت ظلم ہوا ہے کہ ایک پاگل اور بے کار آدمی کے ساتھ باندھ دی گئی ہو اور اپنے جذبات کا خون نہ کرو ورنہ کڑھ کڑھ کر مر جاؤ گی۔ اس کی بجائے میرے ساتھ دوستی لگا لو اور ہر طرح عیش

کرو......لڑکی نے مقتول کی بہن کے آگے ہاتھ جوڑے اور کہا کہ اس کی یہ شکایت مقتول تک یا اس کی ماں تک نہ پہنچائے۔ لڑکی کو یہ ڈر تھا کہ اسے گھر سے نکال دیا جائے گا۔

میں نے مقتول کی بہن سے کہا کہ اس کی ماں رحیم کی بیوی کی بہت تعریف کرتی ہے۔

بہن نے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ لا کر کہا کہ میری ماں تو اس کی تعریفیں کرے گی ہی کیونکہ یہ بے چاری صرف اپنے جھلّے خاوند کی ہی خدمت نہیں کرتی بلکہ میری ماں کی مٹھی چاپی اور سارے جسم کی مالش بھی کیا کرتی ہے اور ماں اشارہ کر دے تو یہ لڑکی کٹھ پتلی کی طرح ناچنے لگتی ہے۔

اس لڑکی کی اتنی صاف گوئی سے میں اتنا زیادہ متاثر ہوا کہ مجھے کچھ شک بھی ہونے لگا کہ یہ لڑکی کہیں مجھے دھوکہ ہی تو نہیں دے رہی!...... یہ سمجھنے کا تو مجھے تجربہ تھا کہ لڑکی جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔ پھر بھی میں نے ہنستے مسکراتے اس سے پوچھ لیا کہ اس کی اس صاف گوئی کی آخر وجہ کیا ہے۔ بیٹیاں اپنی ماں کے اتنی خلاف تو نہیں بولا کرتیں!

''بہنوں کو بھائیوں کے ساتھ محبت تو ہوتی ہی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن اس بھائی کے ساتھ میری جو محبت تھی وہ شاید آپ اپنے اندازے میں نہ لا سکیں۔ میرے اتنے پیارے بھائی کے قتل کی ذمہ دار ہماری ماں ہے۔ یہ بھائی ماں کا پہلا لڑکا تھا اس لیے ماں نے اسے خوب بگاڑا اور ہمارے ابا کو اپنے پاؤں کے نیچے دبا کر رکھا اور پھر بیٹے کی ہلاشیری کرتی رہی کہ بیٹا من مانیاں کرتا رہے۔ میرے بھائی اور اس کے سسرال میں دشمنی ہماری ماں نے پیدا کی۔ یہ تو دشمنی ختم کر سکتی تھی لیکن اس ماں نے دشمنی اور زیادہ بڑھائی اور رضا جیسے غنڈے کے ساتھ میرا بھائی لڑ پڑا۔ میرے بھائی اور اس کی بیوی میں ہماری ماں نے محبت پیدا ہونے ہی نہیں دی بلکہ بیٹے کو اس کی بیوی کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کیا......

''آپ حیران نہ ہوں کہ میں سچ کیوں بول رہی ہوں۔ اس کی اصل وجہ تو یہ ہے کہ میں بچپن سے نکل کر لڑکپن میں داخل ہوئی تو ایک سہیلی کے اثر سے میرا دھیان اللہ اور نماز روزے کی طرف ہو گیا۔ میں نے اسی عمر میں قرآن مجید ختم کر لیا تھا۔ اگر آپ مجھے سچی لڑکی سمجھتے ہیں تو ایک سچ اور سن لیں۔ میری شادی کا وقت آیا تو اپنی رشتہ داری میں ایک لڑکا میرے دل کو بہت اچھا لگتا تھا اور میں اسی کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی اور ہو بھی سکتی تھی۔ یہ نہ سمجھیں کہ میری اس کے ساتھ خفیہ ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ بات اتنی ہی تھی کہ یہ لڑکا مجھے اچھا لگتا تھا اور میں نے اپنے بھائی کو بتا دیا کہ میری شادی اس لڑکے کے

ساتھ ہونی چاہئے۔ بھائی نے میری پسند کو پسند کیا اور کہا کہ میری شادی اسی لڑکے کے ساتھ ہو گی۔ بھائی نے ماں کو بتایا اور فیصلے کے لہجے میں کہا کہ شادی اسی لڑکے کے ساتھ ہونی چاہئے۔ ماں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ جہاں وہ چاہے گی وہاں میری شادی ہو گی۔ یہ ہماری ماں کی عادت ہے کہ اپنی چلاتی ہے اور کسی دوسرے کی بات کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو اسے رَد کر دیتی ہے۔ پھر ہوا یہی کہ میری شادی میری پسند کے خلاف کی گئی۔ میں نے اس خاوند کو قبول تو کر لیا لیکن اس لڑکے کو اب بھی دیکھتی ہوں تو دل میں چبھن سی ضرور ہوتی ہے۔ میں نے دل کو یہ تسلی دے رکھی ہے کہ جو قسمت میں ہوتا ہے وہی ملتا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ جو ملا وہ ٹھیک ہے۔''

یہ لڑکی کوئی پڑھی لکھی نہیں تھی ورنہ یہ دو لفظ ضرور استعمال کرتی۔ ایک انا پرستی اور دوسرا ڈکٹیٹر شپ۔ میں سمجھ گیا کہ اس کی ماں انا پرست ہے اور اپنے ہی فیصلے ٹھونستی ہے۔ ایسے انسان ڈکٹیٹر ہوا کرتے ہیں۔ بہرحال مجھے اس سوال کا جواب مل گیا کہ لڑکی اپنوں اور اپنی ماں کے خلاف ہی کیوں بول رہی ہے۔

میں نے اس سے رحیم کے متعلق پوچھا۔ اس نے وہی باتیں بتائیں جو میں پہلے دوسروں کی زبانی سنا چکا ہوں۔ اس نے اس بات کی تائید کی کہ رحیم کو یہ احساس ہی نہیں کہ وہ اس لڑکی کا خاوند ہے جو اس کے ساتھ کمرے میں رہتی ہے۔ رحیم کی بیوی نے مقتول کی بہن کو یہ بات بتائی تھی۔ یہ بھی کہ بیوی رحیم کے ساتھ پیار و محبت کرتی رہتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ رحیم رات کو دوسرے کمرے میں سویا کرتا تھا۔ اس نے نیند کی گولی کھائی ہوئی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی بیوی اسے بہلا پھسلا کر اپنے کمرے میں لے آتی تھی۔

مقتول کی بہن سے نئی بات یہ معلوم ہوئی کہ رحیم چپ چاپ رہتا ہے اور جب چلتا پھرتا ہے تو نارمل لگتا ہے لیکن چلتے چلتے رک جاتا ہے پھر اس کے آنسو بہنے لگتے ہیں یا ہنسنے لگتا ہے۔ نئی بات یہ معلوم ہوئی کہ اسے کبھی کبھی غصہ آ جاتا ہے۔ غصے کی حالت میں اس کے سامنے جو چیز بھی آئے وہ توڑ دیتا ہے۔

مقتول کی بہن نے دو واقعات سنائے جو ایک ہی جیسے ہیں۔ باہر کہیں ایک لڑکے نے اس کا مذاق اُڑایا اس نے اس لڑکے کی گردن اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لی اور گردن ایسی دبائی کہ لڑکے کی آنکھیں باہر آ گئیں۔ اگر اسے دو تین بڑے آدمی چھڑا نہ لیتے تو لڑکا مارا گیا تھا۔ دو چار مہینوں بعد ایک اور لڑکا اسے چھیڑ بیٹھا تو اس کی بھی گردن رحیم نے اسی طرح دبوچ

لی اور دوسروں نے چھڑا لیا۔

یہ دو واقعات سن کر یہ شک پیدا ہو گیا کہ مقتول کو اسی نے ہی قتل نہ کر دیا ہو کیونکہ مقتول کی گردن بھی دونوں ہاتھوں سے دبائی گئی تھی۔ میرے لیے ضروری ہو گیا کہ رحیم کو دیکھ لوں اور اس کے ساتھ کچھ باتیں کروں اور دیکھوں کہ وہ عقل کی کوئی بات کرنے کے قابل ہے یا نہیں۔

مقتول کی بہن نے مجھے اچھی خاصی روشنی دکھا دی تھی۔ رضا پر شک پختہ ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ شک اس جرائم پیشہ آدمی پر تھا جس نے ان کی نوکرانی کو داشتہ بنایا ہوا تھا...... تین ساڑھے تین کا وقت ہو گیا تھا۔ لاش پوسٹ مارٹم کے بعد آنے ہی والی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ لاش آئی تو یہاں کیا کہرام بپا ہو جائے گا۔ میں اس سے پہلے پہلے یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

مقتول کے باپ کو بلا کر کہا کہ رحیم کو میرے پاس لے آئے۔ مقتول کی بہن کو میں نے فارغ کر دیا تھا۔ رحیم کے باپ نے کہا کہ وہ تو پگلا لڑکا ہے، اس سے آپ کیا پوچھ سکیں گے، اسے رہنے ہی دیں۔ میں نے اسے کوئی وجہ نہ بتائی، بس اتنا کہا کہ اسے میرے پاس چھوڑ کر باپ باہر چلا جائے۔ باپ گیا اور پانچ سات منٹوں بعد رحیم کو ساتھ لے آیا۔

میں نے اُٹھ کر رحیم کا استقبال کیا اور ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے پہلے کی طرح اب بھی میرے ہاتھ کی طرف دیکھا اور اپنا ہاتھ میری طرف نہ کیا۔ میں نے آگے بڑھ کر بازو اس کی کمر میں ڈال کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور پیار سے کہا کہ بیٹھ جاؤ۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور چہرے پر حیرت کا تاثر لئے میرے منہ کی طرف دیکھتا ہی رہا۔

"رحیم بھائی!" میں نے کہا۔ "مجھے بہت افسوس ہے کہ تمہارا بھائی مارا گیا ہے۔"

"بھائی!" رحیم نے کہا۔ "کون بھائی...... جھوٹ...... نہیں مارا گیا۔"

"تمہارے کتنے بھائی ہیں رحیم؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارے کتنے بھائی ہیں!" رحیم نے بے تاثر سی آواز میں کہا اور پھر ہنسنا شروع کر دیا۔

"کیا تمہاری بیوی نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟" میں نے پوچھا۔

"بیوی!" رحیم نے سنجیدگی سے کہا۔ "بتایا...... کس کو بتایا......" اور وہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔

میں نے اس کے ساتھ کچھ اور باتیں کیں تو اس نے اوٹ پٹانگ بولنا شروع کر دیا۔

میں پوچھتا کچھ اور تو وہ ہنس پڑتا یا جو منہ میں آیا کہہ دیتا تھا۔ پھر وہ میرے کچھ کہے بغیر ہی پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ اس کی ذہنی کیفیت نے میرے شکوک اور شبہات ختم کر دیئے۔ اس کے باپ کو بلا کر کہا کہ اسے لے جائے۔

میں تھانے جانے کے لیے اٹھ ہی رہا تھا کہ ہیڈ کانسٹیبل آ گیا۔ پوسٹ مارٹم ہو گیا تھا اور لاش آ رہی تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ یہی تھی کہ مقتول کو ہاتھوں سے گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے۔ جسم پر ضرب یا زخم کا کوئی اور نشان نہیں تھا۔ موت رات بارہ اور ساڑھے بارہ کے درمیان واقع ہوئی تھی۔

فسادی اور شیطان فطرت عورت

تھانے جاتے ہی میں نے مخبروں کو طلب کیا۔ مخبروں نے خود ہی آ جانا تھا لیکن میں اپنی عادت کے مطابق چاہتا تھا کہ وہ جلدی آ جائیں۔ معزز قسم کے مخبروں کو بلوانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو تھانے دار کی خوشنودی کی خاطر خود ہی آ جایا کرتے تھے۔ میں سب سے پہلے مقتول کے گھر کے حالات وغیرہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔

سب سے پہلے مقتول کے محلے کا ایک ایسا صاحب حیثیت شخص آیا کہ میں کسی کو بتاتا کہ یہ میرا مخبر ہے تو کوئی بھی تسلیم نہ کرتا۔ تھانے داروں کی تفتیشی کہانیوں سے آپ جان چکے ہوں گے کہ جاسوسی کا سسٹم کس طرح کام کرتا ہے۔ یہاں میں یہ بتانا ضروری نہیں سمجھتا کہ فلاں کس وقت آیا اور اس نے کیا بتایا۔ میں ان سب کی رپورٹوں کا نچوڑ آپ کو سنا دیتا ہوں۔

مجھے اس گھر میں جا کر جو کچھ معلوم ہوا تھا، یہ ساری رپورٹیں اس کی تائید کرتی تھیں۔ مقتول کوئی ایسا شریف آدمی نہیں تھا کہ لوگ اس کی شرافت کے چرچے کرتے اور وہ کوئی ایسا بدمعاش بھی نہیں تھا کہ لوگ اس کا شمار بدمعاشوں میں کرتے۔ مقتول کا گھرانہ کوئی نیک نام گھرانہ نہیں تھا۔ مقتول کا باپ بیوی کا مرید تھا اور گھر سے باہر بڑا چوہدری بنا پھرتا تھا۔

چوہدری کی یہ دوسری بیوی یعنی مقتول کی ماں فسادی اور شیطان فطرت عورت تھی۔ مخبروں کی رپورٹوں سے تصدیق ہو گئی کہ یہ عورت مقتول کی بیوی کو بہت تنگ کرتی تھی۔ اس کی تفصیلات پہلے سنا چکا ہوں۔ یہ بھی ثابت ہو گیا کہ مقتول اور اس کے سالے رضا کی آپس میں دشمنی پیدا ہو چکی تھی۔ ان کی لڑائی بھی ہوئی تھی اور مقتول نے رضا کو چاقو مارا تھا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ رضا نے دو تین بار کہا تھا کہ وہ مقتول کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

ایک معزز مخبر نے کہا کہ اس خاندان پر اللہ کی لعنت ایک نہ ایک دن پڑنی ہی تھی۔ اس چوہدری نے ایک غریب باپ کی بیٹی اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر خریدی اور اپنے پاگل بیٹے کے ساتھ بیاہ دی۔ یہ تو زیادہ تر مخبروں نے بتایا تھا لیکن اس معزز آدمی نے خاص طور پر کہا کہ یہ لڑکی اپنی اور اپنے خاندان کی شرافت میں شہرت رکھتی ہے۔

میں رات بہت دیر تک رپورٹیں سنتا رہا اور اپنا ذہن بناتا رہا۔ اگلے روز علی الصباح پھر ایک دو رپورٹیں آئیں۔ مختصر بات یہ ہے کہ مجھے کوئی نئی بات معلوم نہ ہوئی جس سے میں کسی سراغ تک پہنچ سکتا۔ اس کے بعد میں نے مقتول کی بیوی اور رضا کو، نوکرانی اور اس بدمعاش کو تھانے بلوایا جس کی وہ داشتہ تھی۔ میں نے پہلے نہیں بتایا کہ یہ جرائم پیشہ بدمعاش تھانے کا رجسٹرڈ (بستہ ب) غنڈہ تھا۔ دو تین وجوہات ایسی تھیں کہ اس بدمعاش پر مجھے کوئی زیادہ شک نہیں تھا۔ اس سے زیادہ اہم نوکرانی تھی۔

یہ سب تھانے میں آئے تو میں نے پہلے مقتول کی بیوی کو اپنے پاس بلا کر بٹھایا۔ اس لڑکی میں یہی ایک نقص نکالا جا سکتا تھا کہ اس کا رنگ سانولا تھا لیکن گہرا سانولا نہیں تھا۔ چہرے کے نقش اچھے تھے۔ مطلب یہ کہ خوبصورت نہیں تھی تو بدصورت بھی نہیں تھی۔ میں نے اس سے پہلی بات یہ پوچھی کہ اس کے والدین اس کے خاوند کی موت کی اطلاع پر وہاں گئے تھے؟ بیوی نے بتایا کہ کوئی بھی نہیں گیا اور نہ کوئی جائے گا۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ ان کی دشمنی گہری ہو گئی تھی۔ عام طور پر ناراض رشتہ دار بھی ماتم کی اطلاع پر رسمی طور پر چلے جایا کرتے ہیں۔

میں نے مقتول کی بیوی سے پوچھ گچھ شروع کی تو اس نے بالکل وہی باتیں سنائیں جو میں پہلے سن چکا تھا وہ بھی زیادہ الزام مقتول کی ماں کے سر دھرتی تھی۔ کہتی تھی کہ ماں اس کے اور اپنے بیٹے کے درمیان حائل رہتی تھی۔ برداشت ہی نہیں کرتی تھی کہ اس کا بیٹا بیوی کے ساتھ اچھا اور پیار محبت والا تعلق رکھے۔

بیوی نے ایک بات بالکل ہی نئی بتائی۔ وہ یہ کہ مقتول نے اسے طلاق لکھ کر دے دی تھی پھر اسے جانے دیا تھا لیکن بیوی نے یہ طلاق نامہ صرف اپنے بھائی رضا کو دکھایا تھا اور بھائی نے یہ تحریر اپنے پاس رکھ لی تھی۔ بیوی کے بیان کے مطابق، رضا نے کئی بار اپنے ماں باپ سے کہا تھا کہ طلاق لے لو اور اپنی لڑکی کو اس جہنم سے نکالو لیکن ماں باپ نہیں مانتے تھے۔ اب طلاق نامہ لے کر رضا نے بہن سے کہا کہ ایک دو دنوں بعد ماں باپ کو دکھائے گا

اور پھر عدالت میں خرچے کا دعوئی کریں گے۔

بیوی نے یہ بھی کہا کہ انہیں جب پتہ چلا کہ اس کا خاوند قتل ہو گیا ہے تو بیوی نے اور رضا نے بھی کہا کہ قتل اس کی ماں کو ہونا چاہئے تھا۔

''تم لوگوں نے گھر میں یہ تو سوچا اور آپس میں باتیں کی ہوں گی کہ تمہارے خاوند کو کون قتل کر گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تو قدرتی بات ہے۔'' بیوی نے جواب دیا ''ہم سب خیالوں کے گھوڑے دوڑاتے رہے لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ بھائی رضا نے کہا کہ یہ شخص اپنے آپ کو بدمعاش سمجھنے لگا تھا اور اسی چکر میں کسی کے ہاتھوں پار ہو گیا ہے۔''

میں نے رحیم کی بیوی اور نوکرانی کی بات چھیڑ دی تو مقتول کی بیوی نے مقتول کی بہن کی سنائی ہوئی باتوں کی تصدیق کر دی لیکن اس نے اس واقعہ کا ذکر نہ کیا جس میں مقتول کی بہن نے مقتول کو نوکرانی پر دست درازی کرتے دیکھا تھا۔ اس نے یہی بتایا کہ مقتول نوکرانی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا اور اس کے ساتھ اس طرح بولتا چالتا اور حرکتیں کرتا جیسے وہ نوکرانی نہ ہو بلکہ اس کی دوست ہو اور اسی کی سطح کی عورت ہوں۔

رحیم کی بیوی کے متعلق اس نے کہا کہ جب بھی رحیم باہر نکل جاتا تھا تو مقتول اوپر اس کی بیوی کے پاس جا پہنچتا تھا۔ اس نے بھی رحیم کی بیوی کی شرافت کی بہت تعریف کی اور کہا کہ ساس کی خدمت لونڈیوں کی طرح کرتی اور اس کے اشاروں پر ناچتی تھی اس لیے ساس اس پر بہت خوش رہتی تھی لیکن اصل میں وہ مقتول کی بیوی میں گھل مل گئی تھی۔ اس کی سنتی اور اپنے دل کی سنایا کرتی تھی۔

اس نے اپنے بیان میں کہا کہ رحیم کی بیوی نے اسے بتایا تھا کہ دو مرتبہ ایسے ہوا کہ مقتول اوپر رحیم کے کمرے سے نکل رہا تھا یا شاید کمرے میں ہی تھا کہ رحیم آ گیا اور مقتول وہاں سے کھسک آیا۔ اس نے اپنی بیوی سے پوچھا کہ یہ یہاں کیوں آیا تھا۔ رحیم کی بیوی نے بڑی مشکل سے اسے ٹھنڈا کیا۔ رحیم نے یہ الفاظ کہے تھے کہ پھر کبھی اس کمرے میں آیا تو میں اس کا گلا دبا دوں گا۔

گلا دبانے کی بات سے میں چونکا اور مقتول کی بیوی کے ساتھ ایک شک ذہن میں رکھ کر کچھ باتیں کیں تو بیوی نے اپنی رائے یہ دی کہ رحیم بالکل بے حس آدمی ہے اور وہ کچھ کہتا ہے تو اسے کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کیوں کہہ رہا ہے۔ مقتول کی بیوی یہ بات

یقینی طور پر کہتی تھی کہ رحیم کی اور مقتول کی آپس میں کبھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی جیسے دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔

جھلّے کی بیوی اور نوکرانی کی رازداری

مقتول کی بیوی کے بعد اس کے بھائی رضا کو بلایا۔ اس شخص پر مجھے شک تھا اور اس شک کی بیک گراؤنڈ بھی تھی۔ میں نے بناوٹی سا افسوس اپنی آواز میں پیدا کر کے کہا کہ مجھے بہت افسوس ہوا ہے کہ اس کا بہنوئی مارا گیا ہے۔ رضا نے کہا کہ افسوس اسے بھی ہے لیکن خوشی تب ہوتی کہ اس کی ماں ماری جاتی۔ اصل فساد کی جڑ تو اس کی ماں ہے۔ ماں ایسی نہ ہوتی تو میری بہن بھی خوش رہتی اور یہی خاوند جو ماں کی وجہ سے قتل ہو گیا ہے میری بہن کے ساتھ ٹھیک ٹھاک رہتا جس طرح اچھے میاں بیوی رہتے ہیں۔

یہیں سے رضا نے وہی باتیں شروع کر دیں جو میں پہلے اتنی بار سن چکا تھا کہ زبانی یاد ہو گئی تھیں۔ میں نے اس توقع پر اسے بولنے سے نہ روکا کہ ہو سکتا ہے اس سے کوئی نئی بات معلوم ہو جائے مگر وقت ضائع ہونے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔

میں نے اس کی اور مقتول کی لڑائی کا حوالہ دیا اور پوچھا کہ یہ کہاں تک صحیح ہے کہ مقتول نے اسے چاقو مارا تھا۔ اس نے فوراً سارا واقعہ سنا دیا۔ وہ کہتا تھا کہ میں نے اسے آرام سے سمجھانے کی نیت سے گلی میں روکا تھا۔ میری نیت لڑائی جھگڑے کی تھی ہی نہیں لیکن وہ یک لخت گرم ہو گیا۔ میں نے اسے پھر بھی سمجھایا کہ دیکھو یہ رشتہ کیسا ہے لیکن وہ تو اپنے آپ کو معلوم نہیں کیا سمجھ رہا تھا۔ یہاں سے لڑائی ہوئی۔

''میں حیران ہوں رضا!'' میں نے کہا۔ ''تم جیسا رعب والا آدمی چاقو کا زخم کھا کر بھی کس طرح برداشت کر گیا؟ تم تو اسے اُڑا ہی سکتے تھے۔''

''خدا گواہ ہے ملک صاحب!'' رضا نے کہا۔ ''میں صرف اپنے باپ کی عزت کی خاطر چپ رہا لیکن یہ چوٹ برداشت نہیں کی۔ دو ہی دنوں بعد میں نے مقتول کو قبرستان کی طرف جاتے دیکھا۔ فوراً دو آدمی ساتھ لئے اور میں اس کے پیچھے چلا گیا۔ آگے گہرائی آتی ہے۔ اسے پکڑ کر نیچے لے گئے اور خوب پھینٹی لگائی۔ گھونسوں کی ماردی تاکہ ظاہری کوئی ضرب یا زخم نہ ہو۔ چھڑانے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ بے ہوش نہیں ہوا، باقی کوئی کسر رہنے نہیں دی۔ اب دیکھیں ملک صاحب! یہ شخص کتنا کچھ بہادر تھا۔ گھر جا کر میری بہن کو مارا پیٹا اور اپنی ماں سے بھی پٹوایا اور طلاق لکھ کر بہن کے ہاتھ میں دی اور گھر سے نکال دیا۔''

''میری بات سنو رضا بھائی!'' میں نے کہا۔ ''چھوڑو ان لمبی چوڑی باتوں کو، تمہیں میں اپنا دوست سمجھتا ہوں۔ تم مجھے اپنا دوست سمجھو۔ میں کہتا ہوں تم نے اپنی بہن کی پٹائی اور طلاق کا انتقام اس طرح لیا کہ مقتول کو قتل کر دیا۔ تم ہاں کہو اور پردہ میں ڈالوں گا۔''

اس کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہ ذرا سا بھی نہ چونکا۔ صرف یہ تبدیلی آئی کہ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی جو شاید طنزیہ تھی۔

''جناب ملک صاحب!'' اس نے کہا۔ ''یہ آپ کا حق بھی ہے اور آپ کو اختیار بھی حاصل ہے کہ جس پر چاہیں اس پر قتل کا یا کسی بھی جرم کا الزام عائد کر دیں۔ میں عرض کروں گا کہ میرے لیے کسی کو قتل کروانا کوئی مشکل کام نہیں۔ اس شخص کو اگر میں قتل کرنے کا ارادہ کر لیتا تو جہاں قبرستان سے پرے اسے مارا پیٹا تھا وہیں کہتا کہ اسے ختم کر دو اور یہیں کہیں زمین میں دبا دو۔ میں صرف قتل کرتا، مار پٹائی کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ پھر یہ بھی سوچیں کہ اس کے گھر جا کر قتل کرنا کتنا خطرناک کام تھا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ رات کو وہ کون سے کمرے میں سوتا ہے۔ میں تو اس سے بہن کی طلاق لینا چاہتا تھا جو اس نے دے دی ہے۔ میں نے اگلے ہی روز ایک وکیل کے ساتھ بات کر لی تھی کہ اس شخص پر بچی کے خرچے کا دعویٰ دائر کروں گا......

''اگر آپ کو یقین نہ آئے تو اس وکیل کو بلا کر پوچھ لیں اور پھر میں آپ کو ان دو آدمیوں کے نام بتا دیتا ہوں جن سے میں نے مقتول کو پٹوایا تھا۔ دو اور آدمی ہیں جنہیں یہ بات معلوم ہے۔ ان سب کو بلا لیں اور پوچھ لیں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ قتل ہی کرنا ہوتا تو میں مقتول کی ماں کو قتل کرتا۔''

یہ نہ سمجھیں کہ میں نے اس کی اس بات پر یقین کر لیا اور اسے چھوڑ دیا۔ میں اس سے کچھ نہ کچھ پوچھتا رہا اور جرح بھی کرتا رہا اور بات سے بات نکال کر اسے اس مقام تک لانے کی کوشش بھی کرتا رہا جہاں مشتبہوں اور ملزموں کے منہ سے بے اختیار اقبالی بات نکل جاتی ہے لیکن یہ شخص پورے اعتماد کے ساتھ میری ہر بات کا تسلی بخش جواب دیتا چلا گیا، پھر بھی میں نے اسے بالکل صاف نہ سمجھا اور اسے کہا کہ وہ تھانے میں ہی رہے کیونکہ مجھے اس کی ضرورت پڑتی رہے گی اور وہ اپنی بہن کو گھر بھیج دے۔

نوکرانی اور دس نمبر یا بدمعاش آئے بیٹھے تھے۔ میں نے پہلے نوکرانی کو بلایا۔ اسے دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ واقعی اس عورت میں ایک خاص قسم کی کشش ہے۔ چہرہ بھی اچھا،

چہرے کا رنگ بھی اچھا اور جسمانی ساخت تو خاص طور پر بہت ہی اچھی تھی۔ اس کے چہرے پر جو تاثرات تھے ان سے میں بڑی اچھی طرح واقف تھا۔ اسے بٹھایا اور بے تکلفی کے انداز سے کچھ باتیں کر کے اس کی گھبراہٹ کم کی اور یہ بھی کہا کہ اس پر کوئی الزام نہیں، اس سے کچھ باتیں معلوم کرنی ہیں۔

میں اس کے بیان کو طول نہیں دوں گا کیونکہ اس نے مقتول کے گھر اور گھر کے ہر فرد کے متعلق وہی تفصیلات سنائیں جو پہلے ہی مجھ تک پہنچ چکی تھیں۔ مقتول کے اخلاق اور چال چلن کے متعلق مقتول کی بہن نے جو باتیں سنائی تھیں وہی اس نوکرانی نے بھی سنائیں۔ وہ واقعہ بھی سنا دیا جس میں مقتول نے کمرے میں اس پر دست درازی کی تھی۔ مجھے شک یہ تھا کہ اس نے اپنے دس نمبریئے بدمعاش یار کو بتایا ہو گا اور اس شخص نے مقتول کو قتل کروایا لیکن ایک تو یہ شک کمزور تھا اور اس کے ساتھ یہ خیال بھی آتا تھا کہ قتل کرنا ہوتا تو کہیں باہر کرتا، گھر میں آ کر اس طرح قتل کرنا میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ نوکرانی نوکری چھوڑ کر چلی نہ جاتی اور اس گھر میں موجود ہوتی تو پھر شک پختہ ہو سکتا تھا کہ اس عورت نے مقتول کا گلا گھونٹا ہے۔ اشتعال کی وجہ موجود تھی لیکن نوکرانی اس گھر میں نہیں تھی۔

اسے بھی میں نے سوال و جواب اور جرح کی چکی میں پیسنا شروع کر دیا۔ اس نے بڑی جرأت سے تسلیم کیا کہ وہ اس دس نمبریئے جرائم پیشہ بدمعاش کی باقاعدہ داشتہ ہے۔ اپنے خاوند کے متعلق اس نے بتایا کہ دوسری کمزوریوں کے علاوہ وہ چرس کا نشئی بھی ہو گیا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ نوکری صرف اس خیال سے کرتی ہے کہ لوگ یہ سمجھیں کہ حلال کی کمائی پر گزارہ کرتی ہے۔

پھر اس نے بتایا کہ مقتول نے جب اس پر دست درازی شروع کر دی تھی تو اس نے اس بدمعاش کو بتایا تھا۔ اس بدمعاش نے اسے کہا تھا کہ یہ بہت بڑا گھر ہے اس لیے ان سے ٹکر نہیں لی جا سکتی، بہتر ہے نوکری چھوڑ دی جائے۔ اس طرح نوکرانی نے اس گھر کی نوکری چھوڑ دی۔ اس نے یہ بات بڑے فخر سے کہی کہ اس شہر کا کوئی آدمی نہیں کہہ سکتا کہ میرے اس کے ساتھ ایسے ویسے تعلقات ہیں۔

اتنی سی بات تو میں سمجھتا تھا کہ یہ عورت خاصی مکار ہے پھر بھی اس نے مجھے مطمئن کر دیا تھا۔ میں نے اس سے رحیم اور اس کی بیوی کی بات شروع کر دی۔ اس کی رپورٹ اور رائے بالکل وہی تھی جو مقتول کی بہن اور مخبر دے چکے تھے۔ نوکرانی نے بتایا کہ اوپر کے کمروں کی

جھاڑ پونچھ وہی کیا کرتی تھی۔ رحیم کی بیوی نے نوکرانی کے ساتھ ایک قسم کی دوستی یا راز داری پیدا کر لی تھی۔ یہ میں جانتا تھا کہ یہ دوستی اس نوکرانی نے پیدا کی ہو گی۔ بہرحال اس دوستی سے مجھے اب یہ فائدہ ہو رہا تھا کہ کچھ اور باتیں معلوم ہو گئیں۔ ایک بات تو یہ تھی کہ مقتول رحیم کی بیوی کے ساتھ غلط مراسم قائم کرنا چاہتا تھا اور بیوی بہت ہی پریشان تھی اور کبھی کبھی نوکرانی کے ساتھ بات کرتے اس کے آنسو نکل آتے تھے۔

نوکرانی نے ایک اور بات سنائی جس نے مجھے سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ یہ بات اس طرح ہوئی کہ میں نے نوکرانی سے پوچھا کہ رحیم کی مزاجی کیفیت کیسی رہتی ہے۔ ایک خاص خیال کے تحت میں رحیم کے غصے کے متعلق کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ نوکرانی نے بتایا کہ غصہ اسے کبھی کبھی آتا تھا اور جب غصہ آتا تھا تو پھر اس پر قابو پانا مشکل ہو جاتا تھا۔

نوکرانی نے ذرا ہنستے ہوئے بتایا کہ دو تین مہینے پہلے وہ ان کے کمروں کی صفائی کر رہی تھی۔ رحیم وہیں موجود تھا۔ پڑوسیوں کی ایک مرغی کسی طرح فصیل پر پہنچ گئی اور وہاں سے اِدھر اُتر آئی اور رحیم کے کمرے میں آ گئی۔ وہاں اس نے بیٹ کر دی۔ نوکرانی نے غصے سے کہا کہ مرغی نے کیا گند ڈال دیا ہے۔ رحیم نے دیکھا تو دروازہ بند کر لیا اور مرغی کو پکڑ لیا۔ وہیں مرغی کی گردن ایسی دبائی کہ مرغی مر گئی اور رحیم اسے پہلو والی گلی میں پھینک آیا۔

اس کے بعد میں نے بہت سوچا اور دس نمبریے بدمعاش کو اندر بلا کر بیان لینا ضروری نہ سمجھا۔ نوکرانی کو باہر بھیج دیا تو یہ دس نمبریا خود ہی اندر آ گیا اور مجھ سے سلام دعا کی اور پوچھا کہ حضور ہمارے لیے کوئی خدمت ہو تو ہم حاضر ہیں۔ میں نے اسے فارغ کر دیا اور وہ نوکرانی کو ساتھ لے کر چلا گیا۔

گھڑی دیکھی، رات کے دس بج چکے تھے۔ سارا دن تفتیش میں گزر گیا تھا۔ اب رحیم کی بیوی کو بلانا ضروری ہو گیا تھا لیکن رات کے اس وقت بلانا مناسب نہ سمجھا۔ اگلی صبح تک ملتوی کر دیا۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ صبح جب میں تھانے میں آؤں تو رحیم کی بیوی یہاں موجود ہو۔

قتل کی رات کی بات

میں صبح اس وقت تھانے پہنچا جب سورج طلوع ہو رہا تھا۔ یہ قتل کا کیس تھا جس کی تفتیش کو چند منٹوں کے لیے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ رحیم کی بیوی آ گئی تھی۔ مقتول کا

باپ اس کے ساتھ تھا۔ میں دونوں کو دفتر میں لے گیا اور مقتول کے باپ کو تسلی دے کر باہر بھیج دیا اور رحیم کی بیوی کو اپنے سامنے بٹھا لیا۔

نو عمر اور بھولی بھالی لڑکی تھی۔ چہرے پر معصومیت بڑی نمایاں نظر آتی تھی۔ شکل و صورت تو بہت ہی اچھی تھی۔ وہ ڈری ڈری سی لگتی تھی جو قدرتی بات تھی۔ میں نے حسبِ عادت اس کے ذہن اور دل سے یہ ڈر اتارنے کے لیے بہت کچھ کہا۔ میرے لہجے اور انداز میں شفقت بڑی نمایاں تھی۔

میں نے بات شروع کی تو اس نے میری پوری بات سنے بغیر التجا کے لہجے میں کہا کہ اس کے منہ سے کوئی راز کی بات نکل جائے تو میں اللہ کے واسطے کسی کو پتہ نہ چلنے دوں۔ اس نے صاف الفاظ میں کہا کہ وہ غریب گھر کی لڑکی ہے اور سسرال بہت امیر لوگ ہیں، ایسا نہ ہو کہ ذرا سی بات پر گھر سے نکال باہر کریں۔ میرے دل میں پہلے ہی اس کی ہمدردی پیدا ہو چکی تھی۔ میں نے اسے بڑے پیار سے یقین دلایا کہ میں اس کی ہر بات پردے میں رکھوں گا۔

اس نے بات شروع تو کر دی لیکن میں نے دیکھا کہ رک رک کر بولتی تھی اور ڈرتی تھی کہ کوئی ایسی ویسی بات زبان پر نہ آ جائے۔ چونکہ مجھے اس کے متعلق اور اس کے سسرال گھر کی ساری باتیں معلوم ہو چکی تھیں، اس لیے میں نے اسے لقمے دینے شروع کر دیئے اور وہ بولتی گئی۔ پھر میں نے اسے بتا دیا کہ مجھے سارے حالات معلوم ہیں۔ مثال کے طور پر اسے دو باتیں بتائیں تو اس کے چہرے پر کچھ سکون نظر آنے لگا۔

اس نے تصدیق کر دی کہ اس کا خاوند اس احساس سے محروم ہے کہ وہ خاوند ہے اور یہ لڑکی اس کی بیوی ہے۔ البتہ وہ پیار اور محبت کو سمجھتا تھا۔ اس لڑکی کو میں اصلی نام کی بجائے نسرین لکھوں گا۔ ایک تو نسرین بات کرتے ڈرتی تھی اس لیے رک رک کر بول رہی تھی، دوسرے میں نے محسوس کر لیا کہ یہ زیادہ بولنے والی لڑکی ہے ہی نہیں۔ میں اس کے بیان کو بھی طول نہیں دوں گا کیونکہ اس نے اپنی شادی پھر ازدواجی زندگی کے متعلق جو بیان دیا وہ بالکل ان بیانات کی تصدیق تھی جو میں مختلف افراد کی زبانی پیش کر چکا ہوں۔

میری حوصلہ افزائی سے اس نے ذرا روانی سے بولنا شروع کر دیا۔ مختصراً یوں کہ ان تینوں بہنوں سے ان کا باپ بہت ہی پیار کرتا تھا۔ باپ کی غربت اور مجبوری کی بات تو پہلے سنائی ہے، نسرین نے کہا کہ اس نے اپنے پیارے اور معزز باپ کے لیے یہ قربانی دی کہ ایک پاگل خاوند قبول کر لیا اور ابھی تک اس نے اپنے دل میں بھی شکایت پیدا نہیں کی کہ اس کے

ساتھ ظلم ہوا ہے۔ باپ کا قرض ادا ہو گیا اور وہ ایک بیٹی کے فرض سے فارغ ہو گیا تو یہی خوشی نسرین کے لیے بہت تھی۔ اس معصوم لڑکی نے مجھے بیان دیتے ہوئے کہا کہ وہ اللہ کا شکر ادا کرتی ہے۔ اگر لوگ کہتے ہیں کہ اسے باپ نے بیچ ڈالا ہے تو کہتے رہیں۔

نسرین کے یہ الفاظ مجھے آج بھی اتنی مدت کے بعد تک یاد ہیں۔ ’’اگر میں نے کوئی گناہ کیا ہے یا بھولے بھٹکے کوئی گناہ ہو گیا ہے تو اس شادی کو اس گناہ کی سزا سمجھ کر قبول کرتی ہوں اور اگر یہ میری نیکی ہے کہ ایک پاگل اور پیار کے پیاسے خاوند کو پیار اور سکون دے رہی ہوں تو اسے میں اپنی کسی نیکی کا اجر سمجھتی ہوں۔ اگر یہی نیکی ہے تو اللہ مجھے اور اجر دے گا۔‘‘

نسرین صوم وصلوٰۃ کی پابند تھی۔ مقتول کی ماں کو اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ اس عورت کی فطرت میں فتنہ فساد بھرا ہوا ہے لیکن نسرین صرف اس لیے اس کی ہر بات مانتی اور اس کی خدمت کرتی تھی کہ اس کا اپنا ٹھکانہ بنا رہے۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ مقتول کی بیوی کے ساتھ اس عورت کا رویہ کیا ہے۔ نسرین اس انتہائی برے رویے سے ڈرتی ساس کو خوش رکھتی تھی۔

نسرین شاید چار پانچ جماعتیں ہی پڑھی تھی لیکن کچھ ایسی باتیں بھی سمجھ لیتی تھی جو بعض تعلیم یافتہ لوگ بھی نہیں سمجھتے یا سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔ وہ جان گئی تھی کہ رحیم پیار کا پیاسا ہے۔ اتنی چھوٹی عمر میں ماں کی مامتا سے محروم ہوا اور سوتیلی ماں کی بے رخی اور پھر برے سلوک کا شکار ہو گیا اور اس کی ذہنی خرابی کی وجہ یہ تھی۔ نسرین رحیم کے لیے سراپا پیار بن گئی تھی۔ وہ ہر نماز کے بعد رحیم کی ذہنی صحت یابی کی دعا مانگتی تھی اور رات کو کچھ وظائف پڑھ کر رحیم کے جسم پر پھونکیں مارتی تھی۔

میں چونکہ نسرین کے ساتھ شفقت سے پیش آ رہا تھا اس لیے اس نے ایسی باتیں بھی سنا ڈالیں جن کا تفتیش کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں نے اسے روکا ٹوکا نہیں۔ مجھے توقع تھی کہ راز کی کوئی نہ کوئی بات اسی روانی میں اس کے منہ سے نکل جائے گی۔

میں اسے ایسے طریقے سے آہستہ آہستہ اپنی بات پر لے آیا کہ اسے محسوس ہی نہ ہو سکا کہ میں اس کے ذہن پر قابض ہو گیا ہوں۔ اس روانی میں اس نے بتایا کہ رحیم رات کو دوسرے کمرے میں سویا کرتا تھا۔ یہ نسرین کی دانشمندی تھی کہ اس نے رحیم پر کبھی جبر نہیں کیا تھا کہ دونوں ایک ہی کمرے میں سوئیں۔ ہر آٹھ دس روز بعد نسرین پیار و محبت کے ذریعے رحیم کو رات اپنے پاس سلانے میں کامیاب ہو جاتی تھی لیکن رحیم میاں بیوی کے تعلقات سے بیگانہ تھا۔

میں نے نسرین کو یاد دلایا کہ دو مرتبہ مقتول اس کے کمرے میں گیا تھا اور اچانک رحیم آ گیا تھا...... نسرین نے اس کی تصدیق کر دی۔ مقتول رحیم کو دیکھ کر کمرے سے نکل گیا تو رحیم نے کہا تھا کہ یہ پھر یہاں آیا تو میں اس کا گلا دبا دوں گا۔

اسی روانی میں بڑی معصومیت اور بھول پن کے ساتھ نسرین نے قتل کی رات کا وقوعہ سنا دیا۔ وہ اس طرح کہ نسرین گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ اس رات رحیم ساتھ والے کمرے میں سویا تھا۔ نسرین نے صحیح وقت نہ بتایا، اسے وہ آدھی رات کہتی تھی۔ ہوا یوں کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھ ویسے ہی نہیں کھل گئی تھی بلکہ کسی نے اسے آہستہ سے ہلا کر جگایا تھا۔ اس نے دیکھا کہ پلنگ پر کوئی بیٹھا ہے۔ وہ اسے رحیم سمجھ کر بڑی تیزی سے اٹھ بیٹھی لیکن وہ رحیم نہیں بلکہ مقتول تھا۔ نسرین اچھل کر پلنگ سے اٹھی اور فرش پر کھڑی ہو گئی۔

مقتول نے اٹھ کر اسے اپنے بازوؤں میں لینا چاہا اور ساتھ منت سماجت بھی کی کہ وہ شور نہ کرے۔ نسرین نے بلند آواز سے کہا کہ تم یہاں کیا لینے آئے ہو، فوراً نکل جاؤ۔

مقتول کو شاید پہلے ہی پتہ چل گیا تھا کہ آج رات رحیم دوسرے کمرے میں سویا ہے۔ نسرین نے مجھے بتایا کہ مقتول کو یقیناً معلوم تھا کہ رحیم رات نیند کی گولی کھا کر سوتا ہے اور اسے کوئی ہوش نہیں رہتی۔ اس وقت مقتول نسرین کے لیے بھوکا بھیڑیا بنا ہوا تھا۔ یہ اس کی دلیری اور جرأت کی انتہا تھی۔

نسرین نے یہ واقعہ سناتے ہوئے کہا کہ وہ اگر دوڑتی نیچے جاتی اور مقتول کی ماں کو جگا کر بتاتی کہ مقتول نے اس پر دست درازی کی ہے تو ماں مقتول ہی کی طرف داری کر کے اسے بے گناہ ثابت کر دیتی اور پھر نسرین کے لیے کوئی مصیبت کھڑی ہو جاتی لیکن نسرین ایک شیطان کے آگے ہتھیار ڈالنے والی لڑکی نہیں تھی۔

مقتول نسرین پر لپک لپک پڑتا تھا اور نسرین اس سے بچنے کی کوشش میں کبھی اِدھر کبھی اُدھر ہوتی اور اس دوران اس نے لائٹ آن کر دی پھر دونوں کمروں کے درمیان والے دروازے تک جا پہنچی۔ دروازہ کھلا تھا۔ مقتول نے اسے پکڑنا چاہا تو نسرین ایک کواڑ سے لگی تو یہ کواڑ پیچھے دیوار سے لگا اور اچھا خاصا دھماکہ ہوا۔ اس سے رحیم کی آنکھ کھل گئی۔ نسرین بڑی تیزی سے اس تک پہنچی اور اسے جھنجھوڑا۔

''او بے غیرت!'' نسرین نے روتے اور چلاتے ہوئے رحیم سے کہا۔ ''میں تیری عزت ہوں، اٹھ کے دیکھ...''

رحیم تیزی سے یہ پوچھتا ہوا اٹھا، کیا ہوا ہے۔ نسرین نے مقتول کا نام لے کر کہا کہ وہ مردود میرے پلنگ چڑھ آیا تھا۔ اس اثنا میں مقتول وہاں سے کھسکا۔ رحیم نے شاید اسے دیکھ لیا تھا۔ رحیم نسرین کو ایک طرف کر کے نسرین والے کمرے میں گیا۔

نسرین رحیم کے پلنگ پر بیٹھ کر اور منہ دونوں ہاتھوں سے چھپا کر ذرا اونچی آواز میں رونے لگی۔ اس گھر میں تو اس کی عزت بھی محفوظ نہیں تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اچانک اسے خیال آیا کہ رحیم کہاں ہے، کہیں مقتول کے ساتھ اس کی لڑائی نہ ہو گئی ہو۔ وہ بدک کر اٹھی اور دوسرے کمرے میں گئی۔ رحیم وہاں نہیں۔ نسرین باہر نکلی اور سیڑھیوں کی طرف گئی تو اسے رحیم اوپر آتا دکھائی دیا۔ وہ سیڑھیاں چڑھتا آ رہا تھا، نسرین نے اس سے پوچھا کہاں گئے تھے؟ رحیم نے کوئی جواب نہ دیا اور نسرین کا بازو پکڑ کر کہا اندر چل اور اندر لے جا کر نسرین کو اپنے ساتھ لٹا لیا...... نسرین مجھے یہ وقوعہ سناتے سناتے اچانک چپ ہو گئی اور اس کے چہرے پر پریشانی کا تاثر آ گیا جیسے اسے اچانک کوئی بات یاد آ گئی ہو اور یہ بات بڑی ہی خوفناک ہو۔

''بھائی جان!'' نسرین نے مجھے کہا۔ ''آپ یہ شک تو نہیں کریں گے کہ قتل رحیم نے کیا ہے!...... وہ تو ویسے ہی نیچے چلا گیا اور واپس آ گیا تھا۔''

میں نے انجان اور اناڑی بنتے ہوئے اسے تسلی دی کہ میں ایسا شک نہیں کروں گا اور اسے شک نہ ہونے دیا کہ مجھے معمے کا حل مل گیا ہے۔ قاتل رحیم تھا اور اس نے مقتول کا گلا دبایا تھا۔ میرے پاس کوئی ثبوت نہ تھا سوائے اس کے کہ رحیم کو جس پر غصہ آتا تھا اس کا وہ گلا دبانے کی بات کرتا تھا لیکن رحیم کو گرفتار کرنے کے لیے اتنی سی بات کافی نہیں تھی بلکہ یہ کوئی شہادت نہیں تھی۔ نسرین کہہ سکتی تھی کہ اس نے ایسا کوئی واقعہ سنایا ہی نہیں نہ کوئی ایسی بات کی ہے۔

اب دیکھیے خداوند تعالیٰ کس طرح میری مدد کرتا ہے۔ میں نسرین سے کچھ اور باتیں پوچھ رہا تھا اور اب وہ خود ہی محتاط ہو کر جواب دیتی تھی۔ اتنے میں میرے دفتر کا بند دروازہ بڑی ہی زور سے کھلا۔ دونوں کواڑ دیواروں سے لگے۔ میں نے غصے سے چونک کر ادھر دیکھا تو دروازے میں رحیم کھڑا تھا اور اس کا باپ اسے پیچھے گھسیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا غصہ وہیں ختم ہو گیا۔ میں نے رحیم کے باپ سے کہا اسے اندر آنے دو چوہدری!

رحیم مجھے غصے سے گھورتا ہوا بڑی تیزی سے اندر آیا اور نسرین کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس سے پوچھا تم یہاں کیوں آئی ہو۔ نسرین اٹھ کھڑی ہوئی اور جواب دیا کہ تھانے دار صاحب

نے بلایا تھا۔

"تم ہو تھانے دار؟" رحیم نے ہاتھ میری طرف غصے سے بڑھا کر کہا۔ "اسے تم نے بلایا ہے...... میں تمہارا گلا دبا دوں گا۔" اس نے نسرین کو اپنے بازو میں لیا اور کہا۔ "آؤ چلیں۔"

میں نے غصے کا ذرا سا بھی اظہار نہ کیا۔ رحیم کا باپ بھی اندر آ گیا تھا اور وہ رحیم کو بازو سے پکڑ کر باہر گھسیٹ رہا تھا۔ میں نے اسے منع کیا لیکن وہ باز نہ آیا اس نے رحیم سے کہا کہ تھانے دار صاحب قتل کی تفتیش کر رہے ہیں اور انہوں نے نسرین کو اسی سلسلے میں بلایا ہے۔ اسے ابھی ساتھ نہ لے جاؤ۔

مجھے چوہدری پر غصہ آیا کہ وہ رحیم کو غصہ دلا رہا ہے اور میں جو اس سے پوچھنا چاہتا ہوں وہ نہیں پوچھ سکوں گا لیکن اس کا نہایت اچھا اثر ہوا۔ رحیم پاگلوں کے انداز سے بڑی زور سے کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا، پوچھو، مجھ سے پوچھو۔

میں نے چوہدری اور نسرین کو باہر بھیج دیا اور دروازہ بند کر لیا۔ رحیم کو خوش کرنے کے لیے اس کے باپ کو برا بھلا کہا اور یہ بھی کہا یہ خواہ مخواہ تم جیسے اچھے اور شریف آدمی کو پریشان کرتے ہیں۔

"تم اپنی کرسی پر بیٹھو۔" رحیم نے میری کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "اور پوچھو کیا پوچھتے ہو...... تم یہ پوچھتے ہو کہ اس حرام زادے کا گلا کس نے دبایا ہے۔ وہ میں نے دبایا تھا...... اب پوچھو...... چپ کیوں بیٹھ گئے ہو۔"

"شاباش!" میں نے کہا۔ "تم نے بہت اچھا کام کیا ہے...... اب یہ بتاؤ تم نے اس کا گلا کیوں اور کس طرح دبایا تھا؟"

"یہ نسرین ہے نا!" رحیم نے کہا۔ "یہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ میرے ساتھ رہتی ہے۔ میں اس کو کہیں نہیں جانے دوں گا۔ بہت پیار کرتی ہے۔ اس خبیث آدمی نے اس کو تنگ کیا تھا۔ وہ نیچے چلا گیا تو میں نے جا کر اس کا گلا دبا دیا۔ وہ گر پڑا اور میں اوپر آ گیا۔"

یہ تو بہت ہی مختصر باتیں ہیں جو میں نے لکھی ہیں۔ اس کے ساتھ کچھ لمبی گفتگو ہوئی تھی اور وہ پاگلوں کی طرح جواب دیتا رہا اور کبھی قہقہہ لگا کر ہنستا بھی تھا۔ میں نے اسے باقاعدہ حراست میں لے لیا۔

اب میرے سامنے دو مسئلے تھے۔ ایک یہ کہ اس ذہنی معذور ملزم سے اقبالی بیان کس

طرح لوں اور دوسرا یہ کہ شہادت اور ثبوت کس طرح فراہم کروں۔ نہایت اہم گواہ نسرین تھی جو صاف انکار کر سکتی تھی کہ مقتول اس کے کمرے میں گیا ہی نہیں تھا۔ بہر حال یہ بڑی لمبی بات ہے جو قارئین کے لیے ذرا سی بھی دلچسپی نہیں رکھتی۔ یہ میرا کام تھا اور اس کے لیے میں نے اپنے انگریز ڈی ایس پی سے رہنمائی مانگی تھی۔

اگلے ہی روز رحیم کا باپ ایک ہندو وکیل کو ساتھ لئے تھانے میں آ گیا۔ اس وکیل کو وہ ضلع کے مرکزی شہر سے لایا تھا جہاں سیشن کورٹ تھی۔ اس وکیل نے کہا کہ وہ ملزم کا ڈاکٹری معائنہ کرانا چاہتا ہے اور معلوم ہوا ہے کہ ملزم ذہنی طور پر معذور ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں اس وکیل کو جانتا تھا۔ بڑا ہی قابل اور تجربہ کار وکل تھا۔ یہ ملزم کا حق تھا جو یہ وکیل مانگ رہا تھا۔ رحیم کے ڈاکٹری معائینے کا انتظام کیا گیا۔

پاگل خانے سے پاکستان تک

میں اب آپ کو سیدھا سیشن کورٹ میں لے جاتا ہوں جہاں رحیم کے خلاف دفعہ 302 (قتل) کا کیس چلا تھا۔ صفائی کے اس ہندو وکیل نے پہلے روز ہی یہ مؤقف اختیار کر لیا کہ ملزم ذہنی طور پر معذور ہے اور یہ اپنے اعمال اور حرکات کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس نے بڑی لمبی چوڑی اور عالمانہ بحث کی اور قانون کے حوالے دیئے۔ یہ بھی بتایا کہ ملزم دلی کے دو مشہور اور تجربہ کار ذہنی امراض کے ڈاکٹروں کے زیر علاج ہے اور ان دونوں ڈاکٹروں کو کورٹ میں پیش کیا جائے۔

کورٹ میں رحیم کا رویہ اور اس کی حرکات اور اس کے قہقہے اور پھر اس کے آنسو صاف بتا رہے تھے کہ یہ شخص دماغی طور پر صحیح نہیں لیکن ایسی حرکات تو ہوش مند ملزم بھی کر سکتے ہیں۔ جج صرف پاگلانہ حرکات سے متاثر نہیں ہوا کرتے۔

رحیم کے باپ نے بیٹے کو بچانے کے لیے خزانے کے منہ کھول دیئے تھے۔ اگلی پیشی پر وہ دونوں ڈاکٹروں کو دلی سے اپنے خرچ پر لے آیا۔ ذہنی امراض کے اینگلو انڈین سپیشلسٹ کو سرکاری حیثیت بھی حاصل تھی۔ اس نے کورٹ میں آ کر ایسا تجزیہ پیش کیا کہ جج متاثر ہو گیا۔ دوسرے ڈاکٹر نے بھی اس کی تائید میں اپنا تجزیہ پیش کیا۔

سیشن جج نے سرکاری طور پر مقرر کئے ہوئے ذہنی امراض کے دو سپیشلسٹ ڈاکٹر طلب کئے اور ملزم کا معائنہ ان کے سپرد کر دیا۔ اگلی پیشی پر ان دونوں ڈاکٹروں نے رحیم کو پاگل قرار دے دیا۔ سیشن جج نے قانون کے ضروری تقاضے پورے کئے۔ چوہدری نے گواہ بھی پیش

کر دیئے اور آخر میں سیشن جج نے یہ فیصلہ دے دیا کہ ملزم دماغی طور پر معذور ہے اور اسے پاگل خانے میں بھیج دیا جائے۔

میں نے اس کہانی سے یہ حصہ حذف کر دیا ہے کہ قانونی تقاضے کیا کیا تھے اور وہ کس طرح پورے کئے گئے اور مقدمے کی سماعت کس طرح ہوئی۔ یہ تفصیل بہت لمبی ہونے کے علاوہ ٹیکنیکل بھی ہے اور قارئین کے لیے غیر دلچسپ بھی۔ میں قارئین کی دلچسپی کی ایک اور بات سنانا چاہتا ہوں۔ کہانی پہلے ہی بہت لمبی ہوگئی ہے۔

رحیم کو لاہور کے پاگل خانے میں بھیج دیا گیا اور میرا کیس ختم ہوگیا۔ میری کامیابی یہ تھی کہ میں نے قاتل کو پکڑ لیا تھا۔

چودہ پندرہ سال بعد جب اس برصغیر میں ایک خونی انقلاب آکر گزر گیا تھا اور پاکستان کے نام کا ایک نیا ملک وجود میں آکر گیارہ بارہ سال پرانا ہو چکا تھا اور قتل کا یہ کیس میرے ذہن سے صاف ہوگیا تھا۔ راولپنڈی کی مال روڈ پر مجھے ایک خوش پوش اور خوش وضع آدمی ملا اور یہ کیس یاد دلایا۔ مجھے کچھ بھی یاد نہ آیا۔

''میرا نام رحیم ہے۔'' اس نے کہا۔

پھر بھی مجھے کچھ یاد نہ آیا۔ یہاں میں فرضی نام استعمال کر رہا ہوں کیونکہ اسے میں اخلاقی پابندی سمجھتا ہوں۔ رحیم کا اصل نام کچھ اور تھا۔

فلیٹی ہوٹل میں بیٹھ کر رحیم نے جب اس کیس کی تفصیلات بیان کیں اور یہ بتایا کہ وہ وہی پاگل ملزم ہے جسے لاہور پاگل خانے میں بھیج دیا گیا تھا تو مجھے یاد آ گیا اور اب رحیم کو دیکھا تو حیرت سے میرا منہ کھل گیا اور آنکھیں ٹھہر گئیں۔ میں نے اس سے پوچھا، کیا وہ ذہنی خرابی کی ایکٹنگ کرتا رہا تھا؟ پاگل خانے میں گئے ہوئے ذہنی مریض کم ہی ٹھیک ہو کر باہر آیا کرتے ہیں۔

''نہیں ملک صاحب!'' اس نے کہا۔ ''وہ ایکٹنگ نہیں تھی، میں واقعی ذہنی طور پر مریض ہو گیا تھا اور مجھے پاگل قرار دینے والوں نے غلط فیصلہ نہیں دیا تھا۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں کس طرح شعور کی دنیا میں واپس آیا ہوں۔''

ماہر نفسیات بتاتے ہیں کہ ذہن ایک بہت بڑی قوت ہے۔ ذہن انسان کو تباہی کی کھائیوں میں پھینک سکتا ہے اور ذہن ہی ان کھائیوں سے نکالنے کی طاقت رکھتا ہے۔ میں رحیم کی داستان مختصراً سنا دیتا ہوں پھر دیکھیں کہ ذہن کیا کیا کرشمے دکھاتا ہے۔

اڑھائی تین سال کی عمر میں رحیم مامتا سے محروم ہوا۔ وہ روتا تھا اور ماں کو یاد کرتا تھا۔ باپ نے دوسری شادی کر لی اور اس سوتیلی ماں نے رحیم پر جبر اور تشدد شروع کر دیا۔ باپ کا رویہ بھی مشفقانہ نہ رہا۔ گیارہ بارہ سال عمر تک رحیم کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس پر کیا کیا ظلم و ستم ہوئے۔ اس کے بعد اسے باتیں خواب کی طرح یاد تھیں۔

پھر جوں جوں اس کی عمر آگے بڑھتی گئی اس کا رویہ کچھ اور ہی طرح ہوتا گیا۔ اس نے ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ اسے کوئی احساس نہیں تھا کہ وہ کوئی حرکت غلط کر رہا ہے۔ مثلاً دانستہ ایک دو برتن توڑ کر وہ ہنسا کرتا تھا۔ اس طرح وہ ذہنی مریض ہوتا چلا گیا۔ اسے اتنا ہی یاد تھا کہ وہ اذیت سی محسوس کرتا تھا جس سے اس کے آنسو نکل آتے تھے اور پھر خیالوں ہی خیالوں میں کوئی ایسی خوش گوار تصویر سامنے آجاتی کہ وہ ہنسنا شروع کر دیتا تھا۔

اس کے بعد اسے کوئی بات یاد نہیں آ رہی تھی۔ بہت کوشش کر کے اس نے ایک دو باتیں مجھے سنائیں لیکن یہ بھی کہا کہ اسے وہ خواب سمجھتا ہے۔

اسے بالکل یاد نہیں تھا کہ نسرین کے ساتھ اس کی شادی ہوئی تھی۔ پھر اسے یاد آنے لگا کہ یہ لڑکی اس سے محبت اور پیار کرتی تھی۔ یہاں اسے کچھ باتیں یاد آنے لگیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اسے مامتا یا پیار واپس مل رہا تھا جو اسے نسرین دے رہی تھی۔

اس نے کہا کہ اب وہ کسی کسی وقت تھوڑی سی دیر کے لیے بیدار ہو جاتا تھا یا یوں کہہ لیں کہ وہ شعور میں آ جاتا تھا لیکن پھر دنیا تاریک ہو جاتی تھی۔

وہ بیدار اس رات ہوا جس رات اس نے مقتول کو قتل کیا تھا۔ اس نے کہا کہ ایسا محسوس کیا جیسے کسی نے بڑی زور سے دھکا دے کر اسے اندھیرے سے اجالے میں پھینک دیا ہو۔ اس نے اپنا تجزیہ یوں سنایا کہ نسرین نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا اور کہا، او بے غیرت، یہ تھا وہ جھٹکا جس نے اسے ذہنی طور پر بیدار کر دیا۔

یہ نسرین کے پیار کا اور اس کے ایثار کا کرشمہ تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ مقتول کے پیچھے دوڑتا ہوا سیڑھیاں اُترا۔ مقتول ابھی آخری سیڑھی سے نیچے اُتر ہی رہا تھا کہ رحیم نے پیچھے سے اس کی گردن دونوں ہاتھوں میں لے کر دبا لی اور اس وقت چھوڑی جب وہ مر چکا تھا۔ اسے مار کر رحیم اوپر گیا تو وہ پوری طرح ہوش و حواس میں آ چکا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس نے پہلی بار نسرین کو اپنے ساتھ پلنگ پر لٹایا۔

میرے بلاوے پر نسرین رحیم کو سوتا چھوڑ کر چوہدری کے ساتھ تھانے آ گئی تھی۔ رحیم

نے سنایا کہ وہ جاگا اور دیکھا نسرین وہاں نہیں ہے۔ نیچے گیا تو سوتیلی ماں نے اسے بتایا کہ نسرین تھانے گئی ہے۔ رحیم بڑے غصے سے تھانے جا پہنچا اور میرے سامنے آن کھڑا ہوا

اس نے ہنستے ہوئے اعتراف کیا کہ جب وہ تھانے میرے ساتھ باتیں کر رہا تھا اس وقت اس کی ذہنی خرابی پھر بیدار ہوگئی تھی لیکن وہ زیادہ تر ایکٹنگ کر رہا تھا۔ اسے کوئی افسوس نہیں تھا کہ اس نے مقتول کو قتل کر دیا ہے۔

وہ پاگل خانے میں داخل کرا دیا گیا۔ وہاں اس نے پاگلوں کو دیکھا تو اسے افسوس سا آنے لگا کہ کیسے کیسے جوان آدمی اندر پڑے تباہ ہو رہے ہیں۔ اس سے اس میں مزید بیداری ہونے لگی لیکن اصل کام اس کے باپ نے کیا۔ اس نے پاگل خانے کی انچارج اور دو ڈاکٹروں کو منہ مانگے پیسے دے کر بیٹے کو ٹھیک کرا لیا اور پھر پاگل خانے سے آٹھ نو مہینے بعد خارج بھی کروا لیا۔

وہ واپس اپنے گھر گیا تو نسرین اپنے ماں باپ کے گھر تھی۔ وہ تو ماتم کی کیفیت میں تھی۔ رحیم کو پتہ چلا کہ لوگ اس کے ماں باپ سے کہتے رہے ہیں کہ پاگل خانے سے کبھی کوئی پاگل ٹھیک ہو کر نہیں آیا۔ بیٹی کی شادی کر دو لیکن نسرین نے صاف انکار کر دیا تھا۔ رحیم پہنچ گیا اور نسرین کو اپنے گھر لے آیا۔ اب وہ صحیح معنوں میں خاوند تھا اور نسرین کو بیوی سمجھتا تھا۔

اس کے چند مہینوں بعد ملک تقسیم ہوا، خون خرابہ ہوا لیکن چوہدری اپنے خاوند کو پہلے ہی نکال کر لے آیا تھا۔ پاکستان میں رحیم اپنے والدین سے الگ ہو گیا تھا اور یہاں اسے اتنی زیادہ زمین مل گئی کہ وہ پہلے سے زیادہ اچھی حیثیت کا مالک ہو گیا۔ اللہ نے نسرین کی نیکی کا اجر دیا اور انہیں تین بیٹے اور ایک بیٹی عطا کی۔

☆=====ختم شد=====☆